ڈاکٹر حبیب ضیا

نام کتاب : **بڑے گھر کی بیٹی**

(خودنوشت)

مصنف : حبیب ضیا

اشاعت : جنوری ۲۰۰۶ء

سرِورق : سید افتخار الدین

کمپیوٹر کتابت : محمد صلاح الدین۔ محمد کلیم محی الدین۔ شارپ کمپیوٹر
محبوب بازار۔ حیدرآباد۔۲۴۔ فون:۔ 9392427796

طباعت : وی ایس گرافکس، دلسکھ نگر، حیدرآباد۔

تعداد : پانچ سو

قیمت : ۲۰۰ روپے

ناشر : شگوفہ پبلی کیشنز
بیچلرز کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد 500001

جزوی مالی تعاون اردو اکیڈیمی آندھراپردیش

کتاب ملنے کے پتے:

- دفتر شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد
- سب رس کتاب گھر، ایوان اردو۔ پنجہ گٹہ۔ حیدرآباد
- سیاست سیل کاونٹر، جواہرلال نہرو روڈ، حیدرآباد
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد
- اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، اردو ہال۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد
- مکان مصنفہ ۱۰۴، مہارا بلاک، گارڈن ٹاورس، ماں صاحب ٹینک۔ حیدرآباد

انتساب:

میری ساس
مرحومہ اشرف النساءبیگم صاحبہ کے نام

حبیب ضیا

ترتیب

OOOO

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ادبی سفر جاری ہے۔ اس کے بارے میں اپنی مختلف کتابوں میں مختصراً اور طنزیہ مزاحیہ مضامین کے تیسرے مجموعے جو مژگاں اٹھائیے میں مفصل میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اردو زبان و ادب اور طنز و مزاح سے دلچسپی رکھنے والے سبھی دانشوروں کی نظر سے میری کتابیں گزری ہوں۔ ملک اور بیرون ملک کے ہزارہا افراد کے لئے یہ میری پہلی تصنیف ہوسکتی ہے، حبیب ضیاء انجانا نام ہوگا۔ حیدرآباد میرا وطن ہے اور مجھے اپنا وطن بے حد عزیز ہے۔ پیدائش، تعلیم، ملازمت سب کا تعلق حیدرآباد ہی سے ہے۔ دو ڈھائی سال کی عمر سے لے کر آج تک کے واقعات، حادثات، تاثرات اور اپنی نجی زندگی سے متعلق مختلف باتوں کو میں نے ایک جگہ کر دیا ہے۔ کاغذ، قلم اور ذہن کی مدد سے بڑے گھر کی بیٹی آپ سے مخاطب ہے۔ ذہن نے ساتھ دیا اور برسوں پہلے گزرے ہوئے واقعات قلم کی مدد سے کاغذ پر نقش ہوتے چلے گئے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ کتاب خودنوشت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ بے ربطی کے علاوہ بعض واقعات دہرائے گئے ہوں گے۔ میں نے صراحت کردی ہے۔ اس کے اہم ترین باب بڑے گھر کی بیٹی کا کچھ حصہ ۱۹۸۸ء میں لکھا گیا۔ باقی سرگذشت کو مکمل کرنے کے لئے تقریباً دو سال لگ گئے۔ ماضی اور حال دونوں زمانے ملیں گے۔ جو لکھا، جیسے بھی لکھا سرگذشت میں شامل کر دیا بس قلم برداشتہ لکھتی چلی گئی۔ نقادانِ ادب سے درخواست ہے کہ خامیوں کو درگزر کریں۔ میری داستانِ حیات آپ کے سامنے ہے، پڑھئے اور اپنے تاثرات لکھ بھیجئے۔

نجی حالات ہر قاری کے لئے دلچسپ نہیں ہوسکتے لیکن مجھے جاننے والے پڑھ کر ضرور کوئی نہ کوئی رائے قائم کریں گے۔ کچھ مواد ایسا بھی ہے جو حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختلف ادوار کی تہذیبی اور سماجی اقدار پر کہیں کچھ تو ملے گا۔ جو ہر قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرے گا، میرے دوست احباب اور شاگرد کثیر تعداد میں ملک سے باہر ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ وہ بھی اس کتاب کو پڑھیں۔

مختصراً کہنا چاہتی ہوں کہ میری تمام تصانیف کو خواہ وہ تنقید، تحقیق سے متعلق ہوں یا طنز و مزاح پر مشتمل ہوں، قارئین نے بے حد پسند کیا، ادب دوست ، ادب نواز خواتین وحضرات نے میری کتابیں خرید کر پڑھیں ۔اس سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی ۔کتابوں کی اشاعت کے لئے اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے علاوہ ادبی ٹرسٹ ،زندہ دلان حیدرآباد اور نظامس اردو ٹرسٹ کی جانب سے جزوی مالی اعانت دی گئی ۔جس کی میں ممنون ہوں ۔میری تمام تصانیف کے بارے میں ملک اور بیرون ملک کے جن دانشوروں اور نقادوں نے اپنی آرا لکھ بھیجی ہیں ان قیمتی آرا اور تبصروں کے اقتباسات کو میں نے سرگذشت میں شامل کیا ہے ۔میں نے اپنی سرگذشت اپنی استاذِ محترم ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ کو سنائی (بینائی کم ہونے کی وجہ سے وہ صرف سنتی ہیں پڑھ نہیں سکتیں)انہوں نے اس کی ضخامت کے باوجود اسے سنا اور پسندیدگی کا اظہار کیا ۔اس طرح آپا نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی ۔دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت عطا فرمائے ۔انہوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے خود کو وقف کردیا ہے ۔ملک کی نامور افسانہ نگار محترمہ فریدہ زین نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری خواہش پر خودنوشت کے بارے میں اپنے تفصیلی تاثرات لکھے ۔ستائشی کلمات نے حوصلہ دیا کہ جب تک حیات ہے اپنے ادبی سفر کو جاری رکھوں ۔کتاب کی طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں مکمل تعاون کے لئے مالک شارپ کمپیوٹر جناب مصطفےٰ قاسمی ، داماد سید افتخار الدین اور ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے ان سب کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ اپنے افراد خاندان کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کریں ۔دین اور دنیا کی نعمتوں سے سرفراز رہیں ۔مجھے فخر ہے کہ میری پوتی اور نواسیاں اردو زبان سے واقفیت رکھتی ہیں پوتا صرف ایک سال کا ہے ۔حمیرا افتخار نے پروف ریڈنگ میں تعاون کیا ۔بچوں کے درخشاں مستقبل کے لئے میری دعائیں ہیں ۔

حبیب ضیا
HABIB ZIA
104-Mahara Block
Garden Towers
Masab Tank.Hyd.28
Ph:66250812

محترمہ حبیب ضیاء......اپنے ہی آئینے میں

صاحبانِ فکر ونظر نے زندگی کو کئی نام دیئے۔ کہیں معمہ بتایا تو کہیں دیوانے کا خواب، کہیں صحرا، تو کہیں وادیٔ گل۔ زندگی کہیں واہ بنی تو کہیں آہ، کہیں سمندر تو کہیں آنسو کا قطرہ، کہیں کسی کٹیا میں جلتا مٹی کا دیا تو کہیں محلوں کے جگمگاتے فانوس کی روشنی، کبھی نغمۂ بربط تو کہیں نالۂ شبنم، کہیں دار کہیں ولدار، الغرض اپنی اپنی سوچ کے دھاروں پر لوگوں نے زندگی کو سمجھا۔

حیات انسانی کسی داستان سے کم نہیں، اوراق ہستی اُلٹتے جایئے ہر باب میں افسانے ہی افسانے ہیں۔ داستان گو جب اپنی کہانی سنانے لگتا ہے تو اس کا انداز مبالغہ آمیز ہوتا ہے مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی شخصیت کو بے نقاب کرنے میں پوری سچائی اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کو من وعن بیان کردیتے ہیں۔

محترمہ حبیب ضیاء صاحبہ کی یہ ''خودنوشت'' مبالغہ سے مبرّا، صاف گوئی سے مزّین تحریر ہے جملوں کی صداقت قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ ان کی تحریروں میں برفیلی راتوں میں سلگتی لکڑیوں کی دھیمی آنچ ملتی ہے۔ کہیں ماحول چمپئی صبح میں لے جاتا ہے تو کبھی شام سلگتی نظر آتی ہے۔

انسانی زندگی ایک جہد مسلسل کا نام ہے۔ اس کا ثبوت حبیب ضیاء صاحبہ کی تحریر ہے۔ خودنوشت میرے خیال میں کسی محاذ سے کم نہیں، جہاں ہر جملے، ہر احساس، ہر خیال کو مکمل سچائی

کے ساتھ پیش کرنا ہی اس فن کا کمال ہے۔عموماً لوگ اپنی ذات کو کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں برتر دکھاتے ہیں۔اپنی خامیوں کی پردہ پوشی اور دوسروں کی عیب جوئی انسانی فطرت کا وطیرہ ہے۔مگر سچ بولنے والا قلم، سچ سوچنے والا ذہن ان باتوں سے عاری ہوتا ہے۔محترمہ نے اپنی یادوں کے خوشگوار اور ناگوار لمحوں کو بڑے سلیقے سے چن کر ان کا گلدستہ بنالیا۔یادوں کی اس گٹھری میں کہیں پیار بھی اور کہیں خار بھی ہے۔

اپنے بچپن کا ذکر محترمہ نے خاندانی شجرے کے حوالے سے کیا ہے۔تمام واقعات کو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلا باب پیدائش، تعلیم، والدین کا ذکر، بہن بھائیوں کے تذکرے، اسکول اور کالج کے اساتذہ و ساتھیوں کے بارے میں وضاحت کرتا ہے۔

یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان کی مشفق رہنمائی، اس کے بعد والد محترم کے تفصیلی حالات، اپنے جدامجد حضرت سید شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی قدس سرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ والد مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ بحیثیت مددگار ناظم تعلیمات ان کی ملازمت کا شاندار دور رہا۔اس دور کا ذکر کرتے ہوئے حبیب ضیاء صاحبہ نے اس وقت کی معاشی آسودگی کے بارے میں بھی بتایا ہے۔

والدہ محترمہ فخر النساء بیگم صاحبہ کے اجداد کے بارے میں بیان کرتے ہوئے غدر کے واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔انگریز حکومت کا جارحانہ رویہ، ''سخی منزل'' جواُن کی نانی صاحبہ کی میراث تھی۔اس کی فروختگی اور چند افراد خاندان کی کوتاہ نظریوں سے حبیب ضیاء صاحبہ کی والدہ کو محروم کر دینا۔''سخی منزل'' اپنے نام کے اعتبار سے سخی حضرات کی پناہ گاہ رہی اس حویلی سے جڑی باتیں بڑی دلچسپ لگتی ہیں، محسوس ہوتا ہے ہم اے آر خاتون کی ناول ''افشاں'' کا مطالعہ کررہے ہیں۔جس میں شادی بیاہ کے رسومات، نذر و نیاز کے واقعات، لباس و زیور کا بیان، رہن سہن کے طور طریقے، مہمان نوازی کا انداز، معاشی آسودگی اور مذہبی روایتوں کی پاسداری، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، آمدنی اور خرچ کا بیان، حقائق پر مبنی تفصیلات جو اس

دور کی نشاندہی کرتے ہیں دستاویزی انداز میں لکھے گئے ہیں۔اُس دور سے آج کے ماحول کا تقابل حیرت میں ڈال دیتا ہے لگتا ہے کوئی داستان ہو،اجناس ،ترکاریاں ،گوشت ،مرغ و ماہی ،دودھ ،مسکہ، گھی ،میوہ جات، کپڑے اور ان کی سلائی ،ملازمین کی تنخواہیں ان تمام چیزوں کو محترمہ نے بڑی چابکدستی سے جدول کی شکل میں تحریر کیا ہے۔یہاں تک کہ زمین کی قیمت کا بھی ذکر کیا۔معاشرتی زندگی کے سکون کو بیان کرتا یہ باب ہمارے دل میں حسرتوں کو پیدا کرتا ہے کاش ہم بھی اس وقت اُسی طرزِ زندگی میں جینے پیدا ہوتے۔

محترمہ حبیب ضیاء اپنی والدہ محترمہ فخر النساء بیگم صاحبہ سے کافی حد تک متاثر نظر آتی ہیں بلکہ ان کے حالات پڑھنے کے بعد میں سمجھتی ہوں کہ وہ فطرت میں بھی مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کی والدہ خالص دیندار خاتون تھیں جن کی زندگی عمل صالح کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔سخاوت کا یہ عالم تھا کہ مالی مشکلات میں گھرے افراد کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا یہاں تک کہ کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی اُن کے انتقال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی مستحق بچوں کی تعلیمی امداد،شادی بیاہ کا خرچ ،بیماری کے لئے علاج و معالجہ ہر طرح کا خرچ وہ برداشت کرتی تھیں۔حزب البحر کا ورد کرنے والی اُس دور کی وہ واحد خاتون تھیں۔حبیب ضیاء صاحبہ کو اُن کی والدہ سے کئی خوبیاں ورثے میں ملی ہیں۔

توفیق صاحب سے رشتے کی بات سے لے کر شادی کی تکمیل تک کا تفصیلی بیان ہے کچھ بدخواہ رشتے داروں کی اذیتیں ،بے جا رسومات سے احتیاط کا ذکر بھی کیا ہے۔محترمہ کو اللہ نے دو بچوں سے سرفراز کیا ہے جو ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہیں اور خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔ دورانِ تحریر محترمہ نے سماج کی بعض بیہودہ رسموں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔اس طرح سے اپنی تحریر کو تحریک بنایا۔لڑکیوں کی رسم رونمائی ،بے جا رسومات ،جہیز ،دعوت طعام میں غیر ضروری اہتمام، دیگر معاملات میں فضول خرچی ،پیسے کا بے دریغ استعمال ،ان تمام برائیوں کو وہ سماج سے دور کرنا ہر شہری کا اولین فرض سمجھتی ہیں۔

حبیب ضیاء صاحبہ کا ذہن دینی فکر کا حامل ہے۔انہوں نے اپنے وقت کی قابل قدر ہستی وصوفی بزرگ حضرت عبدالقدیر صاحب صدیقی حسرت کے ہاتھوں بیعت کی ۔اپنے پیر کی خدمت اور نظر عنایت سے سرفراز رہیں۔اوراد بہ کثرت پڑھتی ہیں تاثیر زبان لوگوں کو شفا بخشتی ہے۔اس کا ثبوت ویمنس کالج کے سانپوں کا واقعہ اور پریوں کی شہزادی والے قصے میں ملتا ہے۔

حبیب ضیاء صاحبہ فطرتاً حساس اور خوددار ہیں۔جھوٹ سے انہیں نفرت ہے۔دل شکنی ان کا شعار نہیں مگر دل شکنی کرنے والے کو معاف بھی نہیں کرتیں۔عورتوں کے بارے میں وہ نرم گوشہ رکھتی ہیں،انہیں انصاف دلانا ضروری سمجھتی ہیں۔اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کو دہراتے ہوئے کچھ باتوں کی تنبیہ بھی کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ مرد ماں اور بیوی دونوں کے حقوق کی صحیح بجاآوری کرے اس ضمن میں تغافل کو وہ سخت ناپسندیدہ سمجھتی ہیں حق تلفیوں اور ناانصافیوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتیں۔زندگی کے باریک سے باریک پہلو پر ان کی گہری نظر ہے وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کا جائزہ لیتی ہوئی ان کے حل کی تلاش میں مضطرب نظر آتی ہیں۔خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر، والا معاملہ ہے یہی تو تکمیل انسانیت ہے۔مضمون ''میری کام والیاں'' ان کے دردمند دل کا اظہار ہے۔

لباس،زیور،غذا کے معاملے میں بڑی سادگی پسند ہیں نفس امارہ شاید اُن کے پاس نہیں آتا۔ان کی فطرت میں صبر وشکر،اطاعت ورضا،استقلال وہمت والدین سے ودیعت کر گیا ہے وطن سے محبت ایمان کا جز ہے،باوجود یہ کہ ان کا مکمل خاندان پاکستان میں مقیم ہے انہوں نے وہاں سکونت اختیار کر لینے کو کبھی ترجیح نہیں دی۔ہندوستان کی ہواؤں فضاؤں سے انہیں الفت ہے۔ہاں اپنے اقرباء سے ملاقات کے لئے اکثر وبیشتر پاکستان ہو آئی ہیں۔

اپنی ملازمت کے تئیں وہ بڑی فرض شناس،محنتی اور ایماندار رہیں۔طلباء کے لئے شفیق استاد ورہنما دوران ملازمت پیش آنے والے کچھ ناخوشگوار واقعات کی یاد بھی تازہ کی

ہے جن تکالیف کا سامنا کیا اسے بلا جھجک بیان کر دیا۔
ان کی تحریر میں بہ لحاظ ضرورت مزاح کی چاشنی اور طنز کے تیر بھی ملتے ہیں۔
''کہیں دیکھا ہے......'' میں توفیق صاحب کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعے میں اس طرح اپنے فطری مزاح کو پیش کیا۔
''کبھی طبیعت خراب ہو تو کہتے آج کھانا مت پکاؤ، کھچڑی پکالو، گویا کھچڑی پکانے کے لئے چولھا ضروری نہیں۔ بغیر چولھے والی کھچڑی کے لئے تو دو چار خواتین کا سر جوڑے بیٹھنا ضروری ہے''۔
زندگی کے 38 سال میں حبیب ضیاء صاحبہ نے پوری صاف گوئی کے ساتھ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر کیا۔ تکمیل بشریت کے لئے تکمیل انسانیت ضروری ہے۔ اور اسی انسانیت کا درس ان کی ہر تحریر میں ملتا ہے۔ وہ فکری طور پر اور عملی اعتبار سے تقاضائے انسانیت کی تکمیل میں گامزن نظر آتی ہیں۔
زندگی کے 38 سالوں کی تفصیل توفیق صاحب کے داغ مفارقت دیئے جانے پر ختم ہو جاتی ہے۔ شریک زندگی کا ساتھ چھوٹا تو حیات کا ایک باب ہی جیسے مٹ گیا۔ اور یہیں سے ''بڑے گھر کی بیٹی'' کا جنم ہوا۔ اس خود نوشت کا نقطۂ آغاز اُن کے پوشیدہ زخموں کا وہ درد ہے جو لفظوں میں اس طرح سمٹ آیا۔
''برسوں پہلے میری ساس نے مجھے بڑے گھر کی بیٹی کا خطاب دیا تھا۔ کاش وہ مجھے بڑے دل کی بیٹی کہتیں۔ جی ہاں بڑے دل کی...... میں نے دل بڑا کر کے ان کے بیٹے کو انہیں سونپ دیا۔ اب وہ مطمئن ہیں۔ ان کا چہیتا بیٹا ان کے بازو سو رہا ہے''۔
ان جملوں سے ساس کے جابرانہ رویے اور بہو کے عاجزانہ انداز کی وضاحت ہو جاتی ہے اس روایتی رشتے کی تلخیوں کو سمیٹ کر انھوں نے یہ خود نوشت تحریر کی۔
۱۴؍ مارچ ۲۰۰۲ء کے بعد ان کا قلم ٹھہر سا گیا تھا اور طنز و مزاح جو ان کی تحریر کا خاص

جوہر ہے دبے پاؤں کہیں دور جا کھڑا ہوا۔ مگر پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے ان جملوں نے ان کے قلم کو دوبارہ جنبش دی۔

''مژدہ ہو فنکاران طنز وظرافت کے لئے کہ اُن کے فن کا نور قرآن وسنت سے اور آسمانی کتابوں سے مستعار ہے''۔

حبیب ضیاء صاحبہ نے طنز ومزاح کے ذریعہ بے شمار مسائل پر قلم اٹھایا اوران کے حل کو بھی پیش کیا۔ خواتین کی ذہنی، نفسیاتی اورمعاشرتی بیداری کی پُرزور تاکید کی اورحوصلہ مندی کی ترغیب بھی دی۔ قوم اورملت کے لئے ان کا دل اس وقت کڑھتا ہے جب وہ یلماں کے دوبچوں کو ڈاکٹر بنا دیکھتی ہیں اور خواجہ بی کے لڑکوں کو گٹکا، پان، مسالا کھا کر اپنی ماں کو گھروں میں برتن دھونے مجبور کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ نوجوان نسل کی بڑھتی ہوئی بے راہ روی پروہ مذمت بھی کرتی ہیں اوران کے سدھار کی ممکنہ کوشش کے لئے حل بھی ڈھونڈتی ہیں۔

تنہائی کے سلگتے صحرا میں ان کے قدم تپ رہے ہیں مگر وہ عزم واستقلال کے ساتھ صبر کا پیکر بنی جی رہی ہیں۔ شریک زندگی ایسا کہ جس نے ''شراکت'' کے ہرقاعدے وقانون کو مکمل نبھایا ہو اس کی جدائی شاق گذرتی ہے۔ اس درد کو میں بخوبی سمجھ سکتی ہوں پچھلے تیرہ برس سے میں بھی لق ودق صحرا میں گھوم رہی ہوں، دوران تحریر کچھ ایسے واقعات بھی آ گئے جنہوں نے میری آنکھوں کو بھی نم کر دیا۔

''بڑے گھر کی بیٹی'' یہ خطاب اُن کی خوشدامن صاحبہ محترمہ اشرف النساء بیگم کا دیا ہوا ہے۔ پہلے تو میں کچھ تذبذب میں رہی کہ کہیں یہ پریم چند کی ''بڑے گھر کی بیٹی'' تو نہیں۔ پھر آہستہ آہستہ گرہ کھلتی گئی۔ حبیب ضیاء صاحبہ مرہون منت ہیں اُس چائے کی پتی والے خالی ڈبے کی جس کی وجہ سے انہیں اس نام سے نوازا گیا۔ اپنی ساس صاحبہ کے تلخ وترش رویے سے انہوں نے نباہ کیا۔ ایسی تلخیاں کہیں رشتے کی دھجیاں بھی اڑا دیتی ہیں مگر محترمہ نے اپنے صبر کے پیمانے کو لبریز رکھا چھلکنے نہ دیا۔ زندگی کے اعلیٰ اقدار کو اپنا نصب العین بنایا۔ زندگی کے

بگڑتے چہرے کو سنوارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کہیں کہیں وہ ٹوٹ بھی گئیں لیکن حوصلے نے انہیں تھامے رکھا۔

ملازمت کی تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں رہیں۔ ایک وفا شعار بیوی، خدمت گذار بہو، ایک مشفق ماں اور ایک بہترین استاد، ہر روپ میں انہوں نے زندگی کا ہر لمحہ خوبصورتی کے ساتھ جیا۔ نہ کبھی ہار گئیں، نہ کبھی تھک گئیں نہ کبھی ٹوٹ گئیں ''جنبش سے ہے زندگی جہاں کی'' والی رسم کو نبھایا۔ آئی ڈی پی ایل سے اورینٹل کالج کا راستے طئے کرنا، تھکا دینے والی ذہنی مصروفیت، ملازمت کی تلخیوں کے باوجود وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتی رہیں۔ محترمہ حبیب ضیاء ملازم پیشہ خواتین کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ انہیں بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زن و شوہر کے تعلقات میں کشیدگی، کہیں بچوں کی تربیت میں بے قاعدگی، کہیں امور خانہ داری میں الجھنیں، ایسی باتیں رشتوں میں دراڑ ڈال سکتی ہیں۔ محترمہ نے اپنی ذاتی زندگی کو بے نقاب کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ ذہنی ہم آہنگی ہر دو کے لئے ضروری ہے۔ تبھی خوشحالی آسکتی ہے۔ انہیں ناز ہے کہ توفیق صاحب نے ہر موڑ پر ان کا ساتھ نبھایا۔ ان کی خوشدامن صاحبہ ایک نفسیاتی مریضہ تھیں۔ جن کی فطرت میں خودستائی کے ساتھ خودغرضی بھی عادت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ خود کو مظلوم ظاہر کرنا اوروں کی توجہ کا مرکز بنے رہنے سے ایسے لوگوں کو تسلی ملتی ہے۔ ان حالات میں مرد سخت الجھن کا شکار بنے رہتے ہیں گویم مشکل گرنہ گویم مشکل والا معاملہ ہوتا ہے مگر حبیب ضیاء صاحبہ نے توفیق صاحب کو اس چکر سے دور رکھا سارا بوجھ خود ڈھوتی رہیں پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی ساس صاحبہ نے ڈر، خوف، وہم سے نجات پائی مگر اپنے رویہ کو نہ بدل سکیں۔ اور پھر ہوا کا رخ بھی ایسا بدلا کہ حبیب ضیاء صاحبہ نے ان کے ساتھ رہنے سے یکسر انکار کر دیا مگر زیادہ دیر تک اس بات پر قائم نہ رہ سکیں۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر دوبارہ خدمت پر لگ

گئیں اور وقت آخر تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

محترمہ حبیب ضیاء کی تحریروں میں مبالغہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ، ہاں برجستگی اور ٹھوس حقائق کی پوری پوری نشاندہی موجود ہے ۔ان کی شخصیت کی سادگی کی طرح ان کی تحریر کی سلاست اپنی جگہ برقرار ہے۔ خود کو تو وہ ساڑی کے پلو سے مکمل ڈھانکے رہتی ہیں مگر تحریر میں پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی شخصیت کی عکاسی کی ہے۔تحریر کی یہ صاف گوئی خودنوشت کو دلچسپ بناتی ہے ۔کہیں کہیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے ہم زمانہ قدیم کی تاریخ کا جائزہ لے رہے ہیں ۔کبھی لگتا ہے کہ امور خانہ داری پر مبنی کوئی معلوماتی کتابچہ دیکھ رہے ہوں ، کہیں لگتا ہے کسی رسالے میں شائع مزیدار پکوان کے بارے میں پڑھ رہے ہوں ۔چھوٹی چھوٹی گھریلو کام کی باتیں ہر خاتون کے لئے مفید مشوروں کا کام دیتی ہیں ۔

محترمہ نے اپنی کمزوریوں کی بھی پردہ پوشی نہیں کی ۔حقیقت سے کہیں انحراف نہیں کیا۔ زندگی کے اصولوں ، رہن سہن کے طریقوں اور رشتوں کے تقاضوں کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے۔جھوٹ ، فریب ، دغا ، منافقانہ انداز کی سختی کے ساتھ مذمت کی ہے۔ وہ حق گوئی کے لئے اعلان جنگ کرتی ہیں ۔

اس خودنوشت میں کئی ابواب ہیں ، زندگی کے 38 سال ، بڑے گھر کی بیٹی ، مجھے کچھ کہنا ہے ، چل کے تو دیکھو ، بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ کیوں کہ ان ابواب میں اُن کی زندگی کی مکمل تصویر دیکھنے کو ملتی ہے ۔ اپنے مزاج کی خامیوں اور خوبیوں کو بتادیا۔ جو غلط ہے اسے غلط کہا جو سچ ہے اُسے تسلیم کیا۔ اپنا غصہ ، اپنا غم ، اپنی دردمندی ، اپنی سادگی سبھی کو بیان کردیا۔

''بڑے گھر کی بیٹی'' اول سے آخر تک مکمل دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے نشتر ، درد کا بیان ، ذاتی زندگی کے معاشرتی پہلو ، سماجی ماحول کی برائیاں ، رشتوں کی بے اعتنائیاں ، غلط رسم ورواج کی بیڑیاں ، مجبور بے بس انسانوں کی پستیاں ، جھوٹ اور فریب کی سفاکیاں ، مظلوموں کی حق تلفیاں ، غرض کہ زندگی کے ہر رنگ کو اجاگر کیا صاف گوئی کو اختیار کیا

دروغ گوئی سے انکار کیا۔ دوسروں کی بھلائی کا ہر وقت خیال رکھا۔ زندگی کی پر پیچ راہوں میں نہ کوئی پکار، نہ کسی پر اصرار نہ کوئی مدد کا طلبگار، سب چیزوں سے بے پرواہ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری، قوت برداشت کے مظاہرے، صبر و رضا کا پیکر نبی حبیب ضیاء ہر حیثیت سے انسانیت کے میزان میں برابر اترتی ہیں۔

''مجھے کچھ کہنا ہے......'' میں محترمہ نے بہت کچھ کہا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ''کہے جانے'' پر غور و فکر کریں۔ ان کے مضامین پڑھ کر یہ اندازہ قائم ہوتا ہے کہ ان کی فکر کا زاویہ ہر موضوع سے جُدا ہے اور گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے۔

معصوم بچوں سے لے کر ضعیف العمر لوگوں کے مسائل سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ متوسط گھرانوں کی اندرونی خلفشار کو بھی جانتی ہیں۔ مزدور پیشہ طبقے کی کمزوریوں کا انہیں اندازہ ہے۔ شوہر پرستی کے جُرم اور مردوں کے ظلم کو بھی انہوں نے دیکھا ہے۔ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور غلط شوق پر وہ اظہار تاسف کرتی ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی پستی پر ان کا دل کُڑھتا ہے۔ قلمکار چونکہ حساس ہوتا ہے اس لئے اس کا ذہن اپنے اطراف واکناف کا جائزہ لیتا ہے۔ ہر اچھی اور بری چیز اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کا قلم محرک ہو کر کبھی کہانی، کبھی افسانہ، کبھی مضمون اور کبھی نظم کی شکل میں گل بوٹے سجانے لگتا ہے۔ اس میں درد کی کسک بھی ہوتی ہے اور کانٹوں کی چبھن بھی، نظر کا قرار بھی، دل کا سکون بھی۔

محترمہ حبیب ضیاء صاحبہ درمند دل رکھتی ہیں اور اپنے اطراف پھیلے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرتی ہیں گویا اپنی تحریر سے تحریک پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے قابل فکر مضامین ''ابھی میں زندہ ہوں، پچاس سال کی بے بی، میری کام والیاں'' ہیں جس میں انہوں نے معاشرتی زندگی کے ایسے تلخ حقائق ہمارے سامنے لائے ہیں جس کی طرف ہم اکثر غور بھی نہیں کرتے۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد ہم چونک جاتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کن برائیوں میں

گھرا ہے۔

سفر پاکستان کے تاثرات بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں وہاں کے سماجی ،ادبی ،تفریحی ماحول کا ذکر خوب کیا ہے۔ شیشے کا شہر دبئی ،آنکھوں دیکھا حال لگتا ہے۔

ان کی تحریر میں کہیں کہیں خالص حیدرآبادی انداز بھی ملتا ہے ۔جیسے اپنی غذا کے بارے میں لکھا ہے۔ مجھے کھانے کا ''ہوکا'' نہیں۔اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا'' پہلے تو مجھے غصہ آتا نہیں اور آتا ہے تو پھر کسی کے باپ کو نہیں مانتی۔''

خودنوشت کے آخری حصہ میں دانشوران ادب کی آرا ہے۔اس کے آغاز پر ہی ان کی تصانیف اور ایوارڈس کی تفصیل پڑھنے کو ملتی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ محترمہ حبیب ضیاء نے اپنے چہرے کو بے نقاب کرنے میں کوئی عذر سے کام نہیں لیا بلکہ ہر پرت پوری سچائی اور صاف گوئی کے ساتھ اٹھتی گئی اور پھر اس کے اندر اُس فنکار کا چہرہ واضح ہوا جو مزاح نگار کہلاتی ہیں اور جن کا دل سارے جہاں کا درد سمیٹے دھڑک رہا ہے۔ میں اُن کی اس کاوش پر مبارکباد دیتی ہوں کہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' نے ہر دل، ہر ذہن کو زندگی کے چھوٹے چھوٹے تقاضوں کی تکمیل اور معاشرے کی برائیوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

فریدہ زین

ایم اے

○○○○

ادبی سفر

تنقید، تحقیق اور طنز و مزاح میں سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تقریباً سبھی کتابوں پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی اور یو پی اردو اکیڈیمی کی جانب سے گراں قدر ایوارڈ عطا کیے گئے۔ کتابوں پر ایوارڈس کے علاوہ مختلف اداروں اور انجمنوں کی جانب سے بھی مومنٹوز اور ایوارڈ ملے۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے Best Teacher کے ایوارڈ سے نوازا۔ 1995ء میں Best Humourous Writer کے لئے اندرا گاندھی نیشنل یونٹی ایوارڈ، 1989ء میں کوی گاری کلا پیٹھم کی جانب سے غزل سندری غالب ایوارڈ اور انجمن بقائے اردو کی جانب سے Best Writer کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔ کئی برس کالی کٹ یونیورسٹی کے بورڈ آف پیپر سٹرس کی ممبر رہی۔ شموگہ یونیورسٹی کرناٹک کی جانب سے شعبہ اردو کے اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں انٹرویوز کے لئے بہ حیثیت Expert مدعو کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی نے بھی بعض امتحانی پرچوں کی تیاری کے سلسلہ میں مدعو کیا۔ حیدرآباد یونیورسٹی سے پیش کردہ پی ایچ ڈی کے مقالوں کی ممتحن رہ چکی ہوں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے جن طالب علموں نے میری رہنمائی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ان کے نام، مقالوں کے عنوان کے ساتھ یہ ہیں۔

مقالات ایم فل:

مسز ساجدہ بیگم	رسالہ صبا کی کتابیات
شفیق اقبال	ڈاکٹر حسینی شاہد بہ حیثیت محقق اور نقاد
نجم السحر	خواجہ حمید الدین شاہد۔ فن اور شخصیت
عثمان علی قادری	برق آشیانوی کی طنز و مزاح نگاری
عبدالحفیظ رحمانی	نریندر لوتھر بہ حیثیت طنز و مزاح نگار
تسنیم فرزانہ	محمد منظور احمد منظور حیات اور ادبی کارنامے

مقالاتِ پی ایچ ڈی:

ڈاکٹر عباس متقی — اردو ادب میں طنز و مزاح اور اس کا تہذیبی اور سماجی پس منظر۔

ڈاکٹر نجم السحر — ابوالکلام آزاد کی نثر کا اسلوبیاتی تجزیہ۔

ڈاکٹر عتیق اقبال — اردو ادب کو ڈاکٹر جمیل جالبی کی دین

تنقید، تحقیق کے ساتھ مزاحیہ ادب کی خدمت کرنا فرض جانتی ہوں۔ طنز و مزاح میں لکھنے والی نئی خواتین کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں۔ اس صنفِ ادب کو فروغ دینے میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی ادارت میں نکلنے والے ہندوستان کے واحد رسالے 'شگوفہ' کا ذکر ضروری ہے۔ جو اشاعت کے ۳۷ ویں سال میں داخل ہو کر بین الاقوامی شہرت منوا چکا ہے حیدرآباد کی کئی خواتین ہیں جن کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوتے ہیں۔

میرے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے پہلے مجموعے گوئم مشکل میں مشہور مزاح نگار جناب رشید قریشی کا ایک تفصیلی مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے میری طنز و مزاح نگاری کی تعریف کر کے حوصلے بلند کیے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس تجربے سے کام لے کر میں ایک مزاحیہ ناول لکھ دوں۔ کسی بھی صنفِ ادب پر ہر کوئی قلمکار قلم نہیں اٹھا سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ خداداد صلاحیت ہے۔ بہر حال ناول تو میں لکھ نہیں سکتی تھی۔ اپنی سرگذشت لکھنے کا خیال آیا تو ذہن بن گیا تھا کہ اس کے کئی ابواب میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوگی۔ جملے محفوظ تھے۔ عنوانات ذہن میں آتے گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جناب رشید قریشی کا مشورہ مانتے ہوئے میں ایسا ہی انداز اختیار کروں گی جس میں مختلف جگہوں پر، واقعات کے بیان سے قاری کو کچھ دیر کے لئے سہی' محظوظ ہونے کے مواقع مل سکیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں میرے شریک زندگی سید رحیم الدین توفیق کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دائمی جدائی کے صدمے سے میں سنبھل نہ سکی۔ بکھرے خیالات 'ادھورے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ کوتاہیوں کو قارئین درگزر کریں۔

حبیب ضیا

جولائی ۲۰۰۶ء

○○○○

پیدائش، تعلیم

میری پیدائش یکم نومبر ۱۹۳۵ء کو حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ والدین نے میرا نام حبیب النساء رکھا۔ ادبی حلقوں میں حبیب ضیاء کے نام سے جانی جاتی ہوں۔

ابتدائی تعلیم بیدر کے ایک مدرسے میں ہوئی۔ والد محکمۂ تعلیمات سے وابستہ تھے اس زمانے میں وہ ناظر تعلیمات تھے۔ مختلف اضلاع کا دورہ کرتے۔ بیدر میں صغیر جماعت میں مجھے شریک کروایا گیا تھا۔ بیدر کا اسکول، گھر اور وہاں کی تہذیب، طور طریقے اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کمرۂ جماعت میں بوریا بچھا ہوا تھا۔ استادنی جنھیں حضت کہتے تھے وہ بڑے بوریے پر بیٹھی ہوتیں اور طالبات بھی اسی قسم کی پتلی سی چٹائیوں پر۔ مجھے اچھی طرح حضت کی جسامت یاد ہے موٹی تازی سی بارعب' انھیں دیکھ کر میں ڈر کر رونے لگی تھی۔ گھر سے اسکول جانے کے لئے بنڈی (بیل گاڑی) آتی تھی۔ ایک آیا ساتھ ہوا کرتی۔ ہمارے جوتوں اور کھانے کے ڈبے کی حفاظت اس کے ذمہ تھی۔ بیدر کے اسکول کے علاوہ گھر کا نقشہ بھی ہلکا سا ذہن میں ہے۔ بڑے صحن والا گھر تھا۔ لال مٹی بیدر کی خاص پہچان ہے۔ اس لئے صحن کی رونق بھلی لگتی تھی۔ کھلا مقام، سایہ دار درخت ہر طرف ہرا بھرا نظر آتا تھا۔ بیدر میں بندر کثرت سے ہوتے ہیں' بندروں کی وجہ سے کبھی کچھ ڈر بھی لگتا تھا مگر بعد میں عادت سی ہوگئی تھی۔ صحن میں دھوم مچاتے، جھاڑوں پر کودتے پھلانگتے بندر دلچسپی کا سامان فراہم کرتے۔

اُس زمانے میں فرد کی آمدنی کم ہوتے ہوئے بھی خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ ہم دس بہن بھائی ہیں۔ گھر میں ہر چیز افراط سے ہوتی۔ اس وقت میں صرف مسکہ کے گھی (مکھن) کا ذکر کروں گی۔ اللہ کے فضل سے ہمیشہ گھر میں دستیاب رہتا۔ جواری کی روٹی کے ساتھ گڑھا اور گھی کا مزہ اب تک یاد ہے۔ بڑا دیگ گھی سے بھرا ہوا ہوتا۔ گاؤں کی زندگی ہی کچھ اور تھی۔

بیدر سے حیدرآباد آنے کے بعد مجھے گرلز ہائی اسکول نامپلی میں شریک کروایا گیا۔

اسکول کا پہلا دن یادگار دن ہے۔ مسز عثمان اسکول کی ہیڈ مسٹرس تھیں۔ میرے والد نے مجھے اسکول میں شریک کروایا۔ ان کے جانے کے بعد مسز عثمان بڑی شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے، مجھے سنبھالے ہوئے کلاس میں لے آئیں۔ دوسری طالبات اور اساتذہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں بڑی محنت سے تمام مضامین پڑھتی تھی۔ محترمہ نجمہ عبدالخالق اردو پڑھاتی تھیں۔ دوسرے مضامین کے ساتھ پکوان اور سلائی کی کلاس ہوتی۔ میں ہر مضمون دلچسپی سے پڑھتی۔ سوائے ریاضی کے۔ ابتداہی سے میں ریاضی میں کمزور رہی' کامیاب تو کسی طرح ہو جاتی تھی۔ مساحت سے سخت الجھن ہوتی۔ خصوصاً ایسے سوالات جن میں ایک بڑے نل سے پانی کا ڈرم بھرا جاتا۔ پھر چھوٹی ٹونٹی لگے نل سے ڈرم خالی ہوتا۔ پوچھا یہ جاتا کہ ایک گھنٹے میں ڈرم بھر جاتا ہے۔ دو گھنٹے میں خالی ہوتا ہے تو ٹونٹی کا حجم بتایا جائے۔ مجھے بہت غصہ آتا، جھنجھلا کر اپنے دوستوں سے کہتی ڈرم بھرتے کیوں ہیں اور پھر خالی کیوں کرتے ہیں۔ بلا وجہ ہمیں پریشان کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

تلگو میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ ہمیشہ صد فی صد نشانات ملتے۔ خوش خط لکھتی تھی۔ پڑھنے اور لکھنے میں کبھی غلطی نہ ہوتی۔ مسز سندرم تلگو پڑھاتی تھیں۔ اکثر وہ مجھ سے بورڈ پر لکھواتی تھیں۔ میری بے تکلف دوست فرخ تھی بے حد ذہین اور شریر۔ وہ تلگو میں کمزور تھی۔ مجھے شرارت سے کبھی پنتولو (استاد) کہہ کر مخاطب کرتی۔ اسی دور میں، میں نے اردو، تلگو کے ملے جلے الفاظ لے کر چند اشعار لکھے تھے۔ ڈھن قوالی کی تھی۔

سلائی کی جماعت میں بعض دفعہ چند لڑکیاں جان بوجھ کر سزا بھگتنا چاہتیں۔ مطلوبہ اشیاء جیسے کپڑا، سوئی دھاگہ وغیرہ نہیں لاتی تھیں اس لئے پورا گھنٹہ کلاس کے باہر ٹھیر کر خوب ہنستی جاتی تھیں۔

اسکول میں نماز کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ علاحدہ کمرے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی دوڑ کر وضو کر کے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ نماز پڑھ لیتی اور پھر کھلے لان پر شطرنجی، دسترخوان بچھا کر آیا

انتظار کرتی ۔ توشہ دان، پانی سب تیار ہوتا ۔ اطمینان سے کھانا کھالیتی ۔ توشہ دان خالی کرنا، دھوکر رکشے تک لاکر دینا آیا کا کام ہوتا ۔ اسکول میں پڑھائی کے ساتھ مختلف تہذیبی پروگرام بھی منعقد کئے جاتے جن میں کبھی حصہ لے لیتی ۔

اسکول جانے کے لئے بس، آٹو، اسکوٹر وغیرہ کا تصور ہی نہ تھا ۔ گھر پر شکرام آتی ۔ چلمنیں پڑی ہوئی ہوتیں ۔ چودہ پندرہ لڑکیاں آسانی سے بیٹھ جاتی تھیں ۔ Fast Food Centre نہیں تھے ۔ لڑکیاں عموماً گھر کا کھانا ہی کھاتیں اس لئے سب دبلی پتلی تھیں ۔

دسویں جماعت کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں زنانہ کالج میں داخلہ لیا ۔ یہ اب یونیورسٹی کالج فار ویمن جامعہ عثمانیہ ہے ۔ آرٹس میں میرے مضامین معاشیات، سماجیات اور اُردو تھے ۔ زبان دوم بھی اُردو تھی ۔ اُس زمانے کی تہذیبی اقدار کچھ اور ہی تھیں ۔ موجودہ زمانے سے مقابلہ کیا جائے اور نئی نسل کو یہ باتیں بتائی جائیں تو یقیناً وہ حیرت زدہ ہو جائے گی ۔ کالج کے احاطے میں کسی مرد کا داخلہ ممنوع تھا ۔ پڑھانے والی سبھی خاتون اساتذہ تھیں ۔ کالج جانے کے لئے راتب کا سیکل رکشہ تھا جسے پردہ لگا ہوتا تھا ۔ رکشہ ہمارا ذاتی تھا ۔ رکشہ چلانے والا شہاب الدین نامی، نیک اور ایماندار آدمی تھا ۔ وقت کی پابندی کرتا ۔ کسی دن ذرا بھی دیر ہوتی تو ہم بہنوں کی خوب ڈانٹ سُنی ہوتی ۔ سر جھکا کر خاموش کھڑا رہتا ۔ اسی رکشے میں منڈی سے سامان لایا کرتی ۔ طریقہ یہ ہوتا کہ گھر سے فہرست لکھ کر لے جاتی ۔ دکاندار کو دے کر پردہ لگے رکشے میں بیٹھی رہتی ۔ کچھ ہی دیر میں سامان تول دیا جاتا ۔

بات کالج کی تھی ۔ اُردو کے اساتذہ میں جہاں بانو نقوی صاحبہ، زینت ساجدہ صاحبہ اور رفیعہ سلطانہ صاحبہ تھیں ۔ ان تینوں قابل اساتذہ کی رہنمائی میں آگے بڑھتی گئی ۔ بی ۔ اے میں بھی ان تینوں کی قابلیت سے استفادہ کیا ۔ سلامت آپا، مس پنجتن، کنیز آپا، مس پوتھن، سکندر جہاں کی بھی شاگرد رہی ۔ ابتدائی زمانے میں مس لینل پرنسپل تھیں ۔ بعد میں ڈاکٹر سری دیوی نے یہ عہدہ سنبھالا ۔ ۱۹۵۷ء میں، میں نے یونیورسٹی کالج فار ویمن ہی سے بی ۔ اے کی

ڈگری لی۔کالج کے یہ چار سال انتہائی پُرسکون اور یادگار رہے۔اساتذہ کا ہمیشہ میں نے ادب کیا۔کبھی کبھار کوئی شرارت ہو جاتی' تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔

میں نے کالج کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کیا۔شاکرہ آپا لائبریرین تھیں۔بہت ہی قابل،ذمہ دار خاتون ہیں۔اب بھی ادبی جلسوں میں کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔لائبریری میں نصاب کے علاوہ دوسری کتابیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔مشہور ادیبوں کے افسانے اور ناول تقریباً سبھی پڑھ ڈالے۔میرا طریقہ کار یہ تھا کہ ناول پڑھ کر اس کے آغاز،انجام، مرکزی خیال اور اہم کرداروں کے بارے میں نوٹ لے لیا کرتی تھی یہ کاپی اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

میری ہم جماعت لڑکیوں میں نزہت صدیقی،سیدہ بشیر انساء،فرزانہ،بشیر بانو، مسعود محمود، جمیلہ،تہذیب زور اور دوسری کئی طالبات تھیں۔ڈاکٹر سیدہ بشیر نے بہ حیثیت پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ میں خدمات انجام دیں اور ڈاکٹر فرزانہ نے دھرم ونت کالج میں شعبۂ اُردو کو سنبھالا۔ڈاکٹر رشید موسوی میری بہن کی ہم جماعت تھیں۔ریڈی ویمنس کالج میں شعبۂ اردو کی سربراہ رہیں۔اسے اتفاق کہئیے کہ برسوں بعد ہم چاروں قریب ہو گئے۔ہم سب گارڈن ٹاورس میں مقیم ہیں۔

بی۔اے کی تکمیل کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۵۹ء میں اُردو سے ایم۔اے کیا۔ میرے علاوہ تین طالب علم اور تھے۔خالدہ سراج،طاہرہ نقی اور صفی الدین۔ہم تینوں طالبات سامنے کی نشستیں سنبھال لیتیں۔صفی الدین انتہائی،شریف،غریب طبیعت کا لڑکا۔پیچھے کی بنچ پر خاموش بیٹھا لکچر سنا کرتا۔طاہرہ نقی ذرا شریر قسم کی لڑکی تھی۔اس سے کلاس میں رونق رہتی۔ افسوس کہ یہ تینوں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

ایم۔اے پڑھانے والوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری،پروفیسر سید محمد اور پروفیسر عبدالحفیظ قتیل تھے۔یہ تینوں اساتذہ جامعہ عثمانیہ کے بہترین،قابل اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ان سے بہت کچھ سیکھا۔جتنا علم حاصل کیا اُسے حتی الامکان شاگردوں میں

بانٹنا چاہتی ہوں۔

ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے دکنی زبان کی قواعد مکمل کی۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔اس وقت میری عمر ۲۷ سال تھی۔عثمانیہ یونیورسٹی ہی سے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد پر مقالہ لکھ کر ۱۹۶۶ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔میں نے صرف ڈگری کے حصول کے لئے ہی لکھنے کا کام نہیں کیا۔یہ سلسلہ اللہ کے فضل وکرم سے جاری ہے۔پوری کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، تنقید، تحقیق کے علاوہ طنز ومزاح لکھنے کا جو فطری ذوق ملا ہے اس کا صحیح استعمال کروں۔اور آخری سانس تک اُردو زبان وادب کی خدمت کرتی رہوں۔

○○○○

والد

میرے والد مرزا ضیاء الدین بیگ کی پیدائش ۲رفروری ۱۹۰۱ء مطابق ۱۲رشوال ۱۳۱۹ھ قصبہ ہچک تلی تعلقہ چٹگوپہ علاقہ جاگیرنواب سرآسمان جاہ بہادر ضلع بیدر میں ہوئی۔ یہ قصبہ بیدر سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی ہندوؤں کے ساتھ تعلقات بہت اچھے تھے۔ دونوں اقوام شیر وشکر کی طرح مل جل کر رہتی تھیں۔

والد نے اپنی خودنوشت ''میرے شب وروز'' میں لکھا ہے کہ والدین نے ان کا نام مرزارزاق علی بیگ رکھا تھا لیکن ان کے ماموں سید شاہ خلیل اللہ حسینی نے اپنے جدِ امجد کے اسمِ مبارک پر مرزاضیاءالدین بیگ رکھا۔ میرے دادا مرزا سرفراز بیگ صاحب زمیندار دو گھوڑوں کے سلحدار تھے۔ جو سرآسمان جاہ کی جاگیر کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ میری دادی سیدہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ نعمت اللہ ولی کرمانیؒ سے ملتا ہے۔ جن کی پیشن گوئیاں بہت مشہور ہیں۔ پردادا مرزا محمد بیگ سلحدار تھے۔ جن کے والد مرزا حیدر بیگ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں اپنے بھائی مرزا نواز بیگ کے ساتھ گلبرگہ تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کے سجادہ نشین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک قران شریف اور تلوار تھی۔ سجادہ نشین صاحب نے ان دونوں بھائیوں کی سپہ گری میں غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر اپنے ہاں موزوں خدمات پر مامور فرمایا۔ گلبرگہ شریف سے قریب ایک موضع ہن کنٹہ ہے۔ اس موضع کی مسجد عرصہ سے غیرآباد تھی۔ شر پسندوں کا قبضہ تھا۔ اطلاع ملنے پر اُن دونوں بھائیوں نے وہاں پہنچ کر مسجد کو آباد کیا۔ ان دونوں کے مزار ایک بزرگ اسمٰعیل قادریؒ کے گنبد کے سامنے چبوترے پر واقع ہیں جہاں بستی کے لوگ ہر جمعرات کو فاتحہ پڑھ کر پھول چڑھاتے ہیں۔

والد کی عمر ۵ سال تھی کہ میری دادی صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ اسی سال والد کو قصبے کے ایک جنگم (پجاری) کے پاس مرہٹی اور حساب کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ اس کا نام سن مُکپّا تھا۔ ۴ سال کی مدّت میں انھوں نے مرہٹی کی چھٹی کتاب پڑھ لی۔ ریاضی میں بھی ساتویں جماعت تک کی مہارت حاصل کر لی۔ مدرسے کے وہ واحد مسلمان طالب علم تھے۔ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۹ء والد صاحب نے بیدر میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۶ء میں مڈل اور ۱۹۱۹ء میں میٹرک کامیاب کیا۔

اعلیٰ جماعتوں کی فیس دیڑھ روپیہ تھی۔ اُس زمانے کے تعلیمی معیار کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن اُردو کے ایک جلسے میں تقریری مقابلے میں اچھے مظاہرے پر انھیں الفاروق بطور انعام دی گئی تھی۔ اسکول کے معائنے کے لئے وقتاً فوقتاً نامور ہستیاں آیا کرتیں۔ ڈاکٹر الماللطیفی ناظم تعلیمات، ڈاکٹر عبدالستار، سرراس مسعود، پروفیسر عبدالرحمٰن خاں، پروفیسر جی ولنکر، مسٹر جارج نندی کے نام بطور خاص لئے جا سکتے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں حیدرآباد آئے اور جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ ان کے ہم جماعت طلبا میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ، ڈاکٹر سید حسین وائس چانسلر، پروفیسر ضیاء الدین انصاری پرنسپل انجینئرنگ کالج، بیرسٹر اکبر علی خان گورنر اتر پردیش، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، پروفیسر لطیف احمد فاروقی شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر منور علی پروفیسر میڈیکل کالج، پروفیسر فضل حق پرنسپل نظام کالج اور ڈاکٹر ظہیرالدین صدر شعبۂ دینیات۔

والد صاحب نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی وہ اپنے اپنے شعبوں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ان اصحاب کے نام گرامی یہ ہیں۔ پروفیسر حسین علی خان، پروفیسر جی ولنکر (انگریزی) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (فلسفہ) پروفیسر سید سجاد، پروفیسر وحید الدین سلیم (اُردو) پروفیسر عبدالحمید خان (فارسی) مولانا عبدالباری اور مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی (دینیات)

پروفیسر ہارون خان شروانی (تاریخ ہند)۔

۱۹۲۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ٹی کامیاب کیا۔ اپنی سوانح میں انھوں نے ضمناً لکھا ہے کہ علی گڑھ میں ہر سال اعلیٰ پیمانہ پر نمائش منعقد ہوتی تھی۔ انھوں نے پتلون کا قیمتی اونی کپڑا خریدا۔ قیمت دس روپیہ اور سلوائی چار روپیہ۔

والد صاحب نے مختلف اضلاع میں ملازمت کی۔ پربھنی، ناندیڑ، اودگیر وغیرہ۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اضلاع میں والدہ اور ہم بہن بھائی بھی اُن کے ساتھ رہے۔

۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۴ء گلبرگہ شریف میں خدمات انجام دیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''جب میرا تبادلہ ۱۹۳۰ء میں ضلع گلبرگہ کی نظارت تعلیمات پر عمل میں آیا تو نواب معشوق یار جنگ بہادر اول تعلقدار تھے جو میری اہلیہ کے نانا نواب سخاوت یار جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب معشوق یار جنگ نے اپنے بنگلے سے متصل ایک حصے میں ہم کو ٹھیرایا۔ میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں۔ ہم لوگ بڑے آرام واطمینان سے رہے''۔

۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۳ء ناظر مدارس رہے۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۰ء پرسنل مددگارِ ناظم تعلیمات رہے۔ سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات تھے۔ علی اکبر صاحب کی سبکدوشی کے بعد فضل الرحمٰن صاحب اور پھر فیض الدین صاحب ناظمِ تعلیمات بنے۔ انھیں کسی نے باور کرایا کہ پرسنل مددگاری کی جائیداد غیر ضروری ہے۔ چنانچہ ان کا تبادلہ اورنگ آباد کالج پر کردیا گیا۔ یہاں سے دارالشفاء ہائی اسکول کی صدارت دی گئی۔ جس کی مدت ایک سال تھی۔ جائزہ لیتے ہی انھوں نے اسکول کے لئے فلاحی کاموں میں دلچسپی لی۔ تعلیمی معیار کو بلند کیا۔ اس سلسلے میں ضمناً اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ والد کو تمام میوہ جات بے حد مرغوب تھے۔ خصوصیت سے آم۔ دارالشفاء اسکول کے نزدیک آم کی منڈی تھی۔ آم ہراج ہوتے تھے۔ چار روپیہ میں ایک انٹکا (بڑا ٹوکرا) ملتا تھا جس میں تقریباً پانچ سو آم ہوتے تھے۔

۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ ایک صاحب کو بلدہ میں لینا تھا اس لئے والد کا تبادلہ صدارت مدرسۂ فوقانیہ ناندیڑ پر کر دیا گیا۔ وہ اس سے قبل ناندیڑ میں نظارت کے عہدہ پر کام کر چکے تھے انھوں نے سوچا کہ زیادہ دشواریوں کا سامنا نہ ہوگا لیکن پولیس ایکشن کے بعد ہر مدرسے کے حالات بدل چکے تھے۔ یہاں انھیں بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان کی ملازمت کا پورا دور نیک نامی سے گزرا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ ناندیڑ ہی سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

والد صاحب کے چند اصول تھے جن پر عمل پیرا ہو کر انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مشکل سے مشکل حالات پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ جو ذمہ داریاں انھیں سونپی گئیں حتی الامکان انھیں پوری طرح نبھایا۔ ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ اپنی زبان یا عمل سے کسی کا دل نہ دکھایا جائے۔ ہمت، صداقت اور حسن سلوک سے کام کر کے انھوں نے اپنے ماتحتین کے دلوں میں جگہ بنائی۔

یہ تو تھا ان کی سرکاری زندگی کا ایک مختصر سا جائزہ۔ گھریلو ذمہ داریوں کو بھی خوب نبھایا۔ بیوی بچوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ ہم سب بھائی بہنوں کو پڑھانے لکھانے' اخلاقی، دنیاوی اور دینی تعلیم دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ ملازمت کے دوران اُن سے جو ناانصافیاں کی گئیں، ذہنی تکلیف پہنچائی گئی اس کی کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نیک اولاد دے کر ان کے دل کو سکون بخشا۔

ہمارا گھر کافی کشادہ تھا گرمی کے دنوں میں صحن میں ہم سب بھائی بہن امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے۔ ایسے وقت خاندان کا کوئی فرد گھر میں آ جاتا تو وہ بے چین ہو جاتے۔ ہماری پڑھائی کا خیال کر کے آنے والے مہمان کو گھر کے کسی دوسرے حصے میں لے کر چلے جاتے۔ وہ گفتگو میں محو ہو جاتا۔ اُسے احساس دلانا نہیں چاہتے تھے کہ اس کی موجودگی بچوں کی پڑھائی میں خلل ڈال رہی ہے۔

قابلیت کا اس بات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی زبانوں پر عبور

رکھتے تھے۔ انگریزی اُردو اور فارسی کے علاوہ پنجابی بہت اچھی بولتے تھے مرہٹی ، کنڑی میں بھی خاصا عبور تھا۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ ۱۹۶۳ء پاکستان منتقل ہوئے۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران انھوں نے چند مضامین لکھے تھے۔ لیکن کراچی میں ادبی ذوق کی تکمیل کرنے کے مواقع زیادہ ملے کیونکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھیں لکھنے کے لئے فرصت میسر آئی۔ ستر سال کی عمر میں انھوں نے ''احوال و آثار حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانیؒ'' لکھی۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں وہ ایران بھی گئے۔ شاہ صاحبؒ کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے بعد رباعیات سرمد، میرے شب و روز اور دل کے کرشمے کتابیں تصنیف کیں۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانیؒ پر لکھی گئی کتاب کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی، ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اس کا چرچا رہا۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔ خواہش منداصحاب کی فرمائش پر انھیں زیراکس کرواکے تحفتہً دے دیا کرتی ہوں ۲۰۰۵ء میں ،میں نے کتاب کا مسودہ جناب غلام صابر صدیقی اور جناب عبدالستار کرمانی اراکین نعمت اللہ ولی کرمانی ریسرچ بورڈ کے حوالے کیا، اس اجازت کے ساتھ کہ وہ والد کی اس کتاب کو دوبارہ کمیٹی کی جانب سے شائع کر سکتے ہیں۔

والد نے طویل عمر پائی۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد دو تین بار حیدرآباد آئے۔ میں بھی اپنے ارکانِ خاندان کے ساتھ ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملنے کئی بار کراچی جا چکی ہوں۔ والد کی علالت کی اطلاع پر ایک عرصہ بعد سب بھائی بہن یکجا ہوئے۔ ایک دن اطمینان بھرے لہجے میں مجھے سمجھا کر کہنے لگے۔ دیکھو بیٹے! زندگی اور موت تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے میرے بعد تم صدقہ خیرات دے دیا کرنا۔ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔ ۱۹۸۱ء میں کراچی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۹۸۹ء میں جب کراچی گئی تو گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے خالی کمرے پر نظر پڑی۔ بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ مشفق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے آمین۔

○○○

والدہ

امّی کا نام فخر النساء بیگم ہے۔ ان کے والدین عبدالمجید خاں اور نور جہاں بیگم ہیں۔
امّی کی خالہ زاد بہن محترمہ طیبہ صاحبہ (بیگم نواب مشتاق احمد خاں) نے حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہونے کے بعد خاندانی شجرہ تیار کیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی تیاری اور مواد کی فراہمی کے لئے انھوں نے اپنے دادا نواب عنایت حسین خاں کی لکھی کتاب ''سرگذشت ایام غدر'' سے مدد لی ہے۔ اس کے علاوہ خاندان ہی کی ایک معتبر خاتون محترمہ احمدی بیگم عرف امیر بیگم سے بھی معلومات حاصل کیں۔ امیر بیگم صاحبہ نے ۹۵ سال عمر پائی۔ طویل عمری کی بنا پر وہ اس خاندان کی کئی بزرگ ہستیوں سے مل چکی تھیں۔ خداداد ذہانت کی وجہ سے انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے بارے میں اہم معلومات فراہم کیں۔ کافی مواد تو انھوں نے لکھ کر محفوظ کر رکھا تھا۔ اس طرح محترمہ طیبہ بیگم نے یہ شجرہ تیار کر کے پاکستان میں سارے خاندان میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد جب مجھے میری والدہ سے یہ شجرہ ملا تو ہم بہن بھائیوں نے ہمارے علاوہ ہندوستان میں مقیم افراد خاندان کے لئے اس کی تیس زیراکس کاپی کروائیں۔ بعد کی نسل کے جن بچوں کے نام اس میں شامل نہیں تھے۔ ان ناموں کا اندراج کیا۔ اس کے لئے جناب محمود سلیم سینئیر کیلی گرافسٹ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے تعاون کیا بہت کم عرصے میں انھوں نے کام کی تکمیل کی۔ جس کے لئے میں اور میرے افراد خاندان ان کے ممنون ہیں۔
امّی کا سلسلۂ نسب سردار غلام محی الدین خاں بارکزئی سے ملتا ہے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افغانستان میں وزیر تھے۔ جب وہاں شاہ اور وزیر میں باہمی عداوت اور نااتفاقی شروع ہوئی تو وہ اور ان کے برادر نسبتی سردار غلام علی خاں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور معہ اہل و عیال عازمِ ہندوستان ہوئے۔ دونوں بے انتہا مال و دولت اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس وقت غلام محی الدین خاں کے بچے بہت کم سن تھے۔ پہلے یہ لوگ لدھیانہ میں ٹھہرے۔ کچھ

عرصہ بعد نقلِ مکانی کر کے کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ سردار غلام محی الدین خاں نے عام تجارت شروع کی اور غلام علی خاں نے بہ مقام سلہٹ خاص ہاتھیوں کی تجارت شروع کی۔ دونوں نے اپنی اپنی تجارت سے بہت نفع اٹھایا لیکن افسوس کہ غلام محی الدین خاں بارکزئی عالمِ جوانی میں شیر کے شکار میں ہلاک ہو گئے اور ان کے بڑے لڑکے سردار غلام یحییٰ خاں عرف سردار خاں اپنی کم سنی کی وجہ سے اتنا بڑا کاروبار سنبھال نہ سکے۔ تمام کارخانہ جات وغیرہ درہم برہم ہو گئے۔ البتہ نقد وجنس لاکھوں روپیہ کا باقی رہا۔ ان کی والدہ بڑی بیگم صاحبہ نے اپنے لڑکے سردار خاں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کلکتہ کے ایک بڑے مدرسے میں داخل کروایا اور وہ چودہ برس تک وہاں زیرِ تعلیم رہے۔ جب اعلیٰ درجہ کی تعلیم انگریزی، فارسی، عربی وغیرہ کی حاصل کر چکے تو الہ آباد میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گئے۔ انھوں نے الہ آباد ہی کو اپنا وطن بنا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس سے قبل وہ کچھ عرصہ مین پوری میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے۔

شجرہ کے ساتھ اس خاندان کے تفصیلی حالات بھی بہت عمدگی سے شجرہ کی پشت پر درج ہیں۔ سردار غلام یحییٰ خاں عرف سردار خاں امّی کے پردادا ہیں۔ ان کی پہلی شادی ان کے ماموں کی لڑکی سے کلکتہ میں ہوئی۔ ان کی اولاد یہ ہے۔ محمد حسین خاں، عنایت حسین خاں، فاطمہ کبریٰ بیگم، ولایت حسین خان، فاطمہ صغریٰ بیگم۔

لاٹ صاحب (وائسرے) کا دفتر جو کہ اس زمانے میں صدر کہلاتا تھا جب آگرہ منتقل ہوا تو سردار خاں کا تبادلہ بھی آگرہ ہو گیا۔ یہ اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے اور آٹھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ یہاں انھوں نے دوسری شادی ایک مغل خاندان کی لڑکی سے کی جن کا نام ولایتی بیگم تھا۔ شادی کے بعد ان کو نواب بیگم کا خطاب دیا گیا۔ یہ لوگ لکھنو کے رہنے والے تھے۔ نواب بیگم سے جو اولاد ہوئی یہ ہے۔ (۱) فاطمہ بیگم (۲) سکینہ بیگم (۳) غلام قادر خاں (۴) عبدالقادر خاں (۵) محمد یوسف خاں۔ عبدالقادر خاں امّی کے دادا ہیں۔ یہ وکالت کرتے تھے۔ ان کا مزار چادر گھاٹ کے پل کے پاس واقع ہے۔

آگرہ سے سردار خاں کا تبادلہ باندہ ہوا۔ ان کے باندہ کے قیام کے زمانہ میں ہی غدر کا واقعہ پیش آیا۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔ اور بہت سوں کی جانیں بچائی تھیں۔ غدر کے زمانے میں نواب باندہ کو جو نواب بہادر کہلاتے تھے انگریزوں کے مقابلے میں جیت ہوگئی تھی انھوں نے سردار خاں کو توپ کے سامنے بٹھا کر کہا تھا کہ اگر ہماری طرف سے کام نہیں کیا تو تمھیں توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ اس وقت انھوں نے صرف پندرہ دن نواب کا کام کیا اس کے بعد نواب پھر انگریزوں سے ہار گیا اور انگریزوں کی جیت ہونے پر اس وقت کے کلکٹر نے غداری کے الزام میں سردار خاں کو قید کر دیا۔ ایک سال ان پر جیل میں مقدمہ چلا اور اس کے بعد چھ سال کے لئے مورمین کالا پانی کی سزا ہوگئی، جلاوطن کردیئے گئے۔ بعد میں الزام غلط ثابت ہونے پر انھیں رہا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ مجھے میری والدہ نے بھی سنایا تھا۔ جسے میں نوٹ کرتی چلی گئی تھی۔ اس کی تفصیل میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ امّی کے پردادا کے واقعات ہیں دوسرے یہ کہ ان سے اس زمانے کے سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ سردار خاں کا باندہ میں ایک بنگلہ تھا اور کوٹھی تھی جس میں کلکٹر رہتا تھا۔ باقی جائیداد الہ آباد میں تھی۔ الہ آباد کی جائیداد میں محل، کنواں، مسجد ایک بنگلہ علیحدہ مردانہ گھر، یہ سب ایک ہی احاطے میں تھے۔ بنگلہ میں خاندان بھر کا بہت سا مال دفن تھا اور قیمتی سامان سے گھر بھرا ہوا تھا۔ کلکتہ میں غلام محی الدین خاں بارکزئی کا جو بنگلہ فروخت کیا گیا تھا اس کے روپے، اس کے علاوہ ایک گھڑا بھر روپے، ایک ٹھلیا اشرفیاں، تین دیگ چاندی کا سامان اور دو ہانڈیاں سونے اور جڑاؤ زیورات کے جو کہ سب بہو بیٹیوں کا تھا اس میں کچھ تو تہہ خانہ میں زمین میں دفن تھا اور کچھ بنگلہ میں رکھا تھا۔ غدر کے زمانے میں سب عورتیں اور بچے اسی طرح بھرا پُرا گھر چھوڑ کر جان بچاتے بھاگ گئے تھے۔ اس کے بارے میں محترمہ طیبہ بیگم نے لکھا ہے کہ یہ جائیداد اور دیگر سامان نصیر الدین نامی زمیندار کو دے دیا گیا۔ زمین میں دفن کئے گئے زیورات وغیرہ سے وہ

لاعلم تھا۔ غدر کے زمانے میں جو زیورات اور قیمتی اشیاء تہہ خانوں اور زمین میں دفن کر دی گئی تھیں ایک ملازمہ اس راز کو جانتی تھی۔ امّی کے دادا کے ایک بھائی محمد حسین خاں نے اس ملازمہ کو ساتھ لے جا کر نصیر الدین زمیندار سے بات کی اور یہ بھی وعدہ کیا کہ زرد جواہر، اشرفیاں اور جو بھی بیش قیمت اشیاء ہیں ان میں سے آدھا اُسے دے دیا جائے گا۔ پہلی مرتبہ گڑھا کھودنے پر جو سونا چاندی اور دیگر سامان دستیاب ہوا اس میں سے آدھا نصیر الدین کو دے دیا گیا۔ محمد حسین خاں دوبارہ جب مزید سامان لینے گئے تو نصیر الدین نے کوٹھی کی پھاٹک بند کروادی کسی کو اندر آنے نہیں دیا۔ زرو جواہرات خود لے لئے۔ سردار خاں کی اولاد جب حکومت سے مقدمہ میں اپنی جائداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور یہ مکان ان کی ملکیت بن گیا تو نصیر الدین نے تمام بھاری زرین دوشالے اور قیمتی کپڑے جلا دیئے تاکہ کسی کو نہ مل سکے اور وہ بھی پکڑا نہ جائے۔ جب بھاری کپڑے جلائے گئے تو ان میں اتنی چاندی تھی کہ پانی کی طرح نالیوں سے بہہ کر باہر نکل گئی۔

سردار خاں کے ایک انگریز دوست جو کلکتہ میں ان کے ہم جماعت تھے۔ مورمین میں بندوبست کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنے اثر سے بندوبست میں چودہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ایک جگہ ملازمت دلوادی۔ وہاں اُن کی زندگی بہت اچھی گزری۔ مگر اپنی آمدنی کا ایک پیسہ بھی گھر نہیں بھیج سکتے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک تاجر کی لڑکی سے شادی کی۔ جن کو بہو بیگم کا خطاب دیا گیا۔ یہ لوگ بے حد مالدار تھے۔ جس وقت ہندوستان واپس آئے تو بہت مال و دولت، زرو جواہر، قیمتی پارچہ جات کے لاتعداد صندوق بھرے ہوئے اپنے ساتھ لائے۔ سردار خاں نے واپس آکر کچھ عرصہ باندہ میں ملازمت کی۔ پھر رامپور کے نواب نے اپنے لڑکے کلب علی خاں کا اتالیق بنا کر رامپور بلالیا۔ اور انھیں سرکاری مکان اور سواری بھی دی گئی اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

رامپور میں دس بارہ سال رہنے کے بعد سردار خاں ریاست حیدرآباد دکن آکر ملازم

ہوئے اور اول تعلقداری تک ترقی کی۔ وہ دیگلور ضلع حیدرآباد میں اول تعلقدار تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

امّی کی والدہ محترمہ نور جہاں بیگم زوجۂ عبدالمجید خاں تھیں۔ یہ سخاوت حسین خان کی دختر تھیں جنھیں حکومت کی جانب سے سخاوت یار جنگ کا خطاب ملا تھا۔ یہ اس وقت اول تعلقدار تھے۔ سخاوت یار جنگ کے ساتھ ہی ان کے بھائی کو بھی معشوق یار جنگ کا خطاب حکومت نے دیا تھا۔ سخاوت یار جنگ جو امّی کے حقیقی نانا تھے ان کی دیوڑھی سخی منزل ملک پیٹ میں واقع تھی۔ بہت بڑے احاطے میں ایک جانب شاندار بنگلہ دوسری جانب لائن سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اپنے پرنانا کو میں نے دیکھا ہے۔ ان کا شفقت بھرا ہاتھ بھی یاد ہے۔ بہت ہی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ سخی منزل میں امی کے پانچ ماموں اور دو خالائیں بھی تھیں۔ امّی کی والدہ کا انتقال عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ سخی منزل کی ساری باتیں مجھے یاد ہیں۔ اتنا وسیع رقبہ تھا کہ ایک بہت بڑی کالونی کی تعمیر ہو سکتی تھی۔ ہم سب بہن بھائی امّی کے ساتھ جاتے اور کبھی چھٹیوں میں وہاں رہ جاتے۔ امّی کی دونوں خالائیں انہیں بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ ماموں بھی چاہتے تھے لیکن جب پیسہ درمیان میں آتا ہے تو چاہت کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ میرے پرنانا نواب سخاوت یار جنگ کے انتقال کے بہت بعد جب سخی منزل فروخت ہوئی تو کسی نے کہا کہ میری والدہ کو بھی کچھ رقم دینی چاہئے جیسا کہ میں نے لکھا ہے امّی کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے شرعی حصہ تو نہ تھا لیکن امّی کی خالائیں چاہتی تھیں کہ انھیں بھی کچھ دیا جائے۔ سنا کہ امّی کے ایک ماموں نے فوراً کہہ دیا اُسے کیوں دیں کیا وہ فقیرنی ہے؟ امّی کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ اکثر اس کا ذکر کر کے رو دیتی تھیں۔ ماموں کے الفاظ کانوں میں گونجتے تھے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ مغرور کا انجام دنیا نے دیکھا۔ دل دکھانے والے ماموں اور ممانی نے اپنی زندگی کے آخری ایام کسمپرسی میں گزارے۔ موٹر نشین تھے نوکر چاکر بنگلہ کچھ نہ رہا۔ جھولوں میں جھولنے والے ان دونوں کی

زندگی کا آخری دور سبھوں نے دیکھا۔ امّی کا صبر خالی نہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنا نوازا کہ دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹا۔ سینکڑوں محتاجوں اور مستحق افراد کو انھوں نے سہارا دیا۔

سخی منزل سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ کئی باتیں بہت اچھی طرح ذہن میں ہیں۔ ابھی میں نے امّی کے ایک ماموں کا ذکر کیا۔ ان کے پاس ہر سال ماہ رجب کی گیارہ تاریخ کو بہت ہی اہتمام سے کونڈوں کی نیاز ہوتی۔ بہت بڑے دستر خوان بچھتے۔ صبح سے شام تک کھانے کھلانے کا سلسلہ چلتا۔ یہ فاتحہ کھیر پوریوں پر نہیں ہوتی تھی۔ مٹی کے کونڈوں میں میٹھا کھانا اور اس پر بالائی کی پرت جمائی جاتی۔ دوسرے کونڈوں میں جلیبی اور بالائی رکھی جاتی۔ میٹھا کھانا بنانے والے خاص باورچی تھے جو انتہائی لذیز پکوان کرتے تھے۔ غرباء کے لئے بھی کھانے کا خاص انتظام ہوتا۔

بھانامتی کے بارے میں سنتے آئے تھے کہ یہ ایک سفلی عمل ہے جس سے کسی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ الماریوں میں رکھے کپڑوں کا جل جانا، پریشان کن بیماریوں میں مبتلا ہونا، گھر پر پتھروں کا گرنا وغیرہ۔ سخی منزل میں ایک دفعہ ہم نے یہ نظارہ دیکھا۔ کئی دن تک بڑے بڑے اینٹوں کے ٹکڑے ایک طرف سے آکر دروازوں پر گرتے۔ سب لوگ کافی پریشان ہوئے اور بڑی جستجو کے بعد بھی پھینکنے والا نظر نہ آتا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی پولس والوں کو متعین کیا گیا تھا جو درختوں پر چھپ کر بیٹھتے اور خاطی کو پکڑنا چاہتے۔ مگر یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ سفلی عمل تھا۔

سخی منزل کے بارے میں کچھ تفصیل میں نے لکھ دی۔ سخاوت یار جنگ نے اپنی ساری زندگی انتہائی شان و شوکت میں گزاری۔ ان کے والد نواب عنایت حسین خاں (وزیر بھوپال) تھے یہ امّی کے پرنانا ہیں۔ ان کے تفصیلی حالات خاندانی شجرہ میں قلمبند ہیں۔ نواب عنایت حسین خاں مئی ۱۸۳۴ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ خاندانی اعزاز کی وجہ سے انگریز حکام نے سولہ سال کی عمر میں ضلع باندہ میں تحصیلدار مقرر کیا۔ ۱۸۵۴ء میں

ایک امتحان پاس کرنے کے بعد قائم مقام تحصیلدار جیت پور مقرر ہوئے۔ اسی سال ترقی پا کر ضلع ہمیر پور میں مستقل تحصیلدار مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت دیانت داری، ہمت اور جفاکشی سے کام کیا۔ اس کے بعد جالون میں تحصیلدار کے عہدے پر فائض کئے گئے۔ اس وقت تائی بائی صاحبہ وہاں کی رئیسہ تھیں۔ انگریزوں نے انھیں قلعہ کے اندر محلات میں جوشیش محل اور راجہ محل کہلاتا تھا، رہنے کے لئے جگہ دی۔ یہ معہ خاندان وملازمین وہاں بہت ہی عزت اور شان وشوکت سے رہا کرتے تھے۔

عنایت حسین خاں برٹش گورنمنٹ سے پنشن ملنے کے بعد ریاست بھوپال میں نائب وزیر نوبداری مقرر ہوئے۔ بعد میں وزارت کا پورا عہدہ انھیں دے دیا گیا۔ وہ نواب شاہجہاں بیگم کے زمانے سے نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے تک وزیر رہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئیں تو انھیں بھی معہ دس افراد خاندان اپنے ہمراہ لے گئیں۔ عنایت حسین خاں کا انتقال ان کے لڑکے لطافت حسین خاں کے پاس بریلی میں ہوا جب کہ وہ وہاں فوج میں کپتان تھے۔

شادی کے وقت میرے والد کی تنخواہ صرف ایک سودس روپیہ تھی۔ اعظم پورہ، صحیفہ مسجد کے پاس امی کا ایک مکان تھا جس میں اسکول تھا۔ اس کا کرایہ ابتداء میں ۹۰ روپیہ اور بعد میں تین سو روپیہ آتا تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں ۶ ملگیاں تھیں۔ ایک ملگی کا کرایہ ۲ روپیہ اور باقی پانچ کا کرایہ ۵، ۵ روپیہ آتا تھا۔ فروخت کرنے کے بعد اب اس مکان کے آدھے حصے کو شادی خانہ بنا دیا گیا ہے عروسہ فنکشن ہال نام ہے۔ آدھا مکان ویسے ہی رکھا گیا ہے۔ اعظم پورہ والے مکان کے علاوہ امی کے دادا کے کئی مکانات تھے جن میں سے پانچ امی کے حصے میں آئے۔ بعد میں سعید آباد (عقب درگاہ اجالے شاہ صاحب) میں امی پپا نے ایک مکان بنوایا۔ میں نے اس مکان کی لاگت اور دیگر باتوں کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ امی نے بتایا کہ انھیں اپنی نانی، دادی اور سسرال سے جو زیورات ملے تھے ان میں سے چند زیور

فروخت کر کے اس مکان کی تعمیر کروائی گئی۔ زیورات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ½ سیر سونے کے پازیب، تین پاؤ سونے کے توڑے، سات تولے کی تلسی، کمر پٹہ، ٹھسی، جڑاؤ پہنچیاں، سونے کی پہنچیاں، بارہ چوڑیاں سادی اور بارہ جالدار، چاند بالیاں، بیس تولے کی زنجیر، بیس تولے کے بازو کے کڑے اور کنگنیاں چکنی اس کے علاوہ بہت سی انگوٹھیاں چھلے اور دوسرے کئی زیور تھے۔ اس وقت سونا ۲۵ روپیہ تولہ تھا۔ جوہری نے ''کھوٹ میل اور ٹانکے'' کا حساب کر کے بیس روپیہ تولہ سے خریدا تھا۔ اعظم پورہ والے مکان میں چوں کہ اسکول تھا اس لئے ہم گرما کی چھٹیوں میں چند ہفتے وہاں گزارتے تھے۔

کئی برس پہلے کا ذکر کرتے ہوئے امّی نے بتایا کہ اس وقت آمدنی محدود ہوتے ہوئے بھی روپیہ میں برکت تھی۔ گھر میں ہر چیز افراط سے آتی۔ نوکروں کی تنخواہ اور دوسری اشیاء کی قیمتوں کے بارے میں میں نے امّی سے جو تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں وہ اس طرح ہیں۔

کھانا پکانے والی کی تنخواہ	....	پانچ روپیہ ماہانہ
اوپری کام والی	....	آٹھ آنے ماہانہ
مالی	....	دس روپیہ ماہانہ
چوکیدار	....	دس روپیہ ماہانہ

اجناس اور دیگر اشیاء کی قیمتیں:

گیہوں	....	ایک روپیہ میں سولہ سیر
چاول	....	ایک روپیہ میں سولہ سیر
جواری	....	ایک روپیہ میں بیس سیر
دالیں	....	ایک روپیہ میں پانچ سیر
املی	....	ایک روپیہ میں آٹھ سیر
چھالیہ	....	ایک روپیہ میں دو سیر

مٹھائی	....	ایک روپیہ میں تین سیر
دودھ	....	ایک روپیہ میں چار سیر
مسکہ کا گھی	....	ایک روپیہ فی سیر
گوشت	....	ایک روپیہ فی سیر
مرغی کے چوزے	....	ایک روپیہ میں چار عدد
مرغی	....	ڈیڑھ روپیہ
انڈا	....	ایک آنہ
بکرا	....	تین روپیہ

کپڑے اور سلوائی

ململ اور ہرک	....	ایک روپیہ میں چار گز
پیور سلک ساڑی	....	بارہ روپیہ
قمیص کی سلوائی	....	چار آنہ
پیجامہ کی سلوائی	....	چار آنہ
پتلون کی سلوائی	....	دو روپیہ
شرٹ کی سلوائی	....	دو روپیہ
شیروانی کی سلوائی	....	سولہ روپیہ

والدین نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں اعظم پورہ والے مکان کا کرایہ آتا تھا لیکن ہم سب بچوں کے لئے اچھی غذا اور تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے والد کی تنخواہ اور کرایۂ مکان ناکافی ہوتا۔ ہم مختلف جماعتوں میں پڑھ رہے تھے۔ جب بھی داخلہ فیس اور امتحان کی فیس کا وقت ہوتا، امّی کے مستعملہ بھاری کپڑوں کے مسالے، جھمکیاں وغیرہ جلا کر سنار کے ہاتھوں فروخت کرتے۔ امّی

کا کہنا ہے کہ ہر کرتے اور دوپٹے میں بیس بیس تولے چمکی تھی۔ بنارسی ساڑیاں، کمخواب کے کپڑے، کارچوبی کام کی ساڑیاں، جاکٹ، پانچ سیر چاندی کا پاندان، ناگردان، بہر حال مختلف وقتوں میں یہ چیزیں کام آتیں۔

سانچے گوٹے، مسالے اور دیگر کپڑوں کو جلانے کا کام میں خود کرتی امی کی نگرانی میں ایک بڑی کڑاہی میں یہ چیزیں رکھ کر تھوڑا سا مٹی کا تیل چھڑک کر جلانے کے بعد چاندی ہاتھ آتی۔ صاف کر کے گھر میں تول کر فروخت کرنے لے جاتے۔ اس وقت چاندی چار آنہ تولہ تھی۔ امتحان کی فیس کی ادائی کے لئے کبھی زیور بھی بنک میں رکھوائے گئے۔ ان حالات میں امی پپا نے ہم لوگوں کو تعلیم دلوائی۔ پپا کے ایک زندہ دل دوست محمد صدیق بیگ صاحب کہا کرتے دس انڈوں میں ایک بھی گندہ نہیں!

امی کی بتائی ہوئی قیمتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے طالب علمی کے زمانے کو یاد کرتی ہوں۔ پھر موجودہ دور سے مقابلہ کرتی ہوں تو قیمتیں آسمان پر چڑھ گئی ہیں۔ تنخواہوں میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن مہنگائی کا پلہ بھاری ہی ہے۔ غالباً ۱۹۵۰ء کا دور ہوگا۔ اُس وقت کی ارزانی اچھی طرح یاد ہے۔ گھر پر چھابڑی والی آتی تھی۔ اس میں بیر، بوٹ، گاجر، کویٹ، گینگل، تل کے لڈو اور اسی قسم کی کئی اشیاء ہوتی تھیں۔ ایک آنہ دے کر ہم بہت سی چیزیں خرید لیتے تھے۔

ارزانی کے اس دور میں زمین بھی سستی تھی۔ آٹھ آنے گز، سعید آباد میں زمین تھی۔ میں سوچتی ہوں کہ ہم سب بہن بھائی اپنی پاکٹ منی جمع کر کے پلاٹ لیتے تو لاکھوں کے ہو جاتے۔ لیکن اتنی دور کی سوچتا کون ہے۔ بہر حال جو گزر گیا اس کا ذکر کر کے پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

امی کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن زمانے کے تقاضے کچھ اور تھے۔ نانا ابا نے آٹھویں جماعت تک پڑھانے کے بعد اسکول کی تعلیم منقطع کردی۔ گھر پر پڑھانے سے

انھوں نے نہیں روکا۔ انگریزی، اردو، عربی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ امی پپا نے ہماری تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ تبھی تو ماشاءاللہ ہم دس بہن بھائیوں نے ان کا نام روشن کیا۔ سبھی فرماں بردار ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں سبھوں نے بہت محنت کی۔ ماں باپ کی دعائیں ہیں کہ سب اللہ کے فضل وکرم سے خوشحال ہیں۔ ترقی کے زینے طئے کر کے سبھی نے اپنے اپنے شعبوں میں نام کمایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دین ہے۔ میں ہر سانس پر اس کا شکرادا کرتی ہوں۔

۱۹۶۳ء کے بعد میں دور ہوگئی تھی کیوں کہ سب پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ والدین کی کسی طرح خدمت کرسکوں۔ جب بھی پاکستان جانا ہوتا وہاں کے قیام کے دوران میں زیادہ وقت انھیں کے ساتھ گزارتی۔ پھر جب وہ لوگ حیدرآباد آتے تو ہمارے ساتھ ہی رہا کرتے۔ اس طرح میں مطمئن ہوں کہ سسرال جانے کے بعد بھی مجھے اپنے ماں باپ کی خدمت کے مواقع ملتے رہے۔ امی جب آخری بار حیدرآباد آئیں تو یہاں سے واپس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ ویزا کی مدت ختم ہونے کے بعد قانونی طور پر جتنی بھی کوشش ہوسکتی تھی اجازت لے کران کے رہنے کے مواقع فراہم کئے۔ لیکن ۵، ۶ ماہ بعد انھیں اپنا وطنِ عزیز چھوڑنا ہی پڑا۔ اس کے بعد وہ نہیں آئیں۔ حالات ایسے بگڑ گئے تھے کہ ہم بھی پاکستان نہ جاسکے۔

پپا کا انتقال ہوا تو کئی دن میں سنبھل نہ سکی۔ باپ کا سایہ واقعی بڑی نعمت ہے۔ امی کے انتقال کی جیسے ہی خبر ملی ایسے لگا جیسے میں مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہوں۔ خالی پن کا شدید احساس۔ زندگی بھر انھوں نے جو قربانی دی دل و جان سے محبتیں نچھاور کیں وہ یاد بن کر رہ گئی ہیں۔ ایسے ماں باپ کی بیٹی ہونے پر جتنا فخر کروں کم ہے۔

امی کی سخاوت کے بارے میں لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحات درکار ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں ایسے ہی دیکھا، غریبوں محتاجوں کا وہ بڑا خیال رکھتی تھیں۔ مستحق افراد کی مدد

کرتی تھیں۔ نام ونمود کے لئے نہیں بس ایک ہمدردی کا جذبہ تھا۔ مستحق کی مدد کرنے کا انداز واقعی ایسا تھا کہ ایک ہاتھ سے دیتیں تو دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی۔ متعلقہ فرد کی زبانی معلوم ہوتا کہ انھوں نے کتنا خیال رکھا۔ پریشانیوں میں ان کے افراد خاندان، بچوں کو کیسے سہارا دیا۔ کئی بچوں کی پڑھائی کی فیس وہ ادا کرتیں۔ لوگوں کے گھریلو مسائل سنتیں' ان کا حل بتاتیں۔ نوکروں سے ہمدردی رکھتی تھیں۔ خاص بات جو بتانی ہے وہ ہے امّی کا صبر۔ گزشتہ دنوں کا ذکر کرکے کبھی ان باتوں کو یاد کرنے لگتیں جب ان کی سوتیلی دادی نے ان پر مظالم ڈھائے جائیداد کے سلسلے میں ناانصافی ہوئی۔ امّی سب سہہ گئیں۔ کبھی کسی کی دل آزاری انھوں نے نہیں کی۔ حسد، غیبت جیسی برائیوں سے پاک، ساری زندگی دوسروں کے لئے نمونہ تھی۔ لوگ حوالہ دے کر کہتے کہ کس طرح سے دین و دنیا کے کاموں میں وہ لگی رہیں۔ سماجی کارکن کے لیبل کے بغیر ہی انھوں نے خانہ نشین رہ کر اتنے کام کئے کہ شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں۔ عمر کے آخری حصے میں بیماری کی تکالیف کو سکون سے سہہ گئیں۔ انھیں اللہ کی آزمائش کہتیں۔ کسی نے دل آزاری کی، حق تلفی کی سب آزمائشوں سے وہ گزر گئیں۔ امّی میں جو صفات تھیں، انھوں نے خاندان اور معاشرے کی بھلائی کے لئے جو کچھ کیا، ان صفات کو اپنانے اور سماج کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے اگر میں نے تھوڑا بہت ہی سہی کچھ کام کیا ہو تو اس کا سہرا ماں باپ ہی کے سر جاتا ہے' خون کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں میں جو اچھائیاں نظر آئیں گی وہ ماں باپ کی تعلیم و تربیت اور خاندان کا اثر ہے۔ صبر و تحمل مجھ میں بھی ہے۔ ہر طرح کی آزمائشوں سے گزرنے، دلی تکلیفوں کو برداشت کرنے کا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے ودیعت کیا ہے۔ کسی نے ناانصافی کی ہو یا دل آزاری، زبان درازی کی یا باتوں کے الٹ پھیر سے اپنوں سے دور کرنا چاہا میں نے سب سہہ لیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ ہے وہ انصاف کرے گا۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

میں لکھ چکی ہوں کہ نانا ابا نے اس زمانے کی روایت کے مطابق امّی کی اسکول کی تعلیم

کا سلسلہ منقطع کر کے گھر ہی میں تعلیم دلوائی۔ دینی معلومات بہت اچھی تھیں۔ بزرگانِ دین سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ مختلف درود اور وظائف کثرت سے پڑھتی تھیں۔حزب البحر ایک جلالی وظیفہ ہے۔ امّی کا کہنا ہے کہ دادی صاحبہ کی کتاب امّی کے پاس تھی۔ انھوں نے بغیر کسی سے اجازت لئے پڑھنا شروع کر دیا۔لوگوں نے تنبیہ کی کہ نہ پڑھیں، پاگل ہو جائیں گی۔ امّی نے اس کا ذکر اس زمانے کے ایک بزرگ، حکیم سید حسین صاحب سے کیا یہ نابینا تھے۔ انھوں نے کہا آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی ہے، پڑھا کیجئے۔ ۳ صفر سے ۸ صفر تک روزہ رکھتی تھیں۔ اس دوران وہ صرف جو کی روٹی، لاہوری نمک اور کوئی پھل استعمال کرتیں۔ ترکاری استعمال کرنی ہو تو کھوپرے کے تیل میں پکاتیں۔ روزانہ ۱۲۰ مرتبہ اس وظیفہ کو پڑھنا ہوتا۔ اس کے بعد سال بھر میں وہ جب بھی چاہتیں، حزب البحر پڑھا کرتیں، کبھی روزانہ مسلسل پڑھتی رہتیں۔ حیدرآباد کے مشہور عالم جناب پاشاہ قادری صاحب امّی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حزب البحر کا ورد کرنے والی ہندوستان کی واحد خاتون ہیں۔

امّی انتہائی سادگی پسند واقع ہوئی تھیں۔ خواتین کو عموماً زیوروں سے والہانہ محبت ہوتی ہے۔ امّی نے کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ضرورت پڑنے پر سارے زیورات فروخت کر دیئے۔ یہی حال کپڑوں کا ہے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد مختلف ممالک سے آنے والے بچے ان کے لئے تحفتاً اچھی سے اچھی ساڑیاں لے آتے۔ امّی زیادہ کپڑے رکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اپنی مرضی سے سارے کپڑے دوسروں کو دے دیا کرتیں۔

امّی کی سخاوت کے بارے میں مختصراً بتا دوں کہ انھوں نے بے شمار بچوں کی پڑھائی میں تعاون کیا۔ کئی بچیوں کی شادی کے سلسلے میں مدد کی۔ بعض مستحق گھرانوں کے لئے زندگی بھر انھوں نے ممکنہ مالی امداد دی۔ جس کسی کو وہ دیتیں اسے احساس ہونے نہ پاتا کہ وہ مجبور ہے۔ کسی کے رحم وکرم پر چل رہا ہے۔ ملازمہ ہو تو اس کی تربیت سے لے کر شادی بیاہ تک کا پورا

ذمہ لیا۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھا۔ امی کی خوش نصیبی ہے کہ سب بچے نیک، اطاعت گزار ہیں۔ سبھوں نے ان کا ہر طرح خیال رکھا۔ کبھی دل نہ دکھایا۔ سبھی خوش حال ہیں۔ یہ خوش حالی یوں ہی نہیں ملی۔ بزرگوں، خصوصاً ماں باپ کی دعاؤں ان کی قربانی اور ایثار کے بدلے ملی ہے۔ بہر حال بچوں نے بھی اپنا یہ رویہ رکھا کہ ماں باپ کو دیتے گئے۔ کبھی یہ نہ پوچھا کہ امّی یہ روپیہ کس طرح خرچ کرتی ہیں کس پر خرچ کرتی ہیں۔ کراچی میں، میں نے دیکھا کہ اسٹیل کا بڑا ساڈبہ تھا۔ اسی میں نوٹ بھرے رکھے ہوتے۔ جس کو چاہتیں وہ دیتی چلی جاتیں۔ نہ جانے کتنے مستحق خاندانوں کو انھوں نے سنبھالا۔ پاکستان منتقل ہونے بعد بھی آخری سانس تک انھوں نے ان سب ملازمین اور دوسرے مجبور لوگوں سے رابطہ رکھا جو حیدرآباد میں برسوں سے کچھ نہ کچھ پا رہے تھے۔ ماہانہ وظیفہ کے طور پر، عیدین کے مواقع پر یا پھر زکوٰۃ، خیرات یا مدد کے طور پر۔ بہر حال' وہ دے کر خوشی محسوس کرتی تھیں۔ ایک دفعہ حیدرآباد آئی ہوئی تھیں۔ اسی وقت میرے ایک بھائی نے گھڑی بھیجی تھی۔ چند ہی دن ہوئے ہوں گے، ایک خاتون ملنے آئیں امی سے پہلی ملاقات تھی گفتگو سے اندازہ لگا کہ ان کی گھڑی خراب ہوگئی ہے اور وقت دیکھنے کے لئے شدید ضرورت بھی ہے۔ امّی نے باتوں ہی باتوں میں اپنی گھڑی انھیں یہ کہہ کر تھمادی کہ مجھے تو اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے کام آئے گی۔ امی کراچی واپس چلی گئیں وہیں انتقال ہوا۔ امّی کا دیا ہوا تحفہ ان صاحبہ کے پاس ہے۔ وہ کبھی ملنے آتی ہیں تو گھڑی بتاتے ہوئے امّی کے خلوص کو یاد کرکے آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔

امّی بے شمار خوبیوں اور اعلیٰ صفات کی حامل تھیں۔ ان کے صبر، خلوص ہمدردی وشفقت کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اعلیٰ ظرفی کے بارے میں لکھنا شروع کروں تو کئی صفحات درکار ہیں موضوع ختم نہ ہوگا۔ پاکستان سے جب کبھی وہ حیدرآباد آتیں میرے پاس قیام ہوتا۔ میری خالہ صاحبہ محترمہ بدرالنساء بیگم کے پاس بھی جا کر رہتیں۔ کیوں کہ ان دونوں کا خلوص، آپسی محبت بے مثال ہے۔ بہر حال میرے پاس رہتے ہوئے انھیں کئی مسائل سے دوچار ہونا ہوتا۔

ان کی سمدھن یعنی میری ساس اپنی روش تو بدل نہیں سکتی تھیں اس لئے روزانہ کوئی نہ کوئی نئی بات انھیں سنی پڑتی ۔ میری شکایتیں، توفیق صاحب کی شکایتیں، فرضی بیماریوں کا ذکر، اپنی بے کسی کی فرضی داستانیں ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ امی کے سامنے ہی میرے بارے میں طنزیہ گفتگو شروع کر دیتیں ۔ امی مجھے بے حد چاہتی تھیں ۔ ظاہر ہے ان کا دل دکھتا ہوگا، لیکن کیا مجال جو ایک لفظ بھی اپنی بیٹی کے بچاؤ کے لئے انھوں نے کہا ہو۔ بس ان کی باتیں سنتیں اور خاموشی اختیار کرتیں ۔ ایک دن میں کالج سے واپس آئی ۔ دیکھا کہ توفیق صاحب کا چہرہ سرخ اور چہرے پر ذہنی تناؤ، فکر مندی کے آثار، امی کا بھی یہی حال تھا۔ پتہ نہیں ساس محترمہ نے کیا کیا کہہ ڈالا ہوگا۔ وہ چاہتیں تو ان کی غلط اور دل آزار باتوں کو روک سکتی تھیں ۔ میرے بارے میں کہی گئی بے تکی باتوں کی مخالفت کر سکتی تھیں یا انہیں تنبیہہ بھی کر سکتی تھیں ۔ لیکن انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا، کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے سب سہہ گئیں ۔ یہ ایک وقت کا قصہ نہیں برسوں کا چلن یہی رہا۔ امی کی اعلیٰ ظرفی نہیں تو اور کیا ہے۔ ان صفات کو میں کیا نام دوں؟ ۔

○ ○ ○

سالی رعب جماتی ہے

میں نے اپنے والد کا شجرۂ پدری او رمادری لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ سلسلۂ مادری حضرت سید شاہ نعمت اللہ ولی کرمانیؒ قدس سرہ سے ملتا ہے۔ والد کی ایک خالہ محترمہ سیدہ حسینی بیگم ہیں، جن کے صاحبزادے سید زین العابدین ہیں۔ میرے والد کے حقیقی خالہ زاد بھائی۔ ان کی بیگم محترمہ عزیز النساء ہیں (عزیز النساء صاحبہ درگاہ حضرت شاہ خاموش قبلہ کے سجادہ نشین، سید شاہ صابر حسینی صاحب قبلہ کی دختر ہیں) اصل موضوع پر آتی ہوں۔ زین العابدین صاحب کی سب سے چھوٹی دختر شمس فاطمہ، بیگم زاہد علی خاں میری چچازاد بہن ہیں۔..... تو..... میں ہوں جناب زاہد علی خاں کی سالی!..... ادبی حلقوں میں اس لئے تذکرہ نہیں کرتی، زاہد علی خاں صاحب کہیں گے 'سالی رعب جماتی ہے' اتنے بڑے صحافی کو اپنا بہنوئی بتا کر۔ مجھے واقعی فخر ہے!

اخبار سیاست سے بچپن سے ناطہ جڑا ہے۔ برسوں سے اخبار سیاست پڑھ رہی ہوں۔ جناب عابد علی خاں ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اپنے اخبار میں شائع کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ گذشتہ کئی برسوں سے میرے مضامین اخبار سیاست میں شائع ہورہے ہیں، سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

○ ○ ○

پولیس ایکشن

پولیس ایکشن ہوا تو اس وقت ملک کے سیاسی' سماجی' معاشی حالات جو بھی ہوں گے۔ اس سے قطع نظر میں اپنے گھر کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں۔ ہمارے پاس بہت سی تلواریں، برچھے اور اسی قسم کے بہت سے ہتھیار تھے۔ اب یہ تو بتانا مشکل ہے کہ یہ ہتھیار گھر میں کیوں تھے۔ میرے خیال میں اس زمانے میں اپنی حفاظت کے لئے ان چیزوں کا رکھنا منع نہیں تھا۔ کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد کے کہنے پر گھر کے ملازمین رات میں ان ہتھیاروں کو توڑتے اور پھر بہت ہی احتیاط سے انہیں کسی کنویں میں پھینک آتے۔ ہم بہن بھائی خاموشی سے دیکھا کرتے۔

امی اپنی سلیقہ مندی کے لئے خاندان میں مشہور تھیں۔ گھر کی ہر چیز کی حفاظت، صفائی کا خیال ہمیشہ انہوں نے رکھا۔ میں بچپن سے دیکھتی آئی کہ گھر میں بے شمار، ہمہ اقسام کے چینی کے برتن تھے۔ بڑی بڑی مشقابیں' رکابیاں' نفیس نقش ونگار کئے کٹورے، کانچ کے قیمتی گلاس بہرحال ایسی نادر اشیاء کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ ایک طرف تو تلوار برچھے کنویں میں پھینکے گئے۔ دوسری طرف یہ نایاب برتن ٹین کے بڑے صندوقوں میں رکھ کر جمعرات بازار بھیجے گئے۔ بعض کٹوروں کے نقش ونگار اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان نادر اشیاء کے جانے کے بعد بھی امی کے پاس بہت سے برتن باقی رہے۔ میرے حصہ میں جو آئے میں نے انہیں بہت سنبھال کر رکھا ہے۔

میں نے ایک مقام پر واضح کیا ہے کہ ہندوستان میں صرف میں مقیم ہوں۔ باقی بھائی بہن پاکستان اور دوسرے مغربی ممالک میں ہیں۔ والدین نے جب ۱۹۶۳ء میں ترک وطن کیا

تو برتن کے علاوہ دوسری اور کئی نادر اشیاء تھیں جنہیں وہ نہیں لے جاسکتے تھے۔ میرے پاس قدیم زمانے کی چند میزیں' الماری اور ایک شش درہ ہے۔ ایک دفعہ میں نے اس پر پالش کروانے کے لئے ایک بڑھئی کو بلوایا۔ اس کی قدامت اور بناوٹ دیکھ کر اس نے کہا کہ اب اس کو بنانے کی صرف لاگت دس بارہ ہزار روپے سے زائد ہے۔ پولیس ایکشن کے وقت جو اشیاء فروخت کی گئیں ظاہر ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔

○ ○ ○

شادی

ذرا پوڈر لگا لو:

مولانا عبدالرحیم صدیقی حیرت کے گھر ہر ہفتہ درس ہوتا تھا۔ مولانا عبدالقدیر صدیقی کے انتقال کے بعد میں وہاں جانے لگی۔ صرف خواتین کی مجلس ہوتی۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ میں میک اپ سے ہمیشہ دور ہی رہتی ہوں۔ کچھ طبیعت کا تقاضا بھی ہے۔ کسی دن میں درس میں جانے کی تیاری کرتی تو امی میرے کمرے میں آکر کہتیں ذرا پوڈر لگا لو۔ مجھے سمجھ میں آنے لگا کہ یہ تاکید کیوں کی جا رہی ہے۔ اس دن مجھے دیکھنے کے لئے وہاں کوئی خاتون آنے والی ہوتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن ایسا کچھ ہوتا میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ مجھے گھٹن سی ہوتی کہ کوئی مجھے پرکھ رہا ہے۔ میں اب سوچتی ہوں کہ توفیق صاحب حیدرآباد میں رہتے ہوئے کہاں چھپے بیٹھے تھے۔ بات پہلے ہی طئے ہو جاتی تو میرے چہرے پر پاؤڈر نہیں لگوایا جاتا ویسے بھی رنگ خاصا کھلتا ہوا ہی تھا!

یہ وہ دور تھا جب کہ لڑکیاں اپنے پیام وغیرہ کے بارے میں نہ گفتگو کرتی تھیں نہ زیادہ معلومات رکھتی تھیں کہ کہاں رشتے کی بات ہو رہی ہے ہو سکتا ہے کہ تمام گھرانوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ بہر حال میرے رشتے کی بات اسی طرح چلتی رہی۔ ایک یا دو دفعہ گھر پر بھی یہ تماشا ہوا۔ گھر کے بڑے کمرے میں قالین بچھایا گیا۔ شاید دو تین خواتین ہی آئی تھیں۔ سنا کہ انھوں نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ میرے والد نے پروفیسر عبدالحفیظ قتیل سے درخواست کی کہ لڑکے کے بارے میں دریافت کریں۔ جیسا کہ میں نے تفصیل سے لکھا ہے قتیل صاحب میرے استاد اور پیر بھائی بھی تھے۔ کئی اہم فیصلوں اور دوسری کئی باتوں میں میرے خالو

ڈاکٹر محمد یوسف مرزا اور قتیل صاحب کا مشورہ ضروری تھا۔ قتیل صاحب نے معلومات حاصل کیں انھوں نے والد کو بتایا کہ لڑکا تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور چڑچڑا، بدمزاج ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بال بال بچالیا۔ ایک اور پیام کا ذکر کروں گی۔ صرف دو خواتین آئی تھیں۔ لڑکے کی بہن اور والدہ، انھوں نے بھی شاید پسند کرلیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے رشتہ جما نہیں۔ جوڑے تو اللہ تعالیٰ بناتا ہے۔ یہاں کیسے طئے ہوتا۔ بہرحال بعد میں کسی نے کہا کہ لڑکے کی بہن کو بہت افسوس ہوا۔ دن بھر اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ قالین بچھا اور اٹھ گیا! میری والدہ ہندوستان سے باہر نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔

میری اسکول کی ساتھی بشیر بانو ہیں۔ ایک دن بشیر نے بے تکلفی سے پوچھا شریک زندگی کے لیے تمہارا آئیڈیل کیا ہے؟ اس سوال پر بس میں نے اتنا ہی کہا تھا جو میرا دل نہ دکھائے۔ اس سے آگے میں نے کچھ نہیں کہا اور نہ بشیر نے۔ کچھ عرصہ بعد باتوں میں بشیر نے کہا میرے ایک خالہ زاد بھائی ہیں توفیق۔ خوب رو بھی ہیں اور نیک سیرت بھی۔ انہوں نے اپنے اس بھائی کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اپنی خواہش ظاہر کی کہ ان کے بھائی کی شادی مجھ سے ہو جائے تو اچھا ہے۔

بشیر جانتی تھیں کہ میں بے حد حساس' خوددار اور خاموش طبیعت رکھتی ہوں۔ ظاہر ہے بات راست نہیں ہوسکتی تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس معاملے میں گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ ہم تینوں بہنوں کی فطرت ایسی ہی تھی...... بشیر نے ایک کاغذ پر اپنے بھائی کی ملازمت والد کا نام اور افراد خاندان کے نام لکھ کر فوٹو کے ساتھ میرے والد کے پاس بھیج دیا ......لڑکے کی سیرت کے بارے میں شاید دریافت اس لیے نہیں کرنا تھا کہ بشیر پر سب کو بھروسہ تھا۔ وہ میرا نقصان نہیں کرسکتی تھیں۔ اسی دوران میری ایک تصویر لڑکے کے گھر بھیجی گئی۔ دن مقرر کر کے لڑکے کو گھر بلایا گیا۔ اس دن میرے خالو ڈاکٹر محمد یوسف مرزا، قتیل صاحب اور میرے خالہ زاد بہن بھائی آ گئے تھے۔ اس وقت تک میرے سگے بھائی بہنوں میں سے اکثر

کراچی جا چکے تھے۔ بہرحال لڑکے کو دیکھ کر سبھوں نے پسند کیا۔ میں اپنے کمرے میں بند تھی۔ دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ میرا ایک خالہ زاد بھائی عارف بہت شریر تھا، وہ مجھے تنگ کرنے لگا دیکھئے ...... بہت خوبصورت ہیں۔ بہنوں نے کہا رنگ تو اتنا گورا ہے کہ بس کہا نہیں جا سکتا۔ پاؤں کا رنگ تو اور بھی اچھا ہے۔ روشن دان سے زبردستی مجھے دیکھنے کے لئے عارف اصرار کرنے لگا۔ شاید ہی کچھ جھلک نظر آئی ہوگی۔ فاصلہ بہت تھا مختصر یہ کہ سب کو لڑکا پسند آیا بات طئے ہوگئی ...... جوڑے وغیرہ کی کوئی مانگ نہیں کی گئی۔ نہ ہی کسی اور چیز کی ...... اُس وقت میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہی تھی۔ قتیل صاحب کے گھر جانا ہوتا تھا۔ رشتہ طئے ہونے پر قتیل صاحب نے سراج آپا (بیگم حفیظ قتیل) سے کہا بی بی! اس کا دولھا بہت اچھا ہے خاندان میں پیار ہے۔ شادی، رشتے کے ذکر پر مجھے ایک دم رونا آ گیا۔ اس لڑکے سے میرے والدین نے رشتہ طئے کر دیا۔ قتیل صاحب، سراج آپا اور میرے خالو ڈاکٹر محمد یوسف مرزا سے مشورہ کے بعد بات پکی ہوگئی۔ سب سے زیادہ بھروسہ بشیر پر تھا کیونکہ وہ مجھے بے حد چاہتی تھیں۔ میری بے تکلف، ہمدرد دوست تھیں۔ سب کو اطمینان تھا۔ اس لڑکے کا پورا نام سید رحیم الدین، عرفیت توفیق، بہت اچھا گھرانہ ہے۔

جیسے ہی رشتے کی بات عام ہوئی، حاسد ہوشیار ہوگئے۔ یہ کوئی اور نہیں، توفیق صاحب کے قریبی رشتے کے چچا تھے۔ چچاؤں کی دشمنی تو مشہور ہی ہے۔ ان کے چچا نے بھی رشتہ توڑنے میں ایڑھی چوٹی کا زور لگایا۔ یہ ساری باتیں مجھ تک نہیں پہنچتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے والدین اس سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔ توفیق صاحب کے کردار پر کیچڑ اچھالی گئی۔ تہمت لگائی کہ لڑکا پکچرس میں کام کرتا ہے، بیوی کو بھی لیجائے گا۔ سنا کہ اس نیک چچا نے یہاں تک کہہ دیا کہ شادی کی تاریخ وہی رہنے دی جائے۔ توفیق صاحب کے بجائے ان کے لڑکے سے شادی کی جائے۔ بہرحال ان ساری مخالفتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حاسد اپنی لڑائی ہار گئے۔

لین دین، جوڑے کی رقم، رسومات ان کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے

گھرانے میں جوڑے کی رقم معیوب سی بات ہے۔ اتفاق سے ان لوگوں نے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا...... میرے والدین نے اپنی حیثیت، اپنی مرضی سے جو دینا تھا دے دیا...... جہیز کے علاوہ، سلیقہ مندی کی کافی تعریف کی گئی...... شادی کو روکنے کی کوشش، جیسا کہ میں نے کہا ہے بیکار گئی لیکن آخر وقت تک ان دشمنوں نے پریشان کیا۔ ہمارا گھر کافی کشادہ تھا اس لئے سانچق اور شادی کی رسومات گھر ہی میں انجام پائیں۔ سانچق کے لئے خواتین آچکی تھیں۔ مجھے پھول پہنائے جا رہے تھے۔ یکا یک خواتین میں بے چینی، ہلچل شروع ہوئی۔ سب نے کھانسنا شروع کیا۔ چھینکیں آنے لگیں۔ پتہ چلا کہ کسی خاتون نے کوئی پاوڈر چھڑک دیا تھا جس کی دھانس سے سب کی طبیعت خراب ہو رہی تھی...... یہ کسی مخالف کی کارستانی تھی۔ جو کسی طرح یہ چاہتے تھے کہ تقریب میں بدمزگی پیدا کی جائے۔

۱۱/اکتوبر ۱۹۶۳ء میری شادی سید رحیم الدین توفیق ولد سید یوسف الدین صاحب سے ہوئی۔ توفیق صاحب اس وقت لیک ویو گسٹ ہاوز میں تھے۔ تنخواہ کم تھی اس لئے انھوں نے اس ملازمت کو چھوڑ کر آئی ڈی پی ایل میں ملازمت شروع کی۔ یہاں کیر ٹیکر تھے۔ گیسٹ ہاوز کی ساری ذمہ داری انھیں پر تھی۔ بعد میں گیسٹ ہاوز منیجر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

:Love Marriage

شادی کے کچھ دنوں بعد مجھ تک یہ بات پہنچی کہ میں نے Love Marraige کی ہے۔ یہ خیال میرے چند قریبی رشتہ داروں کا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ افواہ کیسے پھیلائی گئی، کسی کی کارستانی ہے یا کس قسم کی غلط فہمی ہے۔ بہر حال مجھے صفائی پیش کرنی نہیں تھی۔ لیکن جب اپنی سرگذشت لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہی ہے تو کیوں نہ کچھ جملے اُن لوگوں تک پہنچا دوں۔ کیونکہ اب مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ دوستوں سے، رشتہ داروں سے، ابھی کہہ دینا ہے۔ آئندہ وقت ملے نہ ملے یہ کہہ نہیں سکتی۔ دو چار مواقع ایسے آئیں گے جہاں میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر

کہوں گی کہ یہ کام میں نے نہیں کیا یہاں بات محبت کی ہے۔ میں نے محبت ضرور کی ہے۔ اپنے ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے، بچوں سے، اپنے وطن ہندوستان سے۔ توفیق صاحب سے بھی محبت کی ہے، بے انتہا، لیکن شادی کے بعد!!۔ بات قسم کی ہو رہی ہے۔ تو...... میں یہاں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ شادی سے قبل میں نے نہ توفیق صاحب سے کبھی بات کی نہ ملاقات، نہ خط و کتابت، تو پھر یہ محبت کی شادی کیسے ہوگئی۔ مجھ پر دل و جان سے فدا، چند مہربان رشتہ داروں کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنی غلط فہمی کو دور کریں تہمت لگانے سے باز رہیں۔ ویسے بھی سارا زمانہ جانتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ کسی کے اصرار پر بھی نہیں۔ یہ میری فطرت ہے۔

○○○

اولاد

صحت منداولاد اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دین ہے۔اس تعلق سے اللہ کا جتنا شکر بجالایا جائے کم ہی ہے۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے صحت منداولاد عطا فرمائی۔ ورنہ بعض گھرانوں میں دیکھا کہ پیدائشی معذور بچہ ہے جس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ ماں باپ تن من دھن سے اس کی خدمت میں لگے ہیں۔ایک آس ہے،امید ہے کہ ٹھیک ہوجائے گا۔ کہیں دیکھا کہ بچے کو مسلسل دورہ پڑتا ہے۔ ہزاروں خرچ کرر ہے ہیں لیکن فائدہ کچھ نہیں۔ ذہنی تناؤ ایسا کہ گھر کاٹ کھانے کو آتا ہے۔ ماں باپ کی بے بسی اور مجبوری دیکھی نہیں جاتی۔قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔انسان کو وہ ہر طرح سے آزماتا ہے۔

میرے دو بچے ہیں لڑکی عفت انساء اور لڑکا سید فہیم الدین، دونوں بچے اللہ کے فضل وکرم سے انتہائی سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں، اطاعت گزار ہیں۔عفت کی ابتدائی تعلیم آئی ڈی پی ایل کالونی کے اسکول میں ہوئی۔ پانچویں جماعت سے جماعت دسویں تک Keys high school میں تعلیم پائی۔انٹرمیڈیٹ کے لئے St. Anns College میں داخلہ لیا۔لیکن تعلیم مکمل نہ ہونے پائی ۱۹۸۴ء میں شادی ہوگئی۔ پیدائش کے وقت عفت کا رنگ انتہائی سرخ وسفید تھا۔سب کی چہیتی تھی۔میری خالہ محترمہ بدرالنساء جو مجھے بے انتہا چاہتی ہیں انھوں نے مجھے اپنے گھر بلالیا تھا۔ خالہ صاحبہ اور خالو جان دونوں عفت کو عزیز رکھتے تھے۔ میرے خالہ زاد بھائی بہنوں کے لئے تو وہ کھلونا تھی۔ خالو جان اُس وقت گاندھی ہاسپٹل سکندرآباد میں آر ایم او تھے۔ رہائشی گھر بہت بڑا تھا۔عفت کی ابتدائی عمر کا کافی حصہ یہیں گزرا۔ مجھے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کرنی تھی۔ ٹائپ کے مراحل باقی تھے۔ سکندرآباد ہی کے گھر میں ٹائپسٹ آجاتے اور وہیں پروف ریڈنگ کرلیتی۔عفت کو سنبھالنے،

دیکھ بھال کرنے کے لئے سبھی بہنیں تھیں۔ خصوصاً فرحت اُسے بہت چاہتی تھیں۔ میں بے فکری سے اپنی پڑھائی میں مشغول رہتی۔

عفت کی پیدائش کے وقت امی پاکستان سے آگئی تھیں۔ وہ بھی اسے بہت چاہتی تھیں۔ اس کے لئے فراک، ٹوپیاں وغیرہ گھر ہی میں سیتی تھیں۔ وہ انیس دن کی تھی کہ امی پاکستان واپس ہوئیں۔ ان کے ساتھ میں اور عفت بھی گئے ہم نے یہ سفر پانی کے جہاز سے طئے کیا۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ پاکستان کا یہ سفر یادگار سفر ہے۔ والدین بہن بھائی، بھاوجیں، بہنوئی سبھوں نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ عفت کو دیکھ کر تو سبھی پھولے نہ سمائے۔ سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ڈھیر سارے کھلونے، کپڑے اور زیور اُسے تحفے میں ملے۔ کبھی بازار جانا ہوتا تو میں اسے اپنی چھوٹی بہن نور جہاں کے پاس چھوڑ کر جاتی۔ بڑی بہن زہرہ ساتھ ہوتیں۔ نور جہاں سے لاگو تھی۔ بے فکری سے اُسے چھوڑ کر چلی جاتی۔ نور جہاں میرے ساتھ جانے کے لئے بے چین تھی۔ ایک دن اسے امی کے پاس چھوڑ کر ہم چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر میں رو رو کر بُرا حال کرلیا۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی پریشان ہوکر میرے بھائی صلاح الدین اُسے کار میں لے کر ہمیں ڈھونڈنے نکلے۔ کافی دیر بعد ہم لوگوں سے ملاقات ہوئی اور عفت کو ہمیں سونپ کر اطمینان کا سانس لیا۔

عفت نے بہت جلد باتیں کرنی سیکھ لی تھیں۔ زبان بھی صاف تھی۔ بہت دلچسپ باتیں کرتی۔۔ ہمارا وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ میری ساس اور نند یعنی عفت کی دادی اور پھوپی بھی اُسے بہت چاہتی تھیں۔ دادی کے ہاتھ کی خوبصورت فراکیں اس نے بہت پہنیں۔ چھوٹی سی تھی تبھی سے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ نئی فراک آتے ہی پہن لیتی اور خوش ہوتی۔ کپڑوں اور کھلونوں کا شوق ہم اپنی استطاعت کے مطابق پورا کرتے۔ کبھی اسے ترسایا نہیں۔

میں نے اپنے کئی مضامین میں جوڑے کی رقم اور جہیز کے مطالبے جیسے اہم موضوعات پر کھل کر لکھا ہے۔ سنجیدگی سے مشورے بھی دیئے ہیں اور اکثر دفعہ طنز و مزاح کے پیرایے میں

لالچی خواتین کو سدھارنے کی کوشش بھی کی ہے۔عفت کے لئے افتخار کا پیام آیا تو سب سے پہلے میرے ذہن میں جوڑے کی رقم اور جہیز کے مطالبے کی بات آئی۔ہوایوں کہ افتخار کی پھوپی زاد بہن اسما اور میری خالہ زاد بہن افروز دونوں دوست ہیں۔اسما نے عفت کی تصویر دیکھی اور افتخار کے والدین سے ذکر کرنے کے بعد دونوں میرے گھر رشتہ کی بات کرنے آئے۔میں نے افروز کو علٰحدہ بلا کر پوچھا کہ پہلے demands کے بارے میں مجھے معلومات چاہئیں۔اسما نے بتایا کہ وہ لوگ کوئی مطالبہ نہیں کریں گے۔صرف سادات گھرانے کی اچھی لڑکی اور اچھا خاندان چاہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ افتخار کی والدہ ایک سال سے لڑکی کی تلاش میں ہیں۔بہر حال افتخار کو جدہ واپس ہونے میں دو دن باقی تھے۔مقررہ وقت پر افتخار کے والدین جناب فخر الدین احمد صاحب اور اختر سلطانہ صاحبہ افتخار کو لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ہم نے افتخار کو دیکھا۔بغیر کسی تحقیق کے جی کو لگا کہ بچہ شریف ہے۔ان لوگوں نے بھی عفت کو دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔میں اور توفیق صاحب رسومات کے بالکل قائل نہیں لیکن ہونے والی سمدھن کی خواہش پر رسم کر دیا گیا۔اس دن ہمیں پتہ چلا کہ پروفیسر یوسف سرمست، اور جناب اقبال متین افتخار کے قریبی رشتہ کے ماموں ہیں۔منگنی کی سادہ سی تقریب میں یہ دونوں حضرات شریک تھے۔ان حضرات کو بہ حیثیت پروفیسر اردو اور بہ حیثیت مشہور افسانہ نگار ہم جانتے تھے۔اور یہ لوگ بھی ہم سے واقف تھے۔بعد میں سبھی لوگوں نے افتخار کے گھرانے کی تعریف کی۔

۶ رجولائی ۱۹۸۴ء کو عفت کی شادی جناب فخر الدین احمد صاحب کے لڑکے سید افتخار الدین سے ہوئی۔جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں ہم لوگ جہیز، لین دین اور جوڑے کی رقم کے مطالبات کے خلاف ہیں۔اللہ کے فضل و کرم سے یہ طریقہ میرے والدین کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ہماری شادی بھی بغیر مطالبات کے ہوئی۔افتخار کے والد نے جو بہت ہی سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں انھوں نے بتایا کہ وہ جوڑے کی رقم کے نام پر ایک پیسہ بھی نہیں لیں

گئے ۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے میں خوشی محسوس کرتی ہوں کہ عفت کی شادی ہوئے ماشاء اللہ ۱۸ سال ہو چکے ہیں ۔ دونوں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ جوڑے کی رقم نہ بھی مانگیں تو کچھ تو دینا چاہئے۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اپنی بچی کو کپڑے زیور اور کچھ فرنیچر دیا۔

اللہ نظر بد سے بچائے ، افتخار انتہائی نیک اور فرماں بردار لڑکا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچوں سب کو چاہنے والا، بڑوں کا ادب کرنے والا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر کسی سے خلوص سے ملنے والا۔ ایسے لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ عرب سرکل جدہ میں بہ حیثیت آرٹ ڈائرکٹر (۲۰) سال جانفشانی سے کام کرنے کے بعد وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے ہیں ۔ عفت افتخار کی تین لڑکیاں ہیں۔ سارہ، حمیرا اور عائشہ۔ ماشاء اللہ تینوں بڑی پیاری ہیں ۔ ذہین اور خوددار طبیعت کی مالک ہیں۔ خاندان میں ہر کسی سے خلوص سے ملتی ہیں۔ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ وہ بھی میرا ہر طرح خیال رکھتی ہیں۔ تینوں کو پکوان سیکھنے کا شوق ہے۔ فرصت کے اوقات میں ترکیب پوچھتی ہیں اور میرے ساتھ خود بھی باورچی خانے میں آکر کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ سارہ کو بچپن سے ہی ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی جستجو رہی۔ نتیجہ یہ کہ وہ یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی اور مقابل والا جواب دیتے دیتے تھک جاتا۔ حمیرا کی مرغوب غذا گوشت تھی۔ روٹی چاول کم اور گوشت زیادہ کھاتی تھی۔ اب غذا میں اعتدال ہے۔ سب کی غذا کم ہے۔ عائشہ میٹھے کی دیوانی ہے۔ گلاب جامن مرغوب مٹھائی ہے۔ میرے پاس آتے ہی پوچھ لیتی ہے میدہ ہے؟ کھوا ہے؟ شکر ہے؟۔ پھر فرمائش کر کے بنوا لیتی ہے۔ تیار ہوتے ہی سب کی پروا کئے بغیر آٹھ دس ہضم کر جاتی ہے۔ بچپن میں تینوں بڑی حاضر جواب تھیں۔ بہت سی باتیں ہیں جو دلچسپ ہیں۔ بعض دفعہ معصومیت بھی بھلی لگتی ہے۔ عائشہ چھوٹی سی تھی۔ میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا دیکھو بیٹے! میں جب اوپر چلی جاؤں گی تو میری کتابوں کا خیال رکھنا۔ کسی کو گھر لے جانے نہیں دینا۔

حفاظت کرنا۔تھوڑی دیر بعد سنجیدگی سے کہنے لگی ۔ میں آپ کی سب کتابوں کو اچھا رکھوں گی ۔ کسی کو نہیں دیوں گی ۔ نانی ماں!..........آپ اُپر کب جارئیں؟

تینوں بچیاں پڑھائی کے ساتھ پکوان میں بھی دلچسپی لیتی ہیں ۔ چائے کے ساتھ استعمال کی جانے والی بہت سی لذیذ چیزیں بنانی سیکھ لی ہیں ۔ میں جو بھی پکوان کرتی ہوں شوقیہ وہ بھی مدد کرتی ہیں پڈنگ ،نمک پارے ،شکر پارے ،پوریاں ،پاپ کارن ،رواد وشہ آلو بھجیے اورایسی کئی چیزیں ہیں جو منٹوں میں تیار ہوتی ہیں ۔ یہ تمام چیزیں دونوں بنالیتی ہیں ۔عائشہ ابھی سات سال کی ہے لیکن وہ بھی چولھے کے پاس آتی ہے ۔کبھی کاغذ قلم لے کر پڈنگ ،گلاب جامن وغیرہ کی ترکیب نوٹ کرلیتی ہے ۔پکانے سے زیادہ یہ میٹھے کھانے کی شوقین ہے ۔

عفت کے بارے میں مختصراً اتنا بتادوں کہ ماشاللہ بہت ہی لذیذ پکوان کرتی ہے ۔ بریانی ،دم کا مرغ ،دم کا گوشت اس میں تو وہ ماہر ہوگئی ہے ۔بعض میٹھے ایسے ہیں جن کے پکانے میں اس کی برابری میں بھی نہیں کرسکتی ۔ جوزی حلوہ ،گاجر کا حلوہ بہترین بناتی ہے ۔کدو کی کھیر اور دوسرے میٹھے بنانے میں بھی مہارت رکھتی ہے ۔

افتخار کے ماشاءاللہ گیارہ بھائی بہن ہیں ۔ چار بھائی سات بہنیں ۔ وہ سب سے خلوص محبت رکھتے ہیں ۔ یہ سب بہن بھائی ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں برابر کے شریک ہیں ۔چھوٹی موٹی تقاریب ،عیدین کے مواقع پر سب ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے ۔افتخار نے ہمیشہ اپنے والدین کا خیال رکھا ۔انھیں کی دعاؤں سے اللہ انھیں نواز رہا ہے ۔

افتخار نے بہت ہی سادہ طبیعت پائی ہے ۔شوخی اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ بیوی بچوں پر جان چھڑکتے ہیں ۔ جدہ میں رہ کر برسوں محنت کی ہے محض اسی لئے کہ گھر میں خوشحالی رہے ۔ میری دعا ہے کہ یہ بچے پرسکون ،خوشحال اور نیک نامی کی زندگی بسر کریں ۔ آپس میں پیار محبت یوں ہی قائم رہے ۔آمین ۔

فہیم کی پیدائش شانتا بائی نرسنگ ہوم میں ہوئی۔ ماشاء اللہ بہت پیارا اور صحت مند تھا۔ رنگ گورا، بڑی بڑی آنکھیں۔ ہر کوئی چاہتا تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت خالو جان عثمانیہ دواخانہ کے آر ایم او تھے۔ دواخانے کے احاطے میں بہت بڑا گھر تھا۔ میری خالہ صاحبہ اور خالہ زاد بھائی بہن سبھی یہ چاہتے تھے کہ فہیم کو اپنے پاس رکھیں اُس سے کھیلیں۔ دونوں بچوں کو میرے بہن بھائی کئی کئی دن رکھ لیا کرتے۔ اسکول میں شریک ہونے کے بعد چھٹیوں میں بلا لیا کرتے۔ میں اور توفیق صاحب اسے بے حد چاہتے تھے۔ ذرا طبیعت خراب ہو جاتی تو توفیق صاحب اسے گود میں لے کر ٹہلنے لگتے۔ فکر مند ہو جاتے۔ بچپن ہی سے بہت حساس طبیعت پائی۔ کسی غلط بات کو برداشت نہیں کرتا۔ بے حد ذہین ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول میں جو بھی پڑھایا جاتا اسے ازبر ہو جاتا۔ ہم فکر مند رہتے کہ یہ کب سبق یاد کرے گا لیکن اللہ کے فضل سے ہمیشہ اچھے درجے سے کامیاب ہوتا۔ اسکول سے لے کر کالج تک کی تعلیم مکمل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہمیں کسی قسم کی فکر نہیں رہی کیوں کہ اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔

فہیم کی ابتدائی تعلیم آئی ڈی پی ایل ہی کے اسکول میں ہوئی۔ توفیق صاحب گیسٹ ہاؤز منیجر کے عہدہ پر فائض تھے اس لئے گیسٹ ہاوز سے قریب ہی ہمارا گھر تھا۔ دسویں جماعت تک فہیم نے وہیں تعلیم مکمل کی۔ بی کام کے بعد ۱۹۸۷ء میں کارپوریٹ سکریٹری شپ اور ۱۹۹۰ء میں پونے یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ آج کل وہ دوبئی کی ایک مشہور کمپنی میں پراڈکٹ منیجر ہے۔ فہیم انتہائی ملنسار، نیک اور فرض شناس ہے۔ اس کے کچھ اصول ہیں۔ غلط بات اور جھوٹ کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ بات کی تہہ تک پہنچ کر ہی اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ صاف گو ہے ملازمت میں ذمہ داری کا خاص خیال رکھتا ہے۔ متعلقہ افراد کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ہوتا۔ ہم دونوں کا اس نے ہمیشہ خیال رکھا۔ توفیق صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوتی تو ان کی صحت کے بارے میں فکر مند رہتا۔ وہ جب بھی بات کرتے اس کی ترقی کے متعلق پوچھ لیتے۔ ملازمت کی وجہ سے وہ دور ہے لیکن توفیق صاحب کے انتقال کے بعد

میرے لئے زیادہ فکر مند رہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ دین اور دنیا میں سرخ رو رہے۔

توفیق صاحب کی طبیعت خراب ہونے پر انھیں شریک دواخانہ کیا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ فہیم پریشان نہ ہو میں نے اطلاع دے دی کہ دواخانے میں ہیں اور طبیعت سنبھل گئی ہے۔ دو دن بعد اچانک طبیعت بگڑنے پر میں نے پریشانی کے عالم میں آنے کے لئے کہہ دیا۔ اسی دن رات بارہ بجے اپنی بیوی آمنہ اور بیٹی صدیعہ کے ساتھ ایرپورٹ سے سیدھے دواخانے آ گیا۔ توفیق صاحب ان سب کے منتظر تھے۔ صبح سے مسلسل پوچھ رہے تھے۔ اپنے بابا کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اب صرف دو دن بابا کو دیکھ سکوں گا۔ ماں باپ کا سایہ بچوں کے لئے بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ ان کے گزرنے پر بچے بکھر جاتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں خود اس دور سے گزر چکی ہوں۔ آمنہ اور صدیعہ بھی بے حد ملول تھے۔ توفیق صاحب انھیں بہت چاہتے تھے۔ یہ بچے بھی اسی طرح انھیں چاہتے اور عزت کرتے تھے۔

بہو پسند کرنے یا ڈھونڈنے کے لئے میں نے عام ساسوں کا طریقہ نہیں اپنایا۔ یعنی وہی روز ایک گھر جا کر لڑکی دیکھنا، خامیاں نکالنا اور پھر خوب کھا پی کر نکل جانا۔ لڑکی کو دیکھنے کا یہ طریقہ نازیبا ہے۔ لیکن چل رہا ہے۔ زوروں پر چل رہا ہے۔ آمنہ صرف تین سال کی تھی جب توفیق صاحب اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے اپنی بہو بنائیں گے۔ آمنہ کے والدین فرحت اور امام الدین اظہر اس وقت جدہ منتقل ہوئے تھے روزگار کے سلسلہ میں۔ یہ میرے خالہ زاد بہن اور بہنوئی ہیں۔ یعنی آمنہ میری بھانجی۔ میں نے اظہر کو ایک خط لکھا تھا جس میں ان لوگوں کی رضامندی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اظہر نے اس کے جواب میں بہت ہی تفصیلی خط لکھا تھا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے سوچنے سے پہلے ہی آپ نے فکر دور کر دی۔ بہر حال وقت گزرتا گیا۔ فہیم سن شعور کو پہنچے تو ہم نے ذکر کیا۔ اُدھر آمنہ سے بھی رضامندی لی گئی۔ فرحت اظہر فہیم کو بہت چاہتے تھے کیوں کہ بچپن ہی سے ان کی گود میں پلا بڑھا۔ خصوصاً فرحت

کی تو وہ جان تھا۔ بس سب کے ذہن بن گئے۔ عفت افتخار اس رشتہ سے بہت خوش تھے۔ عفت نے کئی سال پہلے پاکستان میں ایک ٹیکہ خرید اتھا۔ شرارہ سوٹ کا بھاری کمخواب کا کپڑا بھی تھا۔ عفت افتخار میں اور توفیق صاحب خوشی خوشی آمنہ کے لئے ٹیکہ اور کپڑے لے کر چلے گئے۔ کسی کو دعوت دئے بغیر۔ میں کہہ چکی ہوں کہ ہم لوگ شروع ہی سے رسومات پر بے دریغ خرچ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ خاندان کے سبھی لوگ اس رشتے سے خوش تھے۔ فہیم کے دوبئی سے آنے پر ۱۸ر جولائی ۱۹۹۶ء کو دونوں کی شادی ہوئی۔ ہم نے یہ شادی کسی قسم کے مطالبات کے بغیر کی۔ جوڑے کی رقم، زیور اور جہیز کی فہرست، کار کی سجاوٹ اور دیگر فضولیات سے اجتناب کیا۔ ہمیں تو تعجب ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح جوڑے کی رقم کی بات طئے کرتے ہیں پھر باقاعدہ دن تاریخ مقرر کر کے بغیر کسی جھجک کے بھری محفل میں یہ رقم لیتے بھی ہیں۔ تف ہے ایسے لوگوں پر! فہیم کی شادی ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ دونوں اپنی پیاری سی بیٹی صحیفہ اور لختِ جگر فیصل کے ساتھ دوبئی میں مقیم ہیں۔ صحیفہ سب کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور! اور فیصل، ماشاء اللہ سب کے لیے کھلونا۔

ایک پروفیسر بڑی پتے کی بات کہتے تھے ان کی بیٹی ساس کے طعنوں کا شکار بنی تھی۔ ساس نے تو مجھے بہت جلایا ہے رلایا ہے دوسروں کی مثال کیا دوں۔ وہ کہتے تھے کہ عورت کے اندر سے ساس نکلتی ہے۔ لیکن میں ..... میں عورت ہی رہی۔ آمنہ مجھے بے حد عزیز ہے وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ عزت کرتی ہے۔ میری فطرت میں ہی نہیں کہ عام ساسوں جیسا سلوک کروں۔ اسے پوری آزادی ہے جہاں چاہے رہے۔ میں کسی معاملے میں بے جا دخل اندازی نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ بہو بیٹا خوش رہیں سکون سے رہیں۔ جھوٹی شکایتیں، لگائی بجھائی جو عام گھروں میں یا ٹی وی سیریلس میں ہوتی ہے وہ میرا شعار نہیں۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ کسی کا اچھا دیکھ نہیں سکتی۔ چند حاسدوں نے اس کے دل میں یہ بات بٹھانی چاہی کہ اس کی ساس اسے نہیں چاہتی۔ میں ایسے بغلی دشمنوں کو صفائی تو نہیں دوں گی۔ البتہ اتنا ضرور کہوں

گی کہ ایسے لوگ عاقبت کا توشہ تیار کررہے ہیں ۔ جھوٹ ، بہتان انھیں مہنگا پڑے گا ۔ آمنہ نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے ۔ ماشاءاللہ' سلیقہ منداور محنتی ہیں ۔ گھر' شوہراور بچی کی اچھی دیکھ بھال کرتی ہیں ۔ پکانے میں مہارت ہے ۔ بریانی ، چکن 65 ،قوبانی کا میٹھا، حلوے اور دوسری کئی لذیذ چیزیں کم وقت میں تیار کرلیتی ہیں ۔

صنیعہ کی عمراس وقت ساڑھے چار سال ہے ۔ اللہ نظر بد سے بچائے ۔ بہت ہی سمجھدار ذہین اور حاضر جواب ہے ۔ باتیں ماشاءاللہ بہت اچھی کرتی ہے ۔ توفیق صاحب اُسے بہت چاہتے تھے ۔ اُسے پتہ تھا کہ اس کے دادا اس پر جان نثار کرتے ہیں ۔ بہت جلد اس نے باتیں کرنی شروع کیں ۔ سب سے پہلے دادو کہنا آ گیا ۔ اپنی پیاری سی زبان اور لہجے میں راگ کھینچ کرانھیں پکارا کرتی 'دا...... دو ۔ وہ بیٹھے ہوتے تو سامنے اچک اچک کرکھیلتی ۔ اُسے اندازہ تھا کہ اُسے چاہنے والے دادا اُسے پوری توجہ سے دیکھ رہے ہیں ۔ کبھی اُسے ستاتے بھی تو فوراً اس کا جواب تیار ہوتا ۔ صنیعہ میں خاص بات یہ ہے کہ وہ جب میرے پاس ہوتی ہے تو کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتی ۔ وہ چاہتی ہے کہ بس صرف دادی کے ساتھ ہو ۔ ایک دفعہ ہمارے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی کھیل رہی تھی ۔ کاغذ' کلر پنسل بکھرے ہوئے' رنگ بھرنے اور باتوں میں مشغول ۔ توفیق صاحب بھی اس کے برابر بیٹھے ہوئے تھے ۔ کچھ دیر بعد اُچک کر میری گود میں چڑھ گئی ۔ کہنے لگی دادی چلئے اپن دوسرے کمرے میں جائیں گے ۔ جب تک دادو یاں کھیل لیتے ۔ اس میں دادو سے والہانہ محبت چھپی ہوتی ۔ آمنہ ساتھ بیٹھ جائیں تو کہتی مماں آپ جایئے آپ کو کپڑے سینا ہے نا! بہرحال اس کی چاہت انوکھی ہے ۔ لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہے ۔ توفیق صاحب کا انتقال ہوا تو صنیعہ بہت روئی ۔ روکر کہتی تھی دادی! اللہ میاں سے بولئے میرے دادو کو واپس کردیں اور جب مجھے روتا دیکھتی تو پہلے تو سمجھاتی پھر کہتی دیکھئے دادی! آپ روئے تو اللہ میاں آپ کو بھی بلا لیتے ۔ میں سوچنے لگتی کاش ایسا ہوتا ۔

صنیعہ آج کل اپنے والدین کے ساتھ دوبئی میں ہے ۔ جب بھی حیدرآباد آتی ہے

میرے ساتھ بیٹھ کر کھیلتی ہے۔ کچھ برتن تیچے دے دوں تو بس پکوان شروع ہو جاتا ہے۔ صدیعہ اور اس کی دادی دنیا سے بے خبر دو دو گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔ باورچی خانے میں آکر وہ مختلف چیزوں کی فرمائش کرتی ہے۔ میں اُسے دیتی چلی جاتی ہوں۔ آٹا' چاول' دالیں' شکر' چائے کی پتی' بارن ویٹا' ہلدی' نمک۔ اس کے بعد مرچ کے ڈبے پر نظر پڑتی ہے۔ میں سمجھاتی ہوں کہ مرچ سے آنکھیں جلیں گی تو معصومیت سے کہتی ہے میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ اب دے دیجئے۔ بہرحال مرچ کو چھوڑ کر ساری چیزیں اچھی طرح ملا کر کیک بناتی ہے۔ کیک بن کر تیار ہو یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد سنجیدگی سے کھلانے کی جو کوشش ہوتی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل میرے بھائی ظہیر کینڈا سے آئے ہوئے تھے۔ اس کا پکوان وہ بھی دیکھ رہے تھے۔ از راہ مذاق کہنے لگے۔ صدیعہ! بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کب تک ٹھہروں؟ اس نے ظہیر نانا کو کچھ دیر انتظار کرنے کے لئے کہا اس کے بعد چھوٹی سی کٹوری میں کیک رکھ کر دیا کہ اب کھا لیجئے۔ یہ سچ مچ کھانا تھا۔ مسلسل تک رہی تھی کہ کسی طرح چمچہ منہ میں جائے۔ ظہیر نے بڑی مشکل سے اس کا تیار کیا ہوا کیک میز کے نیچے چھپا دیا اور پھر کہہ دیا بہت مزیدار ہے۔ میری بنائی ہوئی چیزوں کو نہ صرف پسند کرتی ہے بلکہ بڑے لوگوں کی طرح بے ساختہ تعریف بھی کر دیتی ہے۔ ایک دن بریانی کھانے کے بعد کہنے لگی۔ دادی! بریانی بھوت مزے کی تھی۔ آپ بھوت اچھا پکائے۔ اب ٹیلی فون پر بات کرتی ہے۔ وہی لاڑ' وہی محبت بھری معصوم باتیں۔ یہ بچے مجھ سے بظاہر دور ہیں لیکن ان کی چاہت نے مجھے حوصلہ دے رکھا ہے۔ بات کر کے کافی سکون محسوس کرتی ہوں۔

○ ○ ○

میرے اپنے

میں نے ابتداء میں ذکر کیا ہے کہ ہم دس بھائی بہن ہیں۔ سات بھائی اور تین بہنیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، ماں باپ کی دعائیں ہیں کہ سبھوں نے حصول تعلیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنے اپنے شعبہ میں محنت کی، نام کمایا۔ حصولِ روزگار کے لئے ایک دوسرے سے دور ہیں۔ لیکن آپسی محبت برقرار ہے۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک، جھوٹ اور حسد کی لعنت سے پاک زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض خاندانوں میں، میں نے دیکھا ہے کہ روپیہ پیسہ اور جائیداد کی خاطر یا محض حسد کے جذبے سے مغلوب ہو کر اچھے خاصے خونی رشتوں میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے اور زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ یہاں یہ صراحت بھی کرتی چلوں کہ سب بھائی بہنوں نے امی پپا کا خاص طور سے خیال رکھا۔ ان کی ہر طرح خدمت کی۔ اطاعت گزار اور فرماں بردار رہے۔ ماں باپ کے مرتبے کا ذکر بار با حدیث میں آیا ہے۔ خصوصاً جب وہ ضعیف ہو جائیں انہیں اُف تک نہ کہو۔ اس پر عمل کرنا ہر اولاد کے لئے ضروری ہے۔ بہرحال ہم سب نے اپنے بزرگوں اور والدین کی دعائیں سمیٹیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اتنا نوازا کہ جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔

دور دراز ملکوں میں رہنے والے بھائی بہنوں سے میں نے کہا تھا کہ اپنے اور اپنے ارکان خاندان کے بارے میں لکھ بھیجیں انہیں جوں کا توں شائع کرنا چاہتی تھی۔ لیکن سبھوں نے تفصیل سے نہیں لکھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں ان کی مصروفیات کو دخل ہو۔ تصاویر کے بارے میں لکھنا یہ ہے کہ میرے بعض اراکین خاندان تصویر شائع نہیں کروانا چاہتے تھے۔ اس لیے بہو آمنہ اور ایک بھاوج کی تصاویر نہیں ہیں۔ کسی نے تساہل سے کام لیا۔ بہرحال مختصراً سہی، بھائی بہنوں اور بچوں کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے بے حد فخر محسوس ہو رہا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے‘ آمین۔

مرزا شمس الدین بیگ:

۱۹۳۰ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ حیدرآباد میں کچھ سال کام کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہوگیا۔ کراچی میں ۱۹۷۱ء تک گورنمنٹ سروس کرنے کے بعد کمپیوٹر ٹریننگ کے لئے فرینکفرٹ، جرمنی چلا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں فرینکفرٹ سے کراچی واپس آکر ملازمت کے سلسلے میں ریاض، سعودی عرب چلا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں ریاض سے واپس آکر کچھ سال کراچی میں کام کرنے کے بعد ۱۹۹۰ء میں ریٹائرڈ ہوگیا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ کئی برس والدین کے ساتھ رہ کر اُن کی خدمت کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔

مرزا بدرالدین بیگ:

۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں عثمانیہ یونی ورٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری اور ۱۹۵۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے MBBS کی ڈگری حاصل کی۔ حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹرس ڈاکٹر رام پرشاد اور ڈاکٹر فاروقی میرے گھر پر Combined Studies کے لئے آتے تھے۔ میرے والدین کی محنت اور دعاؤں کے سبب میں نے ایم بی بی ایس فائنل میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان منتقل ہوگیا۔ کراچی میں خانگی پریکٹس کے لئے دو جگہوں پر Clinics قائم کئے۔ تقریباً چالیس سال میڈیکل پریکٹس کے بعد ریٹائرڈ ہوگیا۔ بیوی شاہدہ اور لڑکے مرزا فصیح الدین بیگ کے ساتھ کراچی میں پرسکون زندگی گذار رہا ہوں۔

زہرہ ضیاء:

میں ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں گرلز ہائی اسکول نامپلی سے میٹرک کامیاب کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہوگئی۔ میری شادی ۱۹۶۰ء میں سید وزیر علی صاحب سے حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ چار سال

گورنمنٹ سروس کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں، میں نے کراچی میں ایک مانٹیسری اسکول قائم کیا تھا۔ جس کو حکومت نے ۱۹۷۳ء میں Nationalize کر لیا جس کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ اسکول قائم کرنے میں میرے والد نے بہت مدد کی تھی۔

میرے شوہر سید وزیر علی نے کراچی سے ICMA کیا تھا اور کچھ سال کراچی میں کام کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں نوکری کے سلسلے میں ہم سب لوگ ملیشیا منتقل ہو گئے۔ ملیشیا ایک بہت خوبصورت ملک ہے۔ حکومت ملیشیا کی طرف سے بہت بڑا اور خوبصورت مکان ملا تھا۔ بہت بڑی زمین پر واقع تھا۔ کبھی کبھی سانپ بھی گھر کے باہر نظر آتے تھے۔ ٹیلی فون کرتے ہی انہیں لے جانے کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اس کے ہم عادی ہو چکے تھے۔

میری تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی لڑکی ناصرہ شاہین نے کراچی سے ICMA کیا اور وہ اپنے شوہر ذکی احمد اور لڑکے زید کے ساتھ کراچی میں مقیم ہے۔ دوسری لڑکی طاہرہ جبیں نے Wow Medical Collge سے MBBS کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واشنگٹن سے Psychiatry میں Specialization کیا اور اب واشنگٹن میں ہی مقیم ہے۔ تیسری لڑکی سارہ بانو نے کراچی میں MBA کیا پھر کینیڈا میں CMA کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی شادی ڈاکٹر مرزا نصیر الدین سے ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔ سارہ اور نصیر اپنی بیٹی عائشہ کے ساتھ کینیڈا میں مقیم ہیں۔

۱۹۸۳ء میں ملیشیا سے واپس کراچی آ کر میرے شوہر ایک کمپنی کے Managing Director کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ تک کام کرتے رہے۔ اب میں اور وزیر علی صاحب کراچی ہی میں مقیم ہیں۔ ماں باپ کی دعاؤں سے ہم نے پرسکون، خوشحال زندگی گزاری، بچیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دین ہے۔

مرزا ظہیر الدین بیگ:

میری پیدائش ۱۴ر جولائی ۱۹۳۷ء کو حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں انجینیرنگ

کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے میں نے سیول انجینیر نگ میں بی ای کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۷ار فروری ۱۹۶۷ء کو حیدرآباد میں صفیہ سلطانہ دختر ڈاکٹر محمد یوسف مرزا (آر ایم او عثمانیہ ہاسپٹل) سے میری شادی ہوئی۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء کو کینڈا چلا گیا۔ یہ بھی میرے لئے ایک دلچسپ واقعہ رہا۔ ہمارے دس بھائی بہنوں میں' میں پہلا "قربانی کا بکرا" تھا جو" باہر" جا رہا تھا۔ مجھے کینڈا ایمگریشن والوں نے Kingston Ontario کا ویزا دیا تھا تو میرے چھوٹے بھائی صلاح الدین نے کینڈا کا نقشہ دیکھ کر مجھ سے کہا کہ تم Dam بنانے کے لئے بلا رہے ہوں گے۔ چونکہ Kingston کے قریب ایک بہت بڑی جھیل Lake Ontario ہے۔ صفیہ کو حیدرآباد چھوڑ کر میں Kingston پہنچ گیا۔

پھر نوکری کی تلاش شروع ہوگئی، اسی دوران مجھے ملیریا ہوگیا، ایک ہفتہ Kingston Hospital میں رہا۔ Kingston میں نوکری ملنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس لئے ایک مہینے کے بعد Toranto چلا گیا جو کینڈا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ نوکری کی تلاش میں کینڈا کی بہت ساری کمپنیوں میں درخواست دی لیکن اُن دنوں Construction Industry میں ہڑتال کی وجہ سے نوکری ملنا مشکل تھا۔ بہرحال تین مہینے بعد مغرب کے وقت ایک ٹیلی فون کال Montreal کی ایک کمپنی کے پراجکٹ منیجر کی آئی کہ اگر میں اُن کے پروجیکٹ پر کام کرنا چاہ رہا ہوں تو وہ میرا انٹرویو لیں گے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ انٹرویو کے لئے کہاں اور کب آؤں تو اُس نے کہا کہ وہ خود میرے گھر پر اسی وقت آنا چاہ رہا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی مذاق کر رہا ہے۔ لیکن اس نے بتلایا کہ وہ ٹورنٹو ایرپورٹ سے بات کر رہا ہے۔ میں نے اپنے رہنے کی جگہ کا پتہ اُسے سمجھا دیا۔ چونکہ میں Chinese Family کے گھر ایک کمرہ کرایہ کا لے کر رہتا تھا اور یہ لوگ جب Cabbage ابالتے ہیں تو ایک قسم کی بو آتی ہے میں نے جلدی سے سارے گھر میں ایک Perfume کی باٹل جو Paris سے بیوی کے لئے لایا تھا Spray کر دیا۔ انٹرویو صرف ۱۵ منٹ کا ہوا پھر منیجر نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لئے

ایک نوکری ٹورینٹو سے ۱۵ سو میل دور Russell Manitoba میں ڈیم پراجیکٹ پر Quantity Surveyor کی حیثیت سے ملے گی۔ میں نے فوراً وہ نوکری قبول کرلی اور دو دن بعد Manitoba چلا گیا۔ اکٹوبر ۱۹۶۹ء میں میری بیوی صفیہ اور لڑکا نصیر جو ۲۵؍اپریل ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوا تھا، کینڈا آ گئے۔ Russell میں ایک سال کام کرنے کے بعد مجھے Federal Government میں نوکری مل گئی۔ اسی دوران Toronto University سے Professional Engineering کی ڈگری حاصل کرلیا اور گورنمنٹ کے مختلف محکموں میں کام کیا جس میں کینڈا کے نیشنل پارکس اور ٹورنٹو ایرپورٹ پروجیکٹس قابل ذکر ہیں۔ ۳۰ سال سروس کرنے کے بعد میں نے Retirement لے لی۔

میری بیوی جو انڈیا سے آنے کے بعد صرف چائے اچھی بناتی تھیں، اب کینڈین، انڈین دونوں قسم کے کھانے، کیک اور مٹھائی بنانے میں ماہر ہوگئی ہیں۔ اب ان کے لئے ۳۰، ۴۰ لوگوں کی دعوت کرنا ایک معمولی بات ہے۔ میرے تین لڑکے ہیں۔ بڑا لڑکا ڈاکٹر مرزا نصیرالدین بیگ Anesthetist ہے۔ دوسرا لڑکا مرزا بصیر بیگ ٹیچر ہے اور تیسرا لڑکا کبیر بیگ Pharmacist ہے۔ دولڑکوں کی شادی ہوگئی ہے۔ نصیر کی بیوی کا نام سائرہ بانو ہے۔ سائرہ نے پاکستان میں MBA کرنے کے بعد کینڈا آکر CMA کیا ہے۔ حسن صورت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے سائرہ کو حسن سیرت سے بھی نوازا ہے۔ ماشاءاللہ سے بہت ذہین ہے اور اپنی بیٹی عائشہ کی غیر معمولی دیکھ بھال کرتی ہے۔ عائشہ ہم دونوں کے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہے۔ دوسرے لڑکے بصیر نے ایک جاپانی لڑکی Asako سے شادی کی ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ تیسرا لڑکا کبیر ٹورنٹو کے تین بڑے دواخانوں کی فارمیسی شعبوں کا Dirctor ہے اور ساتھ ساتھ Executive MBA بھی کر رہا ہے۔

ہم کینڈا کے ایک مقام Long Sault میں رہتے ہیں وہاں سے قریب کے شہر میں انڈیا، پاکستان کے چالیس خاندانوں کو ہم لوگ ۲۲ سال سے جانتے ہیں۔ سب آپس میں

خلوص سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے دُکھ درد اور خوشی میں شامل رہتے ہیں۔ کینڈا بہت پرسکون جگہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جنت ہے۔ یہاں پر لوگ دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ اپنے پڑوسیوں کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ میں جب سے Retired ہوا ہوں ہم لوگ ۳، ۴ مہینوں کے لئے حیدرآباد چلے جاتے ہیں، گھر کی کوئی فکر نہیں رہتی۔ پڑوسی گھر کے پودوں کو پانی دے دیتے ہیں اور نگرانی رکھتے ہیں۔ یہاں پر لوگوں کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ جس طرح مغربی ممالک کے متعلق غلط تصورات ہیں، یہاں رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہم ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے حُسن اخلاق ہم سے بہت اچھے ہیں۔ غیبت اور جھوٹ جیسی برائیوں سے پاک ہیں اور ان میں جذبۂ ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ لوگ بہت محنت و ایمانداری سے آفس میں کام کرتے ہیں۔

مرزا اصلاح الدین بیگ:

میری تاریخ پیدائش ۱۹۳۹ء ہے۔ ۱۹۵۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کرنے کے بعد پاکستان منتقل ہوگیا۔ کراچی میں کئی سال Real Estate Business میں کام کرنے کے بعد ابٹ آباد جسے برٹش حکومت نے پاکستان میں اپنا Hill Station بنایا تھا، منتقل ہوگیا۔ ابٹ آباد ایک خوبصورت شہر ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ بعض بہت اونچے پہاڑوں پر سردی کے موسم میں برف جمی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب اپنی بیوی رخسانہ اور لڑکے مرزا ضیاء الدین بیگ (طلحہٰ) کے ساتھ ابٹ آباد میں Retirement کی زندگی گذار رہا ہوں۔

مرزا رضی الدین بیگ:

میری پیدائش ۱۴؍ مارچ ۱۹۴۳ء، حیدرآباد میں ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں آصفیہ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد پاکستان چلا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں پاکستان میں بی۔ کام کیا اور پھر Chartered Accountancy کے کورسیس بھی کیا۔ کئی سال کراچی میں کام کرنے

کے بعد ۱۹۸۰ء میں دوبئی چلا گیا جہاں Al manal Centre میں Financial Controller کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔

میری شادی ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر نسرین سے ہوئی جنہوں نے Gaenocology میں Specialization کیا ہے۔ میرے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکے کا نام مرزا واجد بیگ جو Electronic Engineer ہے اور سامیہ سے شادی کی ہے۔ میری لڑکی کا نام شہلا ہے جس نے Business Management میں دوبئی سے ڈگری حاصل کی ہے۔ شہلا کے شوہر کا نام عقیل احمد علی ہے۔ شہلا کی ماشاء اللہ سے دو پیاری لڑکیاں زینب اور مریم ہیں اور لڑکا یوسف احمد علی ہے۔ شہلا اپنے افراد خاندان کے ساتھ لندن میں مقیم ہیں۔

مرزا مجید الدین بیگ:

۱۵/ جون ۱۹۴۶ء کو فوج کے دواخانے، حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں آصفیہ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اسکول میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔ انگریزی کے استاد قادر خاں صاحب جب مارنے آتے تو کلاس سے باہر بھاگ جاتا تھا لیکن وہ بھی بہت سمجھداری سے کام لیتے اور موقع دیتے کہ میں دوبارہ کلاس میں آ کر بیٹھ جاؤں اور پھر آہستہ سے پیچھے سے آ کر "لے، لے، پھر بھاگتا" کہتے ہوئے مارتے تھے۔ نویں جماعت کے انگریزی کے استاد رشاد صاحب جو ہمیشہ سوٹ پہنتے اور سگار لئے بہت ہی لاڈ اور پیار سے پڑھاتے اور اتفاق سے وہ میرے جنونی غلام دستگیر صاحب کے رشتہ دار بھی ہیں۔ ایک مرتبہ رشاد صاحب نے کہا کہ لڑکو! ایک خط انگریزی میں اپنی ماں کو لکھو یہ سمجھتے ہوئے کہ تم دوسرے شہر میں رہتے ہو۔ میں نے امی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ آتے وقت میرے استاد، رشاد صاحب کے لئے نائی لے کر آئیں۔ یہ قصہ رشاد صاحب نے دوسری کلاس کو بھی سنایا اور کہنے لگے کہ ایک طرف غصہ بھی آتا تھا اور دوسری طرف ہنسی۔ میں اپنے والدین کے ساتھ سعید آباد میں درگاہ واجے شاہ صاحب کے قریب رہتا تھا۔ عرصہ دراز بعد حیدرآباد گیا تو حبیب آپا نے وہ ڈائری بتائی

جس میں انھوں نے میری بچپن کی شرارتوں کا حال لکھا ہے۔ روز ایک نئی شرارت، سب بہن بھائیوں کو خوب ستاتا تھا۔ ڈائری پڑھ کر بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ گنڈی پیٹ دیکھنے گیا تو پانی نظر نہیں آیا۔ ہر طرف سوکھی گھاس اور کچرے کے ڈھیر نظر آئے۔

میں نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں بی کام کی تکمیل کی۔ ۱۹۷۴ء میں کینڈا چلا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں سید محمود صاحب اور فاطمہ کبریٰ صاحبہ کی لڑکی قدسیہ سے میری شادی ہوئی۔ میرا بیٹا ابرار بیگ شکاگو کی یونیورسٹی 41C میں فارمیسی کے تیسرے سال میں ہے۔ اللہ کے فضل سے صوم وصلواۃ کا پابند ہے۔ کینڈا میں ۲۴ سال رہنے کے بعد ہم ۱۹۹۸ء میں شکاگو منتقل ہو گئے۔ یہاں کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ باوجود اس کے کہ تمام سہولتیں ہیں' ہر کام منٹوں میں ہو جاتا ہے' لیکن حیدر آباد کی ٹھیلہ بنڈی' گرم گرم پکوڑے اور بھٹے بہت یاد آتے ہیں۔ طبیعت چاہتی ہے کہ حیدر آباد جاؤں اور کچھ عرصہ وہاں گزاروں۔

نور جہاں ضیاء:

میری پیدائش حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ گرلز ہائی اسکول نامپلی سے میں نے میٹرک کی تکمیل کی۔ ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ سے بی اے کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایڈ اور ایم ایڈ کیا۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے M.A کیا۔ آج کل کراچی کے آدم جی کالج میں ایجوکیشنل سائیکالوجی کی پروفیسر اور وائس پرنسپل ہوں۔ شوہر غلام دستگیر ہیں جنھوں نے کراچی کی ایک بنک میں Audit+Inspection میں Senior officer کی حیثیت سے ملازمت کی۔ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد مطالعہ کتب میں زیادہ وقت دیتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ دینی کتب خریدتے ہیں دوسروں کو تحفۃً بھی دیتے ہیں اور مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ دینی معلومات بہت وسیع ہیں۔

میری تین لڑکیاں ہیں۔ عظمیٰ، سلمیٰ اور ہما۔ لڑکے کا نام فاروق سلمان ہے۔ چاروں بچے اللہ تعالیٰ کے فضل سے نیک، سعادت مند ہیں اور سبھی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ عظمیٰ

نے B.Sc کیا ہے اس کے شوہر ڈاکٹر امجد علی ماہر امراض چشم ہیں۔ عظمٰی کے دو بچے ہیں۔ لڑکا محمود علی اور لڑکی ماہا ہے۔ سلمٰی نے کراچی ہی میں MSc کی تکمیل کی۔ اس کے شوہر محمد عبدالقیوم خاں نے Statistics میں M.Sc کیا۔ گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ M.S کمپیوٹر سائینس میں اور پھر اوٹاوا یونیورسٹی سے M.B.A کیا۔ ان کے دو بچے ہیں۔ لڑکا محمد عبدالواسع خاں اور لڑکی مریم فاطمہ۔

میری چھوٹی لڑکی ہما نے B.Com تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے شوہر شبیہہ اکرام نے آسٹریلیا کی ملبورن یونیورسٹی سے M.B.A کیا ہے۔ کراچی میں Johnsons & Johnson کمپنی میں مارکٹنگ منیجر ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ لڑکی کا نام علینا اور لڑکا ریان۔ فاروق سلمان نے B.Com کرنے کے بعد مارکٹنگ میں M.B.A کیا اور پھر M.S Information technology, میں۔

حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہوئے برسوں گزر گئے لیکن اپنے وطن اور رشتہ داروں کی یاد برابر آتی ہے۔ جب بھی موقع ملے، حالات ساتھ دیں۔ میں حیدرآباد ضرور جاتی ہوں۔

مرزا رفیع الدین بیگ:

میرا وطن حیدرآباد ہے۔ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے اور بھائی بہنوں کے ساتھ مجھے کراچی جانا پڑا۔ وہیں پر MBBS کی تکمیل کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مجھے شدید بخار تھا۔ میرے بھائی صلاح الدین میرے پاس آئے۔ ایک فارم کی خانہ پری کر کے مجھ سے دستخط لی۔ پتہ چلا کہ وہ مجھے ڈاکٹر بنانے کے چکر میں تھے۔ پپا کی بھی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ چنانچہ MBBS کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ امریکہ سے جب بھی کراچی جاتا، پپا اپنے دوستوں سے میرا تعارف یوں کرواتے ''یہ میرا بیٹا ہے۔ بچوں کے کینسر کا اسپشلسٹ ہے۔ اس کی اخباروں میں تصویر آتی ہے''۔ یہ کہتے ہوئے ان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے۔ امی کی بے پناہ محبت کو میں

الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ یہ لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ امریکہ سے کراچی آنے کے بعد جب واپسی کا وقت ہوتا تو کہتیں واپس میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔ امام ضامن باندھتیں اور اپنے پیارے ہاتھوں سے میری پیشانی پر کچھ لکھتیں شاید آیت الکرسی۔ دعائیں دینے کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر کی تشخیص کے بعد بھی کہتی تھیں کہ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ امریکہ میں ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی بھی وقت اندھا ہوسکتا ہوں کیوں کہ مجھے آنکھوں کا مرض Retinituspigmentusa ہے۔ یہ آج سے ۱۸ سال پرانی بات ہے۔ امی کہتی تھیں کہ اللہ کے کرم سے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں دعائیں کرتی رہوں گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی بھی صحت مند ہوں۔ اور آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔

۱۹۷۵ء میں پڑھائی کی غرض سے امریکہ گیا تھا۔ پانچ سال بچوں کے امراض اور پھر کینسر میں فیلو شپ کی۔ ۱۹۷۶ء میں امی پپا اور بہن بھائیوں سے ملنے کراچی گیا تو امی نے پوچھا ایک اچھی بچی دیکھی ہے شادی کروگے؟ میں بولا چلو دیکھنے میں کیا حرج ہے ویسے کچھ کھا پی لیں گے! حقیقت تو یہ ہے کہ لڑکیوں کو دیکھنا اور بلا وجہ reject کرنا کوئی شرافت نہیں۔ میں اپنی بہن نور جہاں اور امی کے ساتھ لڑکی دیکھنے گیا اور میری آنکھوں کے سامنے ایک بہت خوبصورت چہرہ آیا۔ واپسی پر امی نے پوچھا کیسی لگی بچی۔ میں نے مسکرا کر کہا چلے گی۔ پھر فوراً لڑکی والوں نے بھی ہاں کردی۔ منگنی ہوئی۔ ۱۹۷۸ء میں کراچی میں شادی ہوئی۔ میری بیگم نوری اچھی بیوی اور اچھی ماں ہونے کے علاوہ ایک قابل' فرض شناس ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والدین جناب سید ابراہیم اور محترمہ طیبہ سلطانہ ہیں۔ میری دو لڑکیاں ثنا اور کرن ہیں دونوں کی تاریخ پیدائش ۱۹۸۲ء ہے۔ یہ دونوں ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں۔ دونوں کو جانور پالنے کا شوق ہے۔ ان کے پالتو جانوروں میں تین کتے، دو بلیاں اور دو خوبصورت پرندے ہیں۔ ثنا کرن پڑھائی کی تکمیل کے لئے دور رہتی ہیں ان جانوروں کی دیکھ بھال میں اور نوری کرتے ہیں۔ امریکہ میں جانوروں کے بھی بڑے نخرے ہیں۔ ہم جب چھوٹے تھے تو حیدرآباد کے

کتے سارا وقت قصائی کی دکان کے سامنے آس لگائے بیٹھے ہوتے یا کبھی بھونکتے یا لوگوں کو کاٹتے تھے۔
یہاں تو ہماری گودوں میں رہتے ہیں۔ Vitamins اور Diet food کھاتے ہیں۔
ہر دو ہفتہ میں ان کی حجامت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔ ان سے باتیں کرنا اور کھیلنا بھی ہوتا ہے۔ کچھ اور پالتو جانور خرگوش، چوہے اور Turtles بھی تھے۔ انھیں ہم نے رخصت کر دیا کیوں کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ دو بلیاں اور بھی تھیں جو شاید ہم سے ناراض ہو کر چلی گئیں۔ ویسے بھی لگتا ہے کہ ہماری بیٹیوں کا دل ان جانوروں سے بھر گیا ہے۔ ڈر ہے کہ یہ دونوں کہیں ہاتھی کا بچہ، شیر یا سانپ گھر نہ لے کر آ جائیں۔

امریکہ میں زندگی کچھ آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ اپنی کار خود دھوتے ہیں۔ کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔ صفائی کرتے ہیں اور نوکری بھی۔ اتنی مصروفیات کی وجہ سے کسی کو فضول باتیں کرنے ایک دوسرے کی غیبت کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ مشینی زندگی ہے۔ خوب محنت کر کے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی خواہش ہر کسی کی ہوتی ہے۔

○ ○ ○

بیعت

بی۔اے کی طالبہ تھی اسی دوران حیدرآباد کے مشہور عالم دین حضرت محمد عبدالقدیر صدیقی حسرتؔ کے ہاتھ پر میں نے بیعت کی۔ایسے عالم اور مفکرِ اسلام سے میں نے کیا کیا سیکھا اس کی تفصیل میں جاؤں تو ایک کتاب بن جائے گی۔اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ کئی برس مجھے اپنے مرشد کے گھر منعقد ہونے والی دینی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا...... جن لوگوں نے اس بزرگ ہستی کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ کس پایہ کے عالم تھے۔چہرہ پرنور، علم کا سمندر تھے۔صبح سے شام تک مریدوں اور ضرورت مندوں کو وقت دیتے۔ ہر ایک کی بات غور سے سنتے اور اُسے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے۔ ہفتہ کا دن خواتین کے لئے مختص ہوتا۔قرآن شریف کی تفسیر سنائی جاتی۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔خواتین اپنے اپنے مسائل اپنی ذہنی الجھنوں کا ذکر کرتیں اور اس کے لئے قرآنی آیات پڑھنے کے لئے بتاتے...... کافی ضعیف اور کمزور ہوگئے تھے۔ دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں قرآن شریف کی تفسیر پڑھ کر سنانے کا کام میرے ذمہ کردیا۔نہ صرف یہ بلکہ آیات قرآنی پانی پر پڑھ کر دم کرنا، کسی کو کوئی آیت پڑھنے کے لئے کہنا۔یہ سارے کام میرے تفویض کردیئے۔ مجھے خود پر رشک آتا ہے کہ اتنی اہم ذمہ داریاں میں سنبھال رہی تھی۔رشک تو میں کرتی تھی حسد کرنے والے بھی سامنے آئے۔ رفیق نامی ایک لڑکی تھی۔ اُس سے دیکھا نہیں جاتا تھا کہ قرآن شریف کی تفسیر بھی میں پڑھ رہی ہوں۔خواتین کے لائے ہوئے پانی پر آیات بھی میں دم کررہی ہوں۔منتظم جلسہ بھی ہوں...... تو ظاہر ہے کہ اس کا حسد بڑھتا ہی گیا۔ایک دفعہ سرکار کی سالگرہ کے موقع پر میں نے اُن کے لئے زرد رنگ کا اونی کوٹ بُنا۔ٹوپی تیار کررہی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا۔سالگرہ کے دن میں کوٹ اور ٹوپی لے کر پہنچی۔ اتفاق سے وہ لڑکی بھی میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ دیکھا تو بالکل اسی رنگ کا سوئٹر وہ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ جیسے

ہی میں اپنے مرشد کے تخت کے قریب پہنچی وہ بھی میرے ساتھ آگے بڑھی۔ میں نے اپنا چھوٹا سا نذرانہ پیش کیا۔ اُس نے بھی میرے ساتھ ہاتھ بڑھائے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرکار بہت ضعیف و ناتواں ہو چکے تھے۔ بات آہستہ کرتے۔ میرے لائے ہوئے کوٹ کو دیکھ کر اشارے سے کہنے لگے پہناؤ۔ میں نے بہت ہی سنبھل کر کوٹ پہنا دیا۔ ہاتھوں میں تکلیف تھی اس لئے بہت خیال کرنا پڑتا تھا۔ اس لڑکی کا لایا ہوا کوٹ لے کر رکھ لیا۔

درس کے ساتھ ساتھ یہاں پر اور بھی کام سکھائے جاتے۔ پکوان کی کلاس ہوتی، سلائی، کڑھائی سب ہی میں نے سیکھا۔ دس محرم کو عجب سماں ہوتا۔ دو دن پہلے ہی سے لوگ باریک کانچ لا کر جمع کرنا شروع کر دیتے۔ عصر اور مغرب کے درمیان ایک دعا پڑھتے جو ہر قسم کے زہر، اثرات جادو ٹونے وغیرہ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے پڑھی جاتی۔ اس کانچ کی تاثیر یہ ہے کہ دعا پڑھنے کے بعد وہ ایسے کھائی جاتی جیسے پاپڑ کھا رہے ہوں۔ بے شمار افراد آ کر وہ کانچ حاصل کرتے۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اس دعا کی بھی مجھے اجازت ملی ...... اور بفضلِ خدا دعاؤں کی تاثیر سے لوگ شفایاب ہوتے ہیں۔ مرشد قبلہ نے اپنی خاص بیاض جس میں آیاتِ قرآنی اور ان کی تاثیر لکھی ہے مجھے عنایت کی تھی۔ میں نے ساری قرآنی آئتیں لکھ لیں۔ کئی تعویز بھی ہیں جو مہلک بیماریوں کے لئے آپ نے بتائے تھے۔ ہاں! کانچ کی تاثیر یہ ہے کہ کسی کو اگر سانپ، بچھو نے کاٹ لیا ہو یا کسی نے خودکشی کے ارادے سے یا غلطی سے کانچ یا زہر کھا لیا ہو تو اس کانچ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھلا دینے سے زہر کا اثر زائل ہو جاتا ...... مجھے بھی اس کی اجازت ملی۔ دس محرم کو کانچ اور پانی پر ستر مرتبہ پڑھ کر رکھنا ہوتا ہے ...... کئی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر کالونی ہی کی ایک خاتون آئیں اپنے شوہر کو لئے ہوئے۔ پیٹ کے درد سے تڑپ رہا تھا۔ شاید شراب بھی پیتا تھا۔ اُسے باہر سیڑھیوں پر بٹھا دیا۔ پانی پڑھ کر دینے کے لئے کہنے لگی۔ میں نے سرکار کی بتائی ہوئی دعا تین مرتبہ پانی پر پڑھ کر دے دی۔ اُس خاتون نے اسی وقت پانی پلا دیا۔ آیت شریف کی تاثیر دیکھئے کہ جو تڑپتا

ہوا آیا تھا، ایسے گیا جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آیت یہ ہے۔

کلوا وشربوا من الرزق اللہ ولا تعثو فی الارض مفسدین۔

اسی طرح بہت سی آیتیں ہیں، دعائیں ہیں جو مجھے عنایت کی گئیں۔ ایک دن اپنی بیاض سے عطر بنانے کا نسخہ دیا۔ کہنے لگے۔ یہ نسخہ لکھ لو لیکن بنا کر فروخت نہیں کرنا۔ بعد میں پتہ چلا کہ آپ کے ایک صاحبزادے یہ عطر بڑے پیمانے پر بناتے ہیں اور وہ مارکٹ میں فروخت ہوتا ہے۔ اس نسخے سے گلاب، خس، موتیا غرض کہ ہر قسم کے عمدہ عطر بنتے ہیں۔ میں نے اپنی امی، خالہ اور بہن بھائیوں کو یہ عطر ان کی فرمائش پر بنا کر دیا۔

پکوان سکھانے کا باقاعدہ انتظام کرتے۔ خواتین اور طالبات اس سے مستفید ہوتیں۔ ایک دفعہ پیاز باریک کاٹنے کا مقابلہ تھا۔ ایک صاحبہ پیاز کاٹتے ہوئے کہنے لگیں۔ سرکار! چھری تیز نہیں ہے۔ اس پر مسکرائے۔ دھیمی آواز میں کہا ناچنا نہیں آیا تو آنگن تیڑھا۔ دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم، آداب واخلاق، بچوں کی تعلیم وتربیت، اسی طرح کے بہت سے امور پر خواتین وطالبات کو درس دیتے۔ حصول تعلیم پر زور دیتے۔ خواتین کو باتوں باتوں ہی میں بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے جن سے وہ سبق سیکھتیں۔ ہفتہ کے دن خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک صاحبہ نے اپنے گھریلو مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا سرکار! کام کے لئے آدمی نہیں مل رہا ہے۔ اس پر کہنے لگے' خود آدمی بنو۔

ایک دن مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ منہ کالا کر۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر مسکرا کر دھیمی آواز میں کہنے لگے۔ اس کا مطلب ہے منہ کومسی لگے۔ میرے لئے ہمیشہ یوں دعا فرماتے اللہ تجھے چاہنے والا شوہر دے۔ سرکار کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور مجھے توفیق صاحب جیسا چاہنے والا شوہر ملا۔

ایک بات جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ سرکار نے کئی دفعہ مجھ سے کہا تو اگر بیٹا ہوتی تو خلافت دیتا۔ درس قرآن میں شریک رہنے والی خواتین یہ سن کر خوش ہوتیں۔ یہ میرا طالب علمی

کا زمانہ تھا۔عمر میں مجھ سے بڑی خواتین بھی میری بہت عزت کرتیں ۔اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی خاتون سے ملاقات ہو جائے تو وہ اس بات کا ذکر ضرور کرتی ہیں ۔

پیرانی ماں صاحبہ بھی انتہائی نیک سیرت ، پاکباز خاتون تھیں ۔ان کے پاس ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والی خواتین آتیں ۔وہ سب سے یکساں سلوک کرتیں اور اپنے علم سے مستفید ہونے کا موقع دیتیں ۔

مولوی عبدالقدیر صدیقی حسرت کے تمام صاحبزادے عالمِ دین ہیں ۔اُن کے بھی بے شمار مریدین اور معتقدین ہیں ۔مرشد کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے مولوی عبدالرحیم حیرت ان کے خلیفہ اور جانشین ہوئے ۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں جانے لگی ۔درسِ قرآن ہوتا اور تفسیر سمجھائی جاتی ۔کئی برس یہ سلسلہ رہا حضرت عبدالرحیم قبلہ کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر ارمان صدیقی کے پاس روزانہ سینکڑوں افراد کا ہجوم رہتا ہے آپ کی دعا میں تاثیر ہے۔سرکار کے دوسرے فرزند علی پاشاہ قبلہ بھی بڑے پایہ کے عالم تھے ان کے ہاں بھی دینی محفلوں میں شرکت کرنے کا اعزاز ملا۔

سرزمین حیدرآباد سے بہت سے نامور علمائے دین ابھرے۔ان میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب اور مولانا حبیب جعفر صاحب کے اسمائے گرامی کا ذکر ضروری ہے۔میرے والد نے حضرت عبداللہ شاہ صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ ان کے پاس جایا کرتے اور ان کی قابلیت اور دینی معلومات سے مستفید ہوتے ۔والدہ مولانا حبیب جعفر صاحب کی مرید اور معتقد تھیں ۔ میں کم عمری ہی سے والدہ کے ساتھ وہاں جایا کرتی ۔قصیدہ بردہ شریف کی محفل ہوتی ۔ پیرانی ماں صاحبہ بھی ہر جمعرات خواتین کو دینی مسائل کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم دیتیں ۔ ان کے چہرہ پر ایک خاص نور ہے۔ وہ ہمیشہ درودِ شریف کا ورد کیا کرتیں ۔ ایسے چہرے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں ۔

ملک اور بیرون ملک کے علمائے دین کے بصیرت افروز مضامین کا مطالعہ کرتی ہوں ۔

کتابوں اور اخباروں میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتی ہوں۔ بزمِ خواتین، انجمنِ خواتین، دبستان جلیل کے دینی اجلاس میں پابندی سے شرکت کرتی ہوں۔ میلادالنبیؐ کے مبارک جلسوں میں مجھے بھی مخاطب کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے جسے اپنی خوش بختی تصور کرتی ہوں۔

○ ○ ○

فطرت

اپنے بارے میں اتنا تو کہہ سکتی ہوں کہ بچپن ہی سے بہت حساس اور خوددار واقع ہوئی ہوں۔ خاموشی، سکون، امن چاہتی ہوں۔ لڑائی جھگڑوں سے طبیعت گھبراتی ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے طبیعت کا تقاضا یہی تھا، محلے کی لڑکیوں سے بھی زیادہ دوستی نہ تھی۔ صرف دینی محفلوں میں ملاقات ہوتی۔ بھائی بہنوں سے میری کبھی لڑائی نہیں ہوئی، بچپن سے لے کر آج تک اللہ کے فضل و کرم سے سب خلوص، پیار و محبت سے ملتے ہیں۔ سب میرا خیال رکھتے ہیں۔

جھوٹ اور غلط بیانی سے سخت نفرت ہے۔ میں بالکل برداشت نہیں کرسکتی آپے سے باہر ہوجاتی ہوں، طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ دیانت دار ہوں۔ کسی کی امانت ہو، کسی بھی شکل میں، اُسے حفاظت سے رکھتی ہوں اور متعلقہ فرد تک ذمہ داری سے پہنچادیتی ہوں۔ محنت سے میں نے کبھی جی نہیں چرایا۔ گھر کے کام کاج سے لے کر ملازمت تک، میں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ ادبی زندگی میں کئی واقعات ہیں جن کے حوالے سے میں فخر یہ کہہ سکتی ہوں کہ سبھی نقادوں نے میری محنت اور ادبی دیانت داری کو سراہا ہے۔ جھوٹ کے علاوہ کسی کے طعنوں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ روتے روتے میرا بُرا حال ہوجاتا ہے۔ لاکھ بھلانا چاہوں لیکن تکلیف دہ باتیں دل سے نہیں نکلتیں۔ ذہنی تناؤ بڑھ جاتا ہے تو مجھے Tension دور کرنے کے لئے دوائیں لینی پڑتی ہیں۔ میری حساس طبیعت کسی بھی غلط بات کو سہنے عادی نہیں۔

میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتی، زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتی جس سے کسی کو تکلیف ہو، دل آزاری، دل شکنی ہو۔ پھر بھی اپنی سرگذشت میں یہ لکھ کر واضح کرنا چاہتی ہوں کہ اگر غلطی یا غلط فہمی سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو صدقِ دل سے معافی چاہتی ہوں۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ خاندان یا محلے میں ہر کوئی خلوص سے ملے۔ آئی۔ ڈی۔ پی۔ ال کالونی میں میرے پڑوس میں ایک خاتون رہتی تھیں ان کی ہمیشہ دوسری پڑوسنوں سے زوردار لڑائی

چلتی۔ بچوں پر، کبھی کوڑے پر کبھی پانی کے گرنے پر، کبھی ایسا بھی ہوا کہ دو پڑوسنوں نے لڑائی کو اتنا طول دیا کہ کورٹ تک پہنچ گئیں۔ یہی خاتون میری بہت عزت کرتی ہیں۔ پڑوسیوں سے ہمیشہ اچھے تعلقات رہے۔ ہندو خواتین کی اکثریت تھی۔ بڑے خلوص سے ملتیں۔ اپنے ہر تہوار پر مدعو کرتیں۔ میری تیار کی ہوئی ڈشیں' مختلف قسم کے میٹھے، قبولی، بگھارے بیگن' شیر خرما اور دیگر پکوان وہ پسند کرتی تھیں بعض خواتین بڑے شوق سے سیکھ بھی لیتی تھیں۔ مجھے فخر ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی سبھی لوگ ہمارے گھرانے سے متاثر تھے۔ ایک ہندو خاتون اتنی متاثر تھیں کہ وہ کہتیں بھابی! آپ کالونی کی ناک ہیں۔ میں اپنی پڑوسنوں اور کالونی کے سبھی افراد کی تہہ دل سے ممنوں ہوں۔

میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ خصوصاً کسی ضعیف معذور خاتون کو دیکھتی ہوں کہ وہ بیمار ہے، چلنے سے مجبور ہے یا اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے تو میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں۔ اپنے لئے، ہر ایک کے لئے دُعا مانگتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہ کرے۔ **یَا سَلامُ** کا ورد کثرت سے کرتی ہوں۔ سڑک عبور کرتے ہوئے یا راستے میں کسی معذور، ضعیف کو دیکھتی ہوں تو دل بھر آتا ہے۔

میں نے اپنے بعض مضامین میں بھی لکھا ہے کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ ایسی خواتین جو علانیہ جھوٹ بول کر خاندانوں میں لڑائی لگاتی ہیں یا نفرت کا بیج بوتی ہیں انھیں میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔ میرے یا میرے بچوں کے بارے میں یا توفیق صاحب کے بارے میں کوئی غلط بات کہہ دے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ایک جھوٹ ستر برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس سے باز نہیں آتے۔ دل آزاری بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ کوئی بات ایسی زبان سے نہ نکلے جو کسی کے لئے باعثِ تکلیف ہو۔ میرے مرشد مولوی محمد عبدالقدیر صدیقی حسرتؔ اور میرے ماں باپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ یوں بھی میں نے آزمالیا ہے کہ جو کوئی میری دل آزاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ

کے حکم سے وہ کبھی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ دل آزاری کرنے والا، جھوٹ بکنے والا دین سے تو گیا ہی، دنیا میں بھی تکلیف اٹھاتا ہے۔ یہ میرا ایقان ہے۔ میں صبر کر لیتی ہوں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتی ہوں کہ شر پسندوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ **رَبِّ اِنِّی مَغْلُوبٌ فَانْتَصِر** پڑھا کرتی ہوں۔

میری خواہش ہے کہ کسی خاندان میں آپسی جھگڑے نہ ہوں۔ رنجش نہ ہو۔ لوگ خواہ وہ کسی رشتے میں بندھے ہوں ہمیشہ مل جل کر زندگی گزاریں۔ کسی گھرانے کے بارے میں جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ ساس بہو میں جھگڑا ہے آپس میں بات چیت نہیں۔ میاں بیوی میں لڑائی چلتی ہے یا نند بھاوج ایک دوسرے کی دشمن بنی ہوئی ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ خصوصاً بچوں کو ان کے ماں باپ سے بدظن کروانے والوں پر میں لعنت بھیجتی ہوں۔ بچوں کی پیدائش سے لے کر ان کی پرورش، دیکھ بھال، تعلیم اور دیگر فرائض کی تکمیل میں ماں باپ خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی حسد، لالچ یا خودغرضی سے لگائی بجھائی کر کے خاندان میں پھوٹ ڈال دے تو میری نظر میں وہ ناقابلِ معافی ہے۔ گناہ گار ہے، خدا کے پاس وہ جواب دہ ہوگا۔ مجھے تعجب ان بچوں پر ہوتا ہے جو تحقیق کئے بغیر یک طرفہ فیصلہ کر کے اپنی ماں یا بیوی سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ سچائی جانے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ عورت خواہ وہ کسی روپ میں ہو اس سے انصاف کریں۔ ماں غلطی کر رہی ہو تو اُسے ٹوکیں۔ بیوی کا قصور ہو تو اُسے روکیں۔ ایک اور بات جو مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ یہ کہ بعض مائیں صرف حق مانگتی ہیں، فرائض بھول جاتی ہیں۔ بچوں کو مختلف طریقوں سے ذہنی الجھنوں میں مبتلا کرتی ہیں۔ بہو کے گھر میں قدم رکھتے ہی مختلف مسائل، الجھنیں پیدا کر کے نہ خود سکون سے رہتی ہیں نہ دوسروں کو سکون سے رہنے دیتی ہیں۔ ایسی خواتین کی اصلاح ضروری ہے۔ انھیں ٹوک دینا چاہئیے۔ غلطیوں کی نشان دہی کر کے پرسکون زندگی گزارنے کی ترغیب وقتاً فوقتاً انھیں ملنی چاہئیے۔

حق تلفی کو برا سمجھتی ہوں ۔ بعض لوگ علانیہ اپنے ہی قریبی رشتہ داروں کی زمین ، جائیداد پر قبضہ کر کے مگن رہتے ہیں ۔ آخرت سے بے خبر ایسے کئی کام کر جاتے ہیں ۔ مجھے تعجب اس وقت ہوتا ہے جب مخصوص مذہبی لبادہ اوڑھے ایسے غیر شائستہ کام کرنے والے اپنے اطراف و اکناف اور کبھی جان پہچان والوں میں مل جاتے ہیں ۔ ناانصافی ہم سے بھی کی گئی ۔ حق تلفی تو بہت ہوئی ۔ امی کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب کا مزار چادر گھاٹ پُل کے پاس ہے ۔ یہ بڑے نیک اور پارسا انسان تھے ۔ ان کی لاکھوں روپے کی جائیداد ہے جو پُل کے بعد سے کافی دور تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اب یہاں دکانیں آباد ہیں ۔ یہ ساری جائیداد انھیں کی ہے جس میں امی کے علاوہ اور چند رشتہ دار حصہ دار ہیں ۔ خاندان کے ایک فرد کی بدنیتی ، لاپروائی کی وجہ سے دوسرے اس جائیداد سے محروم رہے ۔ ورنہ سبھی مستفید ہو سکتے تھے ۔ اس قسم کی ناانصافیاں تقریباً ہر خاندان میں ہوتی آئی ہیں ۔ کہیں ایک بھائی سب کا حصہ ہڑپ کر چکا ہے تو کہیں بیٹے مل کر باپ کا قصہ تمام کر چکے ہیں ۔ کہیں جعلی دستخط کر کے کسی کو محروم کر دیا گیا تو کہیں کسی اور قسم کا دھوکا دیا گیا ہے شاید دنیا اسی کا نام ہے ۔

چھوٹے بچے مجھے بہت بھاتے ہیں ۔ خاندان کے ہوں یا پڑوس میں رہنے والے ۔ غریبوں کے بچوں کو جب میں دیکھتی ہوں کہ کوڑے کے ڈھیر سے نکال کر یا سڑک پر سے کوئی چیز اٹھا کر کھا رہے ہیں تو مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے ۔ میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے ۔ ایک دن میں اپنے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی تھی ۔ سامنے فلیٹ سے کسی نے آم کھا کھا کر چھلکے اور گٹھلیاں نیچے پھینکنی شروع کیں ۔ ذرا سی دیر میں ایک دوسرے فلیٹ میں کام کرنے والی عورت کا چھوٹا بچہ وہاں آیا ۔ ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے وہ چھلکے اور گٹھلیاں اٹھالیں ۔ مٹی جھٹک کر کھانے لگا ۔ یہ منظر کئی دنوں تک میری نظروں کے سامنے تھا ۔ امیر تجوریاں بھر رہے ہیں اور غریب فاقے کر رہے ہیں ۔ بہرحال ، غریبوں اور ان کے بچوں سے ہمدردی ہے ۔ حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ ان کی مدد کر سکوں ہمیشہ یہی سوچتی ہوں کہ مجھ میں اتنی صلاحیت کہاں ، جو

بھی دیتی ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے کرم سے نوازا ہے تو فرض بنتا ہے کہ محتاجوں کی مدد کروں۔ امی کے زمانے سے جو ملازمین تھے تقریباً ختم ہو گئے۔ ان کے متعلقین کافی ہیں۔ بس حسبِ استطاعت انھیں زکواۃ، صدقہ، خیرات، مدد جو بھی ہو، جتنا بھی ہو دے دیتی ہوں۔

چھوٹے بچوں کے ذکر کے ساتھ یہ بھی وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ جب میں دیکھتی ہوں کہ اسکوٹر پر لوگ چھوٹے بچوں کو بٹھا کر لیجاتے ہیں اور کوئی بچہ اونگھنے لگتا ہے تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ توفیق صاحب سے کہتی ہوں کہ ذرا اسکوٹر آگے بڑھایئے۔ پھر اُس اسکوٹر راں کو بچے کے اونگھنے کی اطلاع دیتی ہوں۔ کبھی دیکھتی ہوں کہ دو تین سالہ بچے کو کوئی پیچھے بٹھا کر لے جا رہا ہے اور وہ بچہ محفوظ نہیں ہے تو مجھے ان ماں باپ پر بڑا غصہ آتا ہے۔ اسکول جانے والے بچے جب لاپروائی سے سڑک عبور کرتے ہیں تب بھی سوچتی ہوں کہ ان کے ماں باپ دوسرے خرچ کم کر کے انھیں اسکول بھیجنے کے لئے کسی سواری یا کسی آدمی کا انتظام کیوں نہیں کرتے۔ بہرحال ایسے کئی مواقع آتے ہیں۔ شاپنگ سنٹرس کے قریب جہاں ٹریفک بے تکی ہوتی ہے موٹریں اور اسکوٹرس تیز رفتاری سے گزرتی ہیں۔ خواتین اپنے بچوں کا ہاتھ تھامے یا کبھی تنہا چھوڑ کر چلنے میں مگن ہوتی ہیں۔ میں چلتے چلتے انھیں کہتی ہوں کہ بچے کو دوسری جانب لے لیں تاکہ وہ محفوظ رہے۔ میرے کہنے پر وہ چونک کر جلدی سے بچے کو دوسری جانب کر لیتی ہیں تب میں اطمینان کی سانس لیتی ہوں۔

راستہ چلتے، کسی اجنبی کو بھی میں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ ایک دفعہ اورینٹل اردو کالج حمایت نگر سے رات دس بجے توفیق صاحب کے ساتھ گھر واپس ہو رہی تھی۔ بالا نگر چوراستہ پر ایک شخص سڑک پر گرا نظر آیا۔ میں نے توفیق صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اسکوٹر پلٹا کر واپس آئے۔ کسی نے ٹکر دے دی تھی۔ زخمی، بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ چند لوگ دیکھ کر یہ کہتے آگے بڑھ گئے یہ اپنی کالونی کا نہیں ہے۔ انسان ہے، یہ کسی نے نہیں سوچا، شاید یہاں کے بے

تکیے قانون سے لوگ ڈرتے ہوں گے کہ کہیں بعد میں شہادت، گواہی کے سلسلے میں انھیں گھسیٹا نہ جائے۔ ہم دونوں نے اس کی پروا کیے بغیر ارادہ کرلیا کہ پولیس اسٹیشن پہنچ کر اطلاع دینی چاہیے۔ توفیق صاحب مجھے گھر چھوڑ کر فوراً گئے اور تھانے میں اطلاع دی۔

دکاندار چیز کے ناپ تول یا معیار کے سلسلے میں بے ایمانی سے کام لیں تو میں برداشت نہیں کرسکتی۔ میوہ فروش ہوں کہ ترکاری والے، مٹھائی کی دکان ہو کہ بیکری، میں بہت محتاط رہتی ہوں۔ ایک دفعہ ایک بیکری سے قلمی خریدی، گھر آنے کے بعد دیکھا کہ باسی ہے۔ دوسرے دن اُس بیکری کے مالک کی خوب خبر لی۔ کئی سال سے وہاں سے چیزیں خریدی جاتیں۔ مالک بھی مہذب قسم کے تھے لیکن ناقص اشیاء گھر لاکر میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں نے اُن سے کہہ دیا یہ دعوت کی بچی ہوئی قلمی آپ نے فروخت کی ہے۔ کبھی انھیں کہتی ہوں آپ کھا کر دیکھئے۔ یہاں پانچ، دس روپیہ کی اہمیت نہیں۔ بات صرف دکانداروں کی بے ایمانی کی ہے اس لئے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ ایک دفعہ دو بگونے خریدے، ڈھکن پر پانی پڑتے ہی دھبے آگئے۔ دوسرے دن دکاندار سے شکایت کی۔ وہ بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ غصے سے میں نے دونوں ڈھکن دکان میں دور پھینک دیئے۔ بلکہ اچھال دیئے۔ یہ منظر دکان میں موجود دوسری خواتین نے بھی دیکھا۔ دکاندار ایک دم سیدھا ہوگیا۔ جھٹ سے اس نے عمدہ اسٹیل سے بنے دو ڈھکن لاکر دے دیئے۔ انسان ہوں، بعض دفعہ نامعقول لوگوں کی بے تکی حرکات، بددیانتی، بے ایمانی کو برداشت نہیں کرسکتی۔

لباس، سج دھج

گرلز ہائی اسکول نامپلی میں طالبات کوئی بھی لباس پہن سکتی تھیں۔ یونیفارم کی پابندی نہیں تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں میرا لباس عموماً سوتی کپڑے سے بنا اور اوسط قیمت کا ہوتا۔ پاجامہ کرتا اوڑھنی یا شلوار شرٹ' اوڑھنی' اس زمانے میں اوڑھنیوں کو گھر میں رنگنے' چننے کا چلن تھا۔ اس کے لئے بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ رنگتے وقت مختلف طرح سے اوڑھنی کو دھاگوں سے

باندھ کر خوبصورت ڈیزائن بھی بنائے جاتے۔ ابتدا ہی سے مجھے چمکیلے بھڑکیلے کپڑے پسند نہیں۔ دعوتوں میں بہت کم جاتی تھی اور کبھی جانا ہوتا تو ہلکے رنگ کے سلک کے سوٹ سلواتی۔ کالج میں کھڑا ڈوپٹہ بھی پہنا۔ اس کے لئے چند ساتھی ایک دن قبل طے کر لیتے تھے کہ کل سب کھڑے دوپٹے پہنیں گے۔ چار پانچ طالبات ایک جیسے لباس میں ہوتیں تو بہت اچھا لگتا تھا۔

جہیز میں جو کپڑے امی نے دیئے اس میں ہر قسم کی ساڑیاں تھیں۔ کامدانی، چمکی، کلابتو، بھاری کام کی ہوئی زری کی ساڑیاں، بنارسی سبھی تھیں۔ اس وقت اتنا شعور نہیں تھا کہ اپنی پسند کا اظہار کر کے سلک کی ساڑیاں خریدوں۔ بعد میں جو ساڑیاں خریدیں اس میں خیال یہ رکھا کہ زیادہ چمک دمک نہ ہو، سلک البتہ اچھا ہو، ملازمت کرنے لگی تو پھر سوتی ساڑیاں ہی مجھے بھانے لگیں۔ یہ واضح کردوں کہ میرے پاس کسی بھی وقت بے شمار کپڑے نہیں رہے۔ جب بھی خریدتی، اچھی قسم کے کپڑے کا انتخاب کرتی۔ سوتی کے ساتھ سلک کی بھی ساڑیاں میرے پاس ہیں۔ لیکن شوخ بھڑک دار کبھی پسند نہیں آتیں۔ ساڑیوں کے انتخاب کے سلسلے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ میری خریدی گئی ساڑیوں کو سبھی خواتین پسند کرتی ہیں۔ رشتہ دار بھی اور دوست بھی۔ ویمنس کالج کی ملازمت کے دوران کالج کی پرنسپل صاحبان بھی بطور خاص ساڑیوں پر نظر رکھتیں اور بے ساختہ تعریف کرتیں۔ خصوصیت سے پروفیسر سرسوتی راؤ اور پروفیسر وی آر للیتا۔ اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ میرے کپڑوں کی پسند ناپسند میں توفیق صاحب کی رائے ہمیشہ شامل ہوتی۔ خریداری کے لئے ہم دونوں ساتھ ہی جاتے۔ اُن کے کپڑے ہوں یا میرے دونوں کی مشترکہ رائے سے خریدتے۔ مجھے ابتدا ہی سے عادت ہے کہ ساڑی کے پلو سے پیٹھ ڈھکی ہوئی ہو۔ گھر میں بھی اسی طرح رہتی ہوں۔

دو نافرمانیاں

توفیق صاحب چاہتے تھے کہ میں میک اپ کروں، جوڑا باندھوں۔ ابتدا میں تو میں ان کی باتوں میں آگئی۔ وہ خود بہت اچھا جوڑا باندھتے تھے حالانکہ کہیں باقاعدہ سیکھا نہیں۔

دو چار مرتبہ شادی کی دعوتوں میں، میں نے ان سے جوڑا بندھوالیا۔ لیکن جب شادی خانے میں قدم رکھتی تو مجھے گھٹن سی ہونے لگتی، ایسے لگتا کہ خواتین کی توجہ میری جانب ہے۔ مجھے عادت نہیں تھی۔ بس سیدھی سی چوٹی پسند تھی۔ میں جوڑا بندھوانے کی بجائے التجا کر کے چوٹی ڈال لیتی تو یہ ہوئی ایک نافرمانی......! دوسری یہ کہ ماں باپ کے کہنے پر بھی میں پاکستان نہیں گئی۔ میں ہندوستان میں مرنا چاہتی تھی وطن چھوڑنا میرے لئے مشکل لگتا تھا۔ میں خود ہی نافرمانیاں کہتی ہوں، اور خود ہی نفی بھی کرتی ہوں کہ یہ نافرمانیاں نہیں ہیں! ہر انسان کو اپنی مرضی سے جینے اور رہنے کا حق ہے۔ جبراً وہ نقل مقام نہیں کر سکتا۔ تو...... میں مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اگر اِسے غلطی میں شمار کیا جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ وہ بڑا رحم دل اور مہربان ہے۔

نا مانگوں سونا چاندی

میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ امی کے پاس بے حساب زیورات تھے۔ سونا، چاندی ہیرے موتی بہت کچھ۔ گھر کی تعمیر، بچوں کی پڑھائی کے لئے امی ان زیورات کو فروخت کرتی گئیں۔ اس کے باوجود بھی آبائی زیورات میں سے کچھ ہم بہنوں کو بھی ملا۔ میرے حصے میں امی کی پردادی کی ایک جگنی اور بصرہ کے موتی کا ہار آیا۔ میری سسرال والوں نے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا تھا پھر بھی جو زیور مجھے امی پپا دینا چاہتے تھے اس میں ان آبائی زیورات کے علاوہ جڑاوی لچھا، کرن پھول، گلوبند، ست لڑا، ٹیکہ، ایرنگ، نکلس، کڑے، انگوٹھیاں تاپس وغیرہ بھی کچھ تھے۔ تقاریب میں شرکت کے وقت میں زیور پہن لیا کرتی، لیکن بہت کم۔ ایسا نہیں کہ ہر قسم کا زیور لاد لیا یہ دکھانے کے لئے کہ دیکھو میرے پاس کتنا زیور ہے۔ بعض خواتین گھر میں بھی اچھا خاصا زیور پہنے رہتی ہیں خیر...... یہ تو ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہے۔ ہر ایک کی پسند ہے کسی کو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کوئی باہر کی کمائی کی 'بغیر ڈیزائن والی آٹھ آٹھ سونے کی چوڑیاں بھی ڈال لے تو کون ٹوک سکتا ہے کہ بی بی کم از کم اُس سونے کا ڈھنگ سے کوئی زیور

بنوالو یا اتنا نہ پہنو کہ کسی غریب کا دل دکھے، وہ رنجیدہ ہو کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہاں...... تو مجھے کہنا یہ ہے کہ بعد میں، میں نے بصرہ کے موتی اپنی بیٹی عفت کو اور جگنی اپنی بہو آمنہ کو ان کی شادی کے موقع پر دے دیئے۔

اکثر میں سنتی ہوں کہ عید پر شوہر نے فلاں زیور دیا۔ سالگرہ پر بیوی نے فرمائش کر کے کوئی زیور بنوایا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ فرمائش کروں ضد کروں، جبر الوں۔ مصروف زندگی گزاری، سیدھی سادی۔ لالچ، دکھاوے سے پاک۔ بعض خواتین کو میں نے دیکھا ہے کہ زیور کے لئے ضد کر کے شوہر سے منہ جلا لیتی ہیں۔ دنوں بات نہیں کرتیں، گھر کا ماحول بگڑ جائے، کوئی پروانہیں۔ بس زیور سے کام۔ بچوں کی پڑھائی یا کسی ناگہانی بیماری کے وقت بھی وہ انجان ہو جاتی ہیں۔

میرے پاس بہت کم زیورات ہیں۔ یوں بھی میں کبھی ان کی شوقین نہیں رہی۔ جب بنوا سکتی تھی اس وقت بھی میں نے دلچسپی نہیں لی۔ توفیق صاحب کے انتقال کے بعد تو مطلق دلچسپی نہیں رہی۔ ایک تولہ سونا خریدنے کی بجائے میں توفیق صاحب اور اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لئے ۵، ۶ ہزار روپیہ ملت فنڈ میں دینا پسند کروں گی یا کسی غریب لڑکی کی شادی کے لئے دے کر مجھے دلی خوشی ہوگی۔

بعض خواتین آٹے، چاول دال کی طرح اپنی پڑوسن سے زیور، کپڑے مانگنا بھی عیب نہیں سمجھتیں۔ زیور کے ذکر پر یاد آیا، برسوں پہلے کی بات ہے، ایک گھرانے کی بہو پڑھنے کے لئے میری پاس آتی تھی، میں اپنی ملازمت اور گھر کی مصروفیات کے باوجود اسے وقت دے دیا کرتی تھی کہ چلو کسی کے کچھ کام آ جاؤں تو بھلا ہی ہوگا۔ چند ماہ بعد رات نو بجے دروازے پر کھٹکا ہوا دیکھا تو وہی صاحبہ تھیں۔ پہلا سوال انھوں نے یوں داغا آپ کے پاس سونے کا نکلس ہے؟ مجھے شادی میں شرکت کے لئے پونے جانا ہے۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے کہا نکلس تو نہیں ہے۔ اگر ہوتا بھی تو میں آپ کو نہیں دیتی، میرے کچھ اصول ہیں نہ

مانگ کر پہنتی ہوں نہ کسی کو دیتی ہوں۔ ریل کے سفر میں تو سونے کا معمولی زیور بھی گھر میں رکھ دیا جاتا ہے اور یہ محترمہ مانگے کا نکلس پہن رہی تھیں۔ انھوں نے سوچا ہوگا یہ سیدھی سادی حبیب ضیاء، نکلس لے تو لوں، واپسی کے لئے بہانہ تیار...... ریل میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا!! حبیب ضیاء اتنی بھی مروت والی نہیں کہ جان بوجھ کر ہزاروں کا نقصان کر لے۔ بیچاری پڑوسن! اس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔

پیٹ پوجا

دم کا مرغ، بھونی ہوئی کلیجی، تلا ہوا دل، گردے، بھیجہ حلال جانور کا، تلی ہوئی مچھلی، کولڈ فش، بھنی مچھلی، مچھلی کے کباب، جھینگے، گائے، اونٹ، خرگوش، تیتر، بٹیر، ہرن، بہت سے خوبصورت حلال پرندوں کا نرم گوشت اور نہ جانے کیا کیا.............. یہ مرغوب غذائیں ہیں۔ جی میری نہیں! باذوق لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔ کچھ بھی کھا لیتے ہیں، بہت کھاتے ہیں پھر بھی جی نہیں بھرتا۔ دعوتوں میں نظارے تو دیکھے ہی ہوں گے۔ میں بڑی بدذوق ہوں۔ یہ سب کچھ نہیں کھاتی۔ صرف بکرے کا گوشت، کم مقدار میں، اچھا پکا ہوا، قیمہ، کباب، کوفتے وغیرہ کی شکل میں، سبھی ترکاریاں اور بس۔ میری غذا شروع ہی سے کم ہے، یہ نہ سمجھئے کہ اب کم ہوگئی ہے۔ ناشتہ میں ایک اوسط روٹی، ۱۱ بجے چائے، دوپہر میں تھوڑے چاول، ۵ بجے چائے، پھر ۸ بجے رات کا کھانا۔ کبھی چاول یا کبھی صرف دو چھوٹے پھلکے۔ رات دس بجے ایک پیالی دودھ۔ بہت سے لوگ غذا دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ توفیق صاحب اور میں کبھی کسی کے پاس جاتے تو کھانے پر اصرار کر کے لوگ کہتے آپ جیسے مہمان روز بھی آجائیں تو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ میوہ البتہ پابندی سے کھاتی ہوں۔ فصل کے سبھی میوے پسند ہیں۔ خشک میووں میں کاجو، اخروٹ، باہر سے آئے ہوئے نمکین پستے، بادام بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پابندی سے کھایا کرتی ہوں۔ دعوتوں میں میٹھے دسترخوان کی زینت ہوتے ہیں۔ آج کل زیادہ ہی۔ اس معاملے میں بھی شروع سے ہی ''ہوکا'' نہیں رہا۔

اچھا میٹھا، تھوڑی مقدار میں۔ تین تین میٹھے کٹوری بھر بھر کر کبھی نہیں کھائے۔

برکت ہی برکت!

اکثر لوگ سنجیدگی سے کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں برکت ہے۔ مشاہدے کے بعد وہ اس نتیجے پر ہیں۔ آج کل میرے پاس رینو کا نامی ۱۵ سالہ لڑکی کام کرتی ہے۔ کبھی میں اسے ایک ناپ چاول بگونے میں ڈال کر دے دیتی ہوں کہ دھو کر چولھے پر رکھ دے۔ کھانا پکنے کے بعد وہ انتہائی تعجب سے کہتی ہے بی بی! اتنے ہی چاول میں گھر میں پکاؤں تو بہت کم ہوتے ہیں۔ میں اسے حیران دیکھ کر کہتی ہوں کہ میں اللہ کا نام لیتی ہوں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتی ہوں۔ پھر اسے سمجھاتی ہوں کہ اوپر والا تو سب کا ایک ہے۔ میں اللہ کا نام لیتی ہوں۔ تم بھی بھگوان کا نام لیا کرو۔

۱۹۹۵ء میں عمرہ کے لئے توفیق صاحب کے ساتھ جدہ گئی تھی۔ ہم لوگ اپنے بیٹی داماد عفت افتخار کے گھر میں مقیم تھے۔ بیس دن قیام رہا۔ افتخار نے انتہائی تعجب سے کہا ماں! چاول جیسے کے ویسے ہیں آپ کے ہاتھ میں برکت ہے...... یہ اللہ کی مہربانی ہے اس کے نام کی برکت ہے۔ آپ بھی اس طریقہ کو اپنائیں، انشاء اللہ برکت ہی برکت ہوگی۔ یا برکت اللہ یا رحمت اللہ بھی پڑھا کرتی ہوں۔ بڑے فائدے ہیں، فضیلت ہے۔

○ ○ ○

مشاغل

مجھے پھول بہت پسند ہیں خصوصیت سے گلاب، موتیا اور چنبیلی۔ پڑھائی کے ساتھ میں پودوں کی دیکھ بھال کرلیا کرتی...... صحن کے ایک وسیع احاطے میں، میں نے دیسی گلاب کا تختہ لگا دیا تھا۔ باہر سے آنے والے کئی گز کے فاصلے سے ہی پھولوں کی خوشبو محسوس کرتے۔ گلاب میں کانٹے بہت ہوتے ہیں لیکن ان سے نباہ کرنا مجھے آتا ہے۔ ایک دن میں نے گلاب کے پھولوں اور کلیوں کو گِننا شروع کیا۔ تین سو تک گِننے کے بعد رُک گئی۔ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ چنبیلی اور موتیا کے بھی بہت سے پودے اور بیلیں تھیں۔ پھول زمین پر گرتے تو فرش سا بچھ جاتا۔ مائکے سے سسرال آئی، اتفاق سے توفیق صاحب کو بھی باغبانی کا بے حد شوق تھا۔ گلاب انھیں بھی پسند تھے۔ بالانگر میں آئی۔ ڈی۔ پی۔ ال گیسٹ ہاوز منیجر تھے۔ فیکٹری کا گھر تھا جس کا صحن بہت بڑا تھا۔ ہم نے کئی پودے اور درخت لگائے۔ یہاں گلاب کی دیکھ بھال اچھی ہوسکتی تھی۔ ہمارے پاس ۸۰ قسم کے گلاب تھے کئی نایاب قسمیں بھی ہم نے منگوائی تھیں بعض پھول طشتری کی سائز کے بھی ہوتے۔ اکثر لوگ راستے سے گزرتے ہوئے کچھ رُک کر پھولوں کو دیکھنے لگتے۔ حیدرآباد کی بڑی نرسریوں کے علاوہ مدناپور سے بھی گلاب کے پودے آتے۔ توفیق صاحب ان پودوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے۔ کئی دن پہلے سے گملے تیار کرکے رکھتے۔ میں کبھی گلاب کا گلدستہ بنا کر ویمنس کالج لے جایا کرتی۔ پرنسپل صاحبہ گلاب کی بڑی شوقین تھیں۔ چار بجے گھر جاتے وقت وہ پھول گھر لے کر چلی جاتیں۔ پرنسپل روم میں جو بھی لکچررس آتیں۔ وہ بے اختیار گلاب کی تعریف کرتیں۔

مجھے بچپن ہی سے پکوان سے دلچسپی ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد شوقیہ کوئی چیز پکایا کرتی۔ گھر میں پکانے کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ماما ضرور ہوتی لیکن چونکہ شوق تھا اس لئے اپنی والدہ ہی سے میں نے کئی قسم کے پکوان سیکھ لئے۔ روزانہ پکنے والے سالن، دال وغیرہ کے

علاوہ کئی قسم کے میٹھے، حلوے سب بنالیتی ہوں۔ گھر میں ماشاءاللہ دس بھائی بہن اور امی پپا تھے دو تین ملازمین بھی رہتے۔ جب بھی کوئی چیز پکتی، بڑے پیانے پر تیار کی جاتی۔ پورن پوری، گاجر کا حلوہ، کدو کا حلوہ، پڈنگ، آئس کریم، کھیر، پوریاں، ناریل کے لوز، روے کے لوز غرض کہ بے شمار چیزیں بنتیں۔ قریبی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے پاس بھی بھیجی جاتیں۔ اب میں اپنے گھر میں خود پکاتی ہوں۔ پکانے والیوں سے تشفی نہیں ہوتی۔ ایک تو لاپروائی دوسرے ان کی عدم صفائی، اللہ کا احسان ہے کہ اپنا کام خود کرسکتی ہوں۔

پکوان کے علاوہ پینٹنگ، اون کا کام، سلائی، کروشیا، چمکی پوت، مسالے کا کام سب میں نے سیکھا۔ چھپائی والی لکڑی کی مہریں بازار میں دستیاب تھیں۔ پکا رنگ منگوا کر اس سے مختلف قسم کے چھاپے دسترخوان وغیرہ پر ڈالا کرتی۔ یہ سب کام امی کی نگرانی میں ہوتا دونوں بہنوں نے بھی سیکھا۔ نور جہاں چھوٹی تھی، لاڈلی بھی تھی۔ کبھی گھر کا کچھ کام کرنے کہتے تو پھٹ سے جواب دیتی۔ آپا کی شادی ہوجانے دو بعد میں کام کروں گی۔ اب یہی نور جہاں ماشاءاللہ سے اپنا اور سب بھائیوں کے گھروں کا خیال رکھتی ہے۔ بڑے اہتمام سے شاندار دعوتیں کرتی ہے اور لذیذ سے لذیذ پکوان خود کرلیتی ہے۔

جس کسی میوے کی فصل ہوتی وہ میوہ کثرت سے گھر میں آتا۔ آم کی فصل میں آم رس پکا کر شیشوں میں بھرا جاتا۔ اسی طرح ترش انار سے شکنجبین بنایا جاتا۔ کھٹے انار کا بہت بڑا جھاڑ ہمارے گھر میں تھا۔ اسی انار سے شربت تیار کرلیتے۔ موسم گرما کی مصروفیات کچھ اور ہی ہوتیں۔ اسکول اور کالجوں کو چھٹی ہوتو ہم امی کی نگرانی میں پاپڑ بڑیاں ڈالتے، کئی کئی دسترخوان اور کشتیاں بھر جاتیں۔ یہ بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ چھوٹے بہن بھائی بھی اس میں شریک ہوجاتے۔ پاپڑ بیلنے کے لئے تو واقعی بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ ذرا مشکل فن جو ٹھیرا۔

سیوئیاں بھی گھر میں بنائی جاتیں۔ اس فن کی ایک ماہر خاتون تھیں جو کبھی کبھار ہمارے پاس پکوان بھی کردیا کرتیں۔ وہ تختے کی سیوئیاں بناتیں۔ ہم بہنیں انتہائی دلچسپی لے کر سیوئیاں جھیلتیں۔

اب میری نواسیاں میرے ساتھ باورچی خانے میں آتی ہیں۔ ایک ایک ڈش دیکھتی ہیں اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ اس طرح کرتی ہیں۔ نانی ماں! آپ نے کتنی عمر سے پکوان شروع کیا۔ کیا آپ کو کھانا پکانا شروع سے پسند ہے؟ آپ نے کس سے سیکھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں انھیں باتوں ہی باتوں میں سمجھاتی ہوں کہ ہر لڑکی کو پکوان آنا ضروری ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں اور چھٹیوں میں باورچی خانے میں آنے کی عادت ڈالیں تو خود بخود ساری چیزیں پکانی آجاتی ہیں۔ میری تینوں نواسیاں چولھے کے پاس آتی ہیں، اور میرے ساتھ بیٹھے بناکر خوش ہوتی ہیں۔ بہت سی چیزیں بنانا سیکھ گئی ہیں۔ پوتی تو کھیل ہی کھیل میں فرضی بریانی، ڈبل کا میٹھا، وغیرہ بھی بنالیتی ہے۔ خود کھاتی ہے مجھے بھی کھلاتی ہے۔

گذشتہ کئی برسوں سے اوپر کے کام کے لئے کوئی ملازمہ ضرور ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے مجھے نوعمر لڑکیاں پسند ہیں۔ خواتین سے میں کام نہیں لے سکتی۔ ان کے بے تکے انداز پسند نہیں۔ ایک کام سے ہٹ کر دوسرا کام کرنے کے لئے جھک جھک کرتی ہیں یا کبھی تیز زبان چلاتی ہیں۔ کسی کے دماغ ساتویں آسمان پر ہوتے ہیں بہر حال میں ٦٨ سال پورے کرنے کے باوجود اپنا کھانا خود پکاتی ہوں توفیق صاحب کھانے کے بڑی شوقین تھے۔ ان کی فرمائش پر یا کبھی بغیر فرمائش کے ہی میٹھے وغیرہ بنالیا کرتی۔ اب ان کے انتقال کے بعد مجھے کھانا پکانے خصوصاً کھانے سے دلچسپی نہیں ان کا انتقال ہوئے ڈھائی ماہ ہوئے ہیں بس زندہ رہنے کے لئے کھاتی ہوں۔

پکانے کے ساتھ ساتھ مجھے گھر کی آرائش اور صفائی سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ جو سامان بیکار دکھائی دیتا ہے یا مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کے کام آجائے گا تو نکال دیتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض خواتین گھر میں ہر قسم کا زاید، بیکار سامان کپڑے لتے، جوتے چپل، پرانے برتن جمع کر کے رکھتی ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کبھی استعمال میں نہیں آتیں جس گھر کے کسی کونے، کسی بالکنی یا مچان پر رکھ دی جاتی ہیں۔ مہینوں، برسوں، بس رکھی کی رکھی۔ دھول سے اٹے ہوئے سامان میں رہنے کی انھیں عادت سی ہو جاتی ہے یہ نہیں سوچتیں کہ اس دھول کا

اثر گھر کے بچوں اور بڑوں پر کیا پڑ رہا ہے۔ بعض بدنیت ہوتی ہیں، تنگ دل کہیئے۔ ایسی خواتین مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ ہاں تو میرا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ صفائی کے علاوہ ماہانہ جائزہ اور پھر سال میں دو تین مرتبہ، گھر کے تمام سامان کا تفصیلی جائزہ لیتی ہوں۔ برتن، کپڑے، جوتے چپل، پرس، تولیے، چادریں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جان پہچان والوں میں کوئی مستحق آجائے تو میں نہیں سوچتی کہ یہ چیز ابھی بہت اچھی ہے میرے کام آنے والی ہے۔ میں بغیر سوچے دے دیتی ہوں۔ دینے کے بعد بڑی خوشی محسوس کرتی ہوں۔

ایک دور تھا مجھے اسٹیل کے برتن بہت پسند تھے۔ کھانا کھانے کے لئے تو ہمیشہ کانچ کی رکابیاں رکھتی۔ نت نئے ڈیزائن کے اسٹیل کے کٹورے، مشقاب، ڈشیں میں نے خریدیں، کئی سال ہوئے اسٹیل کے سارے برتن کام والی بچیوں کو یا کسی اور مستحق کو دے ڈالے۔ پکوان ہونے کے بعد میں چولھے کے پاس صفائی کر کے بہت ہی احتیاط سے دیکھ لیتی ہوں کہ چولھا بند ہے، کھانے کی تمام چیزیں ڈھکی گئی ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد بھی یہی معمول ہے۔

کچرا ہمیشہ پلاسٹک میں باندھ دیا کرتی ہوں۔ اکبر ٹاورس میں جو جمعدارنی آتی ہے وہ اس کچرے کو دیکھ کر بڑی خوش ہوتی ہے کہتی ہے سب سے اچھا کچرا ہوتا ہے۔ کچرے کو اچھا رکھنا کوئی بہت بڑا کام نہیں۔ صرف ذرا سی احتیاط، تھوڑا سا خیال۔ ہر گھر میں پلاسٹک کی تھیلیاں سامان کے ساتھ آتی ہیں۔ کچرے کی باسکٹ میں روزانہ ایک تھیلی لگا دینی چاہیئے۔ اور جوں ہی بھر جائے، باندھ کر علحدہ رکھ کر دوسری لگا دی جائے۔ کچرا تھیلی میں بند رہتا ہے۔ ہر قسم کی صفائی' ساتھ ہی جراثیم اور جھینگروں سے محفوظ۔ بہر حال میری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ گھر صاف رہے۔ فرش کے ساتھ، دروازے، کھڑکیاں بھی صاف کرواتی ہوں۔ دل تو میرا ہمیشہ سے صاف ہی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سمجھتی ہوں۔

اچھی کتابوں کا مطالعہ تو میرا پسندیدہ مشغلہ تھا ہی، مشہور شعرا کے منتخب اشعار یکجا کرنا بھی میرا مشغلہ رہا۔ ایک بات بتانا چاہتی ہوں کچھ دلچسپ بھی ہے۔ مجھے اپنی آنکھیں بہت بھلی

لگتی تھیں۔ آئینہ جھوٹ تو نہیں کہہ سکتا۔ اسی نے بار بار یقین دلایا۔ ایک چھوٹی سی ڈائری میں اپنی تصویر لگائی اور آنکھوں پر کہے گئے اچھے اشعار لکھنے شروع کیے۔ بے شمار اشعار اس ڈائری اور دوسرے کاغذات میں اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ پچاس سال سے زائد وقت گزر گیا۔ کیا دور تھا وہ بھی، بے فکری اور سکون کا۔ اس ڈائری سے چند اشعار نقل کر رہی ہوں۔ ڈائری میں ڈیڑھ سو اشعار ہیں۔ عجلت میں منتخب شدہ اشعار......

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

یاد آتی ہیں یار کی آنکھیں
ساقیا جام دے بھر کے مجھے

چشم ساقی کی وہ مخمور نگا ہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے کھلتے ہوئے پیمانوں کی

کچھ تو پیمانے نوازش کر گئے
کچھ تمھاری بھی نظر چھلکا گئی

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے ترے کافر
تو آج بہت ہم کو سر شار نظر آیا

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو چکے

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیض مر مر کے جیا ہوں

رہا نہ ہوش میں تقویٰ جدھر اٹھیں آنکھیں
بتِ حسین نے غضب کی نگاہ پائی ہے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی
ظالم یہ تیری نگاہ تھی کیا تھی

۱۹۵۲ء کی ایک ڈائری ہاتھ لگی۔ کاغذات میں بہت سے مضامین بھی ملے، کچھ مکمل، کچھ ادھورے، بہر حال اس ڈائری کے اشعار پڑھنے شروع کئے۔ اندازہ ہوا کہ اُس دور میں کچھ عجب رنگ زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ موت، غم، ویرانی، بیزارگی، تنہائی، حسرت، ناامیدی، بے بسی، بے کسی، خودکشی، آنسو، ایسے ہی موضوعات پر بے شمار اشعار ہیں۔ مجھے خود یاد نہیں کہ ان موضوعات سے میری دلچسپی اُس وقت کیوں بڑھ گئی تھی۔ ڈائری میں ۲۶۰ اشعار ہیں۔ کاغذات پر علٰحدہ لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند نمونے......

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

دوست مجھ اجنبی سے بات نہ کر
زیست کو پُرسکون رہنے دے
میں ہوں اس کائنات میں تنہا
اس کا کوئی ثبوت رہنے دے

زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمع آرزو کی لو بڑھا سکتا نہیں

خوشی حاصل نہیں ہے جینے سے ہم کو
ہمیں مرنے کا اپنے غم نہیں ہے

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
اک رمق جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

ہے میرے دل میں بھی یہ تمنا یوں ہی رہوں بے نام و نشاں
اہل جہاں سے دور رہوں اور دور ہوں مجھ سے اہل جہاں

جب کوئی راستہ ملتا نہ دیکھا
نکل کر آنسوؤں نے رہبری کی

نا امیدی، سکوت، تنہائی
اور سورج غروب ہونے کو
اپنی مرحوم آرزوؤں پر
آج جی چاہتا ہے رونے کو

اب میرے حال پہ غم خوار بھی رو دیتے ہیں
وہ اندھیرا ہے کہ انوار بھی رو دیتے ہیں
دل مُضطرب ہی فقط سوز سے معمور نہیں
ساز کے ٹوٹے ہوئے تار بھی رو دیتے ہیں

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں

اب تو چاہتا ہوں کہ اے انتہائے غم
آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

اشعار ڈائری سے لکھتی چلی گئی۔ ایسے لگ رہا ہے سبھی اشعار اچھے ہیں۔ لیکن یہاں قلم کو روکنا ہی پڑا۔ کیونکہ آگے بہت کچھ لکھنا ہے۔ آخری اشعار لکھ دیتی ہوں۔

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و ایجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

زمانہ بڑی تیزی سے گزر گیا۔ یعنی پچاس سال گزر گئے ...... موت آواز دے رہی ہے۔ بہت دور آسمانوں سے نہیں۔ یہیں کہیں قریب ہوگی۔

بمبئی مٹھائی' برف کے لڈو:

ہمارے بچپن میں بمبئی مٹھائی والے گلی گلی پھرتے تھے۔ ایک بڑی لکڑی پر رنگ برنگی، شکر سے بنی مٹھائی لپٹی ہوئی ہوتی۔ ۵ پیسے میں وہ مختلف چیزیں بنا کر بچوں کو دیتا جاتا۔ کسی کے ہاتھ پر گھڑی بنا رہا ہے تو کسی کو گلاب کا پھول، کسی کو بچھو یا کچھ اور چیز۔ انگوٹھی یا چھلہ غالباً مفت میں دیتا تھا۔ بڑی لذیز مٹھائی ہوتی۔ جہاں وہ بیچنے والا آتا بچے اُسے گھیر لیتے۔ برف کے لڈو بھی ہم خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ ٹھیلے پر مختلف رنگوں سے بھرے شیشے ہوتے۔ برف کو

باریک گھس کر کاڑی پر لڈو کی شکل میں لگا دیتا اور من پسند رنگ میں ڈبو کر تھما دیتا۔ سبھی بچے شوق سے کھاتے۔ ہم اپنا دور بھول گئے۔ بچوں کو نصیحت کیا کرتے کہ سڑک کی چیزیں کھلی ہوتی ہیں۔ دھول جمی ہوتی ہے اس لئے ان سے احتیاط کریں۔ ہوسکتا ہے کہ زمانۂ گذشتہ میں آلودگی نہیں ہوگی۔ پاک صاف ماحول میں بنڈیوں پر ہر چیز بکتی۔ قلفی اور آئس فروٹ بھی کثرت سے کھاتے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو یہ چیزیں پسند تھیں۔ قلفی بے حد لذیذ ہوتی تھی۔ آج کل کوئی مشہور کمپنی والے بھی ایسی قلفی تیار نہیں کر رہے ہیں۔ معیار سے زیادہ نفع کی دھن میں لکھ پتی بننا ہر کسی کا شیوہ ہے۔ میں کبھی کبھار وقت نکال کر گھر میں قلفی بنا دوں تو سبھی تعریف کر کے مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ توفیق صاحب تو کہتے تھے کہ بازار میں بھی ایسی قلفی نہیں ملتی۔ یہ ڈینگ بازی نہیں۔ دودھ، کھوا، کارن فلور، الائچی، زعفران، پستہ بادام اور مناسب مقدار میں شکر ڈال کر سلیقے سے کوئی بھی خاتون بنا سکتی ہیں۔ ذرا سی دلچسپی اور محنت کی ضرورت ہے۔

برف کے لڈو گھر میں بھی بہت اچھے بنتے ہیں۔ دونوں بچوں کے اسکول سے آتے ہی یا کبھی تعطیل کے دن میں انھیں بنا کر دیا کرتی۔ کبھی دودھ شکر والے اور کبھی زعفرانی رنگ اور شکر سے بنے ہوئے۔ اب میرے بچے ہنس کر سادگی سے کہتے ہیں کہ آپ گھر میں بنا کر دیتی تھیں لیکن ہم برف کے لڈو اسکول کے پاس بھی کھاتے تھے۔

○ ○ ○

مروت والے مشغلے

ادبی سفر کے بارے میں تفصیل سے بتا چکی ہوں۔تصنیف و تالیف کا ذوق خدائے تعالیٰ کا بڑا عطیہ ہے۔ بہت بڑی دین ہے جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔توفیق صاحب کی اور اس کے بعد میری وظیفہ پر سبکدوشی پر بعض دوست احباب ہم دونوں سے سوال کرتے کہ گھر میں بور ہوتے ہوں گے یا وقت کیسے گزرتا ہے۔ہمیں تو ایسے سوالات پر ہی تعجب ہوتا۔توفیق صاحب بھی زبان وادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھا کرتے۔میری تصانیف کا ذکر کر چکی ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ ادبی محفلوں میں مجھے مدعو کیا جاتا ہے اور کسی شخصیت یا کسی کتاب پر کچھ لکھنے اور سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔زندہ دلانِ حیدرآباد، ادارہ میرا شہر میرے لوگ، محفلِ خواتین، دبستان جلیل ادبی محفل، ادارہ ادبیات اردو شعبۂ خواتین، ادارہ سوغاتِ نظر فلورا سوسائٹی اور دیگر کئی اداروں کی جانب سے منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں، میں نے مضامین سنائے ہیں، تبصرے بھی کرتی رہی۔کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی ہفتہ میں دو تین مضامین سنائے ہیں۔ڈاکٹر لئیق صلاح سے فون پر بات ہو رہی تھی۔اس مصروفیت کا ذکر کر کے انھوں نے کہا اصل میں آپ بہت مروت والی ہیں۔کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتیں۔ اس جملے کو ذہن میں رکھ کر میں نے مروت والے مشغلے کا عنوان دیا ہے۔میں تمام یونیورسٹیز کے صدور پروفیسرس، اداروں اور انجمنوں کے سربراہوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ وہ مجھے مدعو کر کے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کچھ لکھوں، تبصرے کروں، جلسوں میں مضامین پڑھوں اور ساتھ ہی دوسروں کی معلومات سے استفادہ بھی کروں۔ یہاں یادداشت پر چند دانشورانِ ادب کے نام لکھ رہی ہوں۔جن کی شخصیت اور فن پر میں نے مضامین لکھے۔بعض مضامین کتابوں میں شامل ہیں اور بعض جلسوں میں پڑھے گئے۔ یہ فہرست یقیناً ادھوری ہوگی

قارئین سے ادباً گذارش ہے کہ معاف فرمائیں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب عابد علی خاں، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، بلقیس علاء الدین، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، مومن خاں شوق، یوسف یکتا، کویتا کرن، ڈاکٹر حمیرا جلیلی، ڈاکٹر رشید موسوی، عزیز انساء صبا، نسیمہ تراب الحسن، فاطمہ تاج، افروز سعیدہ، مظفر انساء ناز، عظمت عبدالقیوم، آر بانو، طیب انصاری، شاغل ادیب، رشید الدین، عباس متقی، صغریٰ ماہر، صفیہ انکولوی، صالحہ الطاف، خیرات ندیم، منظور وقار، قطب سرشار، انیسہ سلطانہ، ڈاکٹر مسز سرسوتی راؤ، پروفیسر احمد اللہ خاں، جگجیون لال استھانہ، مجید عارف، رئیسہ محمد، انیس عابد لطفی، الحاج شکور بیگ، انباجی راؤ، سیما فریدی، ریحانہ بیگم، راحت سلطانہ۔ چند عنوانات لکھ رہی ہوں جن پر میں نے مضامین لکھ کر سمینار میں پڑھے یا رسالوں میں شائع ہوئے۔

معراج العاشقین کا مصنف، غالب کے خطوط میں طنز وظرافت، اکبرالہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری، دکنی مثنویوں میں حروف ربط، حیدرآباد میں طنز ومزاح کے فروغ میں خواتین کا حصہ، الفاظ اور ان کا غلط استعمال، تعلیم نسواں کی اہمیت، علامہ اقبال، شاد اور حیدرآباد، محمد قلی کی پیاریاں، دکن میں اردو نثر کا آغاز وارتقاء، دکن میں ریختی کا ارتقاء، قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی مثنویاں، اس کے علاوہ دیگر کئی موضوع ہیں، جن پر وقتاً فوقتاً میں نے اظہار خیال کیا۔ گذشتہ کئی برسوں سے آل انڈیا ریڈیو سے مضامین نشر ہوتے ہیں ٹی وی پر مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔

اسی طرح میری ادبی خدمات کو سراہنے، حوصلہ افزائی کرنے کے لئے مختلف انجمنوں اداروں کی جانب سے شاندار پیمانے پر تہنیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ ادارہ شگوفہ، محفل خواتین، ادارہ میرا شہر میرے لوگ، سوغات نظر کے علاوہ جن لوگوں نے کتابوں پر تبصرے کئے، اپنی قیمتی آرا لکھ بھیجیں۔ خطوط کے ذریعہ تنقیدی، تحقیقی اور طنزیہ مزاحیہ مضامین کو سراہا اس کی بھی

طویل فہرست ہے۔ یادداشت سے چند نام یہاں لکھ رہی ہوں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ، برق آشیانوی، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر اشرف رفیع، جیلانی بانو، رفیعہ منظور الامین، نجمہ نکہت، طیبہ بیگم، مصطفیٰ شروانی، رشید قریشی، صلاح الدین نیر، شاغل ادیب، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر مسعود سراج، پروفیسر شفیقہ فرحت، پروفیسر محمد حسن، خواجہ احمد فاروقی، خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر مجید بیدار فاطمہ تاج، ڈاکٹر حمیرا جلیلی، ڈاکٹر اقبال جہاں قدیر، شہاب ثاقب، ڈاکٹر صبیحہ نسرین پروفیسر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، میر حسن، رئیس اختر، مومن خاں شوق، فاطمہ عالم علی، نواب زاہد علی خاں، ڈاکٹر صادق نقوی، محمد برہان حسین، نہپال سنگھ ورما، عبدالرحیم خاں، ڈاکٹر سید عبدالمنان، پروفیسر قادری بیگم، سید اکرم حسین، محمد سلیم (ہندی ملاپ) منظور احمد منظور، پروفیسر مسعود حسین خاں، نسیمہ تراب الحسن، ڈاکٹر بانو سرتاج، پروفیسر سیدہ بشیر النساء، ڈاکٹر جمیل جالبی، جاوید عزیز، احسن علی مرزا، عارف مجاہد، اے بی رشید، عتیق اقبال، سید موسیٰ کاظم، پرویز یداللہ مہدی، ڈاکٹر اہلیا مشرا۔

مشاغل اور بھی ہیں۔ جی ہاں مشغلہ ہی سمجھئے۔ کسی خاتون کی کوئی کتاب میرے مطالعہ میں آتی ہے اور اتفاق سے کتابت کی غلطیاں ملتی ہیں تو مطالعہ کے ساتھ ساتھ میں کتابت کی غلطیوں کو نوٹ کرنا شروع کر دیتی ہوں۔ قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کتاب ہی میں الفاظ کے نیچے لکیریں کھینچنا شروع کر دیتی ہوں۔ اگر میں صرف پڑھنا چاہوں تو ناممکن نظر آتا ہے۔ کتابت کی غلطیاں جتنی زیادہ ہوں اسی قدر میری الجھن بڑھتی جاتی ہے۔ اولین فرصت میں انھیں فون کر کے ان کے علم میں یہ بات لاتی ہوں کہ آگے اس کا خیال رکھیں تاکہ ادبی شہرت میں کمی نہ ہونے پائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس تنبیہ میں میرا خلوص شامل رہتا ہے اس لئے وہ برا نہیں مانتی ہوں گی۔ قواعد اور املا کی غلطیاں بھی میرے پیش نظر رہتی ہیں۔ ایسا کرنے پر میں مجبور ہوں۔

○ ○ ○

میں اور میری مزاح نگاری

میں واضح کر چکی ہوں کہ زمانۂ طالب علمی ہی سے طنز و مزاح کی جانب طبیعت مائل رہی، وقتی موڈ میں بھی کبھی کچھ لکھ دیا کرتی، ۱۹۵۶ء کالج کے زمانے میں لکھے گئے دو تین مضامین کاپی میں محفوظ ہیں۔ اللہ میاں کے نام ایک خط، اور میں کیا سوچ رہی ہوں، ایسے ہی چند اور عنوانات پر تقریباً پچاس سال قبل مضامین لکھ کر میں نے اپنے اساتذہ سے داد تحسین وصول کی تھی۔ انجمن زندہ دلان حیدرآباد نے ہندوپاک کے طنز و مزاح کے ہزاروں شائقین سے میرا تعارف کرایا۔ زندہ دلان حیدرآباد ہی کے زیر اہتمام منعقدہ جلسے میں آج سے ۳۵ سال قبل میں نے جو مضمون سنایا تھا وہ ہے۔ بچہ باہر گیا ہے۔ یہ مضمون ہندوستان اور پاکستان میں بے حد پسند کیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مجھے بھی بہت پسند ہے کیوں کہ کسی بڑے جلسے میں پڑھا جانے والا یہ پہلا مضمون ہے۔ اس مضمون کو پسند کرنے، داد دینے، حوصلے بڑھانے والے سینکڑوں اصحاب و خواتین ہیں۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین کے پہلے مجموعے گوئم مشکل میں یہ مضمون شامل ہے، چونکہ یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہر قاری تک یہ مضمون پہنچ جائے۔ اس کی ایک ہی ترکیب تھی وہ یہ کہ سوانح عمری کے کسی حصہ میں اسے جگہ دی جائے۔ اسی خیال سے اسے دوبارہ شائع کر رہی ہوں، میرے مضامین کے تین مجموعے بفضلِ تعالیٰ مقبول ہوئے۔ تیسرے مجموعے جو مژگاں اٹھایئے کی رسم اجرا جناب زاہد علی خان کے ہاتھوں انجام پائی۔ صدارت بھی انہیں کی تھی۔ اس کامیاب جلسے کے مقررین محترمہ فاطمہ عالم علی، پروفیسر مجید بیدار اور ڈاکٹر مصطفےٰ کمال تھے۔ تسنیم جوہر نے نہایت عمدگی سے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ سیاست گولڈن جوبلی ہال اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا تھا۔

دوسری کتابوں کی رسم اجرا کی تقاریب بھی شاندار پیمانے پر ہوئیں۔ اردو ہال شائقین طنز و مزاح سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوپاک کے بھی

باذوق خواتین وحضرات نے میرے مضامین کو سراہا۔ خصوصاً حیدرآباد کی تقریباً تمام ادبی انجمنوں کے سربراہ میرے مضامین دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ محفلِ خواتین، دبستانِ جلیل شعبۂ خواتین اور ادارۂ ادبیات اردو شعبۂ خواتین سے وابستہ اور مدعو مہمانان وصدور بڑے اشتیاق سے مضامین سنتی ہیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ میری شفیق استاد اور محسن ہیں ابتدا ہی سے میری حوصلہ افزائی کرتی ہیں پروفیسر سیدہ جعفر، محترمہ لکشمی دیوی راج، محترمہ رفیعہ منظور الامین، محترمہ جیلانی بانو نے شخصی ملاقاتوں میں یا جلسوں میں پسندیدگی کا اظہار کیا۔

میرے بعض مضامین کو خواتین نے بے حد پسند کیا۔ تکیہ کلام کئی خواتین کے علاوہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید مرحومہ کا پسندیدہ مضمون رہا میں نے ایک مضمون لکھا تھا ''دعوت، میزبان اور ہم'' ڈاکٹر اشرف رفیع نے کہا کہ یہ مضمون نصاب میں رکھا جانا چاہئے۔ اس مضمون میں میں نے دعوتوں میں ہونے والی غیر شائستہ حرکتوں، میزبان کی لاپروائی اور ایسے ہی موضوعات پر قلم اٹھایا تھا۔ پکوان کے غیر معیاری ہونے اور خواتین کی لوٹ مار کا ذکر کر کے میں نے لکھا تھا کہ اب ہم تین قسم کے لفافے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ مضمون سبھوں کو پسند آیا۔ عزیز النساء صبا، مظفر النساء ناز اور فاطمہ تاج کہا کرتیں کہ جب بھی کوئی دعوت نامہ آتا ہے ہم ایک دوسرے کو فون کر کے پوچھ لیتے ہیں کہ کونسا لفافہ رکھیں گے۔ بیگم سرور بابو خاں بہت ہی سادگی اور اپنائیت سے ملتی ہیں محفلِ خواتین میں مدعو ہوں تو میرے مضامین پر فراخ دلی سے داد دیتی ہیں، بیگم عطیہ نورالحق قادری، قمر جمالی، فریدہ زین، نور آمنہ، پروفیسر قادری بیگم، پروفیسر بدر تقی خان ان سبھوں نے بھی ہمیشہ میرے مضامین کو سراہا۔

پروفیسر سیدہ بشیر، ڈاکٹر رشید موسوی، سعدیہ مشتاق، ڈاکٹر فرزانہ حمید، ڈاکٹر لیئق صلاح ڈاکٹر حمیرا جلیلی، افضل عنایت خاتون، فاطمہ عالم علی اور عابدہ محبوب سے برسوں سے روابط رہے مضامین سنا کر وقتاً فوقتاً ان سے خاصی داد وصول کی۔

محفلِ خواتین میں شرکت کرنے والی سبھی خواتین میری مزاح نگاری کی معترف ہیں۔ جی کھول کر توصیفی کلمات سے نوازتی ہیں۔ نسیمہ تراب الحسن، اطہر بانو، فریدہ راج، نسیم

نیازی، ثریا امین مرزا، شبینہ فرشوری، عزیزہ محبوب، رئیسہ محمد، صفیہ شاہین، افروز سعیدہ، اسریٰ عمر، نصرت ریحانہ، مشرف شہر یار کاظمی، منیر طیب انصاری، حنا شہیدی، اطہری فضا، تنویر الطاف، خالدہ بسم اللہ خاں، شاہانہ غوث، تسنیم جوہر، ثریا جبین، عارفہ بسم اللہ خاں، ریاض فاطمہ، سیدہ مہر، عاصمہ عثمانی، انور حیدر الدین، اودیش رانی، میمونہ مسعود، فاطمہ پروین، فاطمہ سرحدی رفعت سلطانہ، کس کس کا ذکر کروں ان سب کی محبت اور خلوص ہی کی بناء پر میں نئے نئے موضوعات پر لکھتی ہوں اور محفلوں میں سناتی ہوں۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ ادبی محفلوں میں مضامین پر داد دینے والی خواتین اور حضرات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ عموماً میرے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی ہے بلکہ شکایت ہے کہ میں کم گو ہوں، یہ میری فطرت کا تقاضا ہے جو لوگ مجھے زمانہ طالب علمی سے جانتے ہیں وہ گواہ ہیں کہ اس وقت بھی کم ہی بات کرتی تھی۔ میرا قلم بولتا ہے کیا یہ کافی نہیں؟

○ ○ ○ ○

بچہ باہر گیا ہے

اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چار مینار سگریٹ کی بجائے ڈن ہل کا قیمتی پیکٹ دیکھیں تو کھٹ سے یقین کر لیجئے کہ اس گھر کا کم از کم ایک بچہ ضرور باہر گیا ہے یہ تو صرف پہلی علامت ہے۔ دوسری اور بہت ساری علامتیں ہیں جن سے اس متعدی مرض کی شناخت بہ آسانی ہو سکتی ہے۔

ایک جگہ ہم کافی عرصے کے بعد ملاقات کے لئے گئے، دروازہ کھولنے پر جو لڑکی آئی وہ زمانۂ گذشتہ میں چھینٹ کا کرتا اور سفید پاجامہ پہنا کرتی تھی، اب جو دیکھا تو چمک والی میکسی زیب تن کئے ہاتھ میں ٹو ان ون لئے کھڑی تھی، رونا لیلیٰ کی ٹیپ کی ہوئی غزل کا کباڑہ کرتے ہوئے بے سُری آواز میں ساتھ خود بھی گا رہی تھی۔ آیئے کہتے ہوئے اس نے ہمیں صاف ستھرے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے ایک رنگین تصویر تھما دی جو اتفاق سے ہماری ہی تھی اور اُسی وقت لی گئی تھی۔ وضاحت طلب کرنے پر جواب ملا جی! یہ آٹو میٹک کیمرے کا کمال ہے۔ میرے چھوٹے بھائی ڈہران سے لائے ہیں، ابھی ہم آٹو میٹک کیمرے کے کمالات سن کر دنگ ہونے والے ہی تھے کہ صاحبِ خانہ میلے بلاوز پر اجلی چائنا سلک کی ساڑی پہنے ہوئے برآمد ہوئیں جو انہوں نے اسی وقت تبدیل کی تھی۔ کچھ دیر ہم سے بات کر کے وہ اشاراتی زبان میں بچی کو کچھ کہتی ہوئی باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی لڑکی دوسرے کمرے میں گئی، دو منٹ بعد کمرے سے ہوائی جہاز کے ٹیک آف کرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے پوچھا کمرے میں ایرپورٹ ہے کیا؟ اس پر لڑکی تعجب سے بولی آپ اتنا بھی نہیں جانتیں؟ یہ مسالہ پیسنے کی مشین کی آواز ہے۔ منٹوں میں مسالہ پس کر نکل جاتا ہے۔ بڑے بھائی دوبئی سے لائے ہیں۔ اتنے میں ماں نے پکارا بیٹی! گرائنڈر جلدی سے لے آؤ مجھے دو الائچیاں پیسنی ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو الائچیاں گرائنڈر کے منہ میں

ڈالیں اور ایک منٹ میں الائچی کا پوڈر ہتھیلی میں ڈال کر دکھانے لگیں، دیکھئے! کس قدر باریک ہوگیا ہے۔ واقعی پوڈر بہت باریک تھا ہمیں نظر ہی نہ آیا۔

ایک جگہ ہمیں کھانے پر مدعو کیا گیا تھا، جاتے ہی حسبِ عادت ہم باورچی خانے میں گھس گئے۔ سِل بٹے کے پاس خلافِ توقع گھر کی بچی کی بجائے میدانِ جاپان کی نقلی مہر لگی وولی کی ساڑی پہنے ایک کافر ادا ماما مسالہ پیس رہی تھی۔ قریب جاکر دیکھا تو مسالہ ایک دم سفید تھا۔ ہم نے مالکن کو رائے دی کہ پھلی ٹھیک سے بھونی نہیں گئی۔ بگھارے بیگن کا سالن لذیذ نہ ہو سکے گا۔ اس پر ابتدا میں وہ صرف مسکرائیں۔ ہماری پیٹھ پر پوری طاقت سے ہاتھ جمایا، بڑی سائز کا قہقہہ لگا کر پان کی پیک ہمارے کپڑوں پر اچھالی، جب اطمینان ہوگیا کہ کافی چھینٹے پڑ چکے ہیں تب انہوں نے قہقہے کو بریک لگا کر حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور بولیں نادان! یہ پھلی نہیں بادام ہیں بادام! میرے منجھلے لڑکے نے جدہ سے بھیجے ہیں بگھارے بیگن میں بادام سن کر ہم ان کی قسمت پر رشک اور اپنی آنکھوں میں اشک لاکر سوچنے لگے اللہ! اللہ! کیا انتر ہے ہمارے اور ان کے معیار زندگی میں۔ یہاں بیگن کو بادام کا پرہیز ہونے کے باوجود اس کے پیٹ میں پسے ہوئے بادام زبردستی ٹھونسے جارہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ڈاکٹر کی سختی سے تاکید کے باوجود بادام کھانے کی بجائے بادام کا ایسنس سونگھا کرتے ہیں۔

غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ جب کوئی دیارِ غیر میں مرجاتا ہے تو اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ ہم بھی اس اصطلاح سے واقف ہیں۔ لیکن غائبانہ ختنہ کے پھول اور غائبانہ کھیر چٹائی کا دعوت نامہ دیکھ کر ہم انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ ریاض میں نواسے کی ختنہ ہوئی، حیدرآباد میں ارمان نکالے گئے، نانا پھول پہنے حریرہ روٹی کھاتے ہوئے روپے سمیٹ رہے تھے۔ کویت میں پوترے کی پیدائش ہوئی حیدرآباد میں دھوم سے کھیر چٹائی کی گئی، دادا لیٹے کھیر چاٹ رہے تھے۔

باہر جاکر آنے والوں کو دکاندار بھی خوب سمجھ گئے ہیں۔ لاڈبازار کے کڑے والے، گلزار حوض کے مارواڑی خوش آمدید کہنا سیکھ گئے ہیں۔ ایک دن ہم کڑے لینے کے لئے لاڈ

بازار کی ایک دکان پر گئے۔ باہر سے آنے والا ایک خاندان چار سو روپے کے کڑے آٹھ سو روپے میں خرید کر چوڑیاں پہنانے والی کو دس روپے ٹپ دے کر واپس جارہا تھا۔ جگمگاتے، خوبصورت کڑے شوکیس کے اوپر ہی رکھے ہوئے تھے۔ جوں ہی ہم نے دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا دکاندار نے جھپٹ کر کڑے اٹھالئے اور بولا آپ نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینہ میں؟ اتنے میں کڑے والے کی چمچی نے اپنے ٹپ میں سے ایک روپیہ ہمارے ہاتھ میں تھمادیا، دھکا دے کر سیڑھیوں سے نیچے اتارتے ہوئے بولی جاؤ اماں! آگے جاؤ، یہ بیوپار کا وقت ہے۔

بچے باہر جارہے ہیں۔ شیخوں کی طرح خوب کمارہے ہیں۔ ماں، باپ، بہن، بھائیوں کا سہارا بن گئے ہیں یہ سب ٹھیک ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض بچے شیخوں کی سی عادتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یعنی وہی..... ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا، ٹی وی کی طرح بیوی ذرا پرانی ہوئی کہ اُسے پھینک دینا اور خوب سے خوب تر مال کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔ ایک صاحب خیر سے ایک بیوی کے شوہر اور سوا دو بچوں کے باپ ہیں۔ اچانک انہوں نے اعلان کر دیا، میں دو شادیاں اور کروں گا۔ ایک بیوی اور اس کے گنتی کے چند بچے میری دولت خرچ نہیں کر سکتے۔ چالیس سال کی عمر میں انہوں نے دوسری مرتبہ سہرا باندھا، پرانی بیوی کو حیدرآباد میں پٹک کرنئی کو سعودی عرب لے کر چلے گئے، چند دنوں بعد وہاں کے شیخوں کی دولت پر جو اس کی نظر پڑی، یہ خود ساختہ شیخ اس کی آنکھوں سے اتر گئے۔ ایک ماہ بعد اطلاع آئی کہ سابقہ بیوی اور بچوں کی ہائے ہائے مکمل طور پر انہیں لگ گئی۔ نئی بیوی رسی تڑا کر جو بھاگی تو اصلی شیخ کے گھر جا کر ہی اس نے دم لیا۔ لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آئے ہیں۔ عموماً کئی خاندان آسودہ حال ہو گئے ہیں۔ جن گھروں میں بکرعید میں مرغی بھی نہیں کٹتی تھی۔ اب نام بہ نام بشمول نوکرانی چھ چھ بکرے کاٹے جارہے ہیں۔ لوگ یوں بھی کاج کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے ہیں۔ چھوٹے موٹے کاج بھی ہوں تو گھر کو سجایا جاتا ہے۔ گھر کے باہر لگے رنگ برنگی برقی قمقمے جھلمل کرتے ہیں گویا اپنی زبان سے کہہ رہے ہوں دیکھو تو یہ شان! اس گھر کا ایک بچہ باہر گیا ہے۔

باہر کے یہ کرشمے دیکھ کر ہمارے بھی منہ میں پانی آیا۔ ہمارا تیرہ سالہ لڑکا جواب تک ہمارے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے۔اس سے مخاطب ہوکر ہم نے کہا، بیٹا! تو کب باہر جائے گا، لاکھوں کمائے گا، مماں بابا کے لئے بلڈنگ...... ہماری بات کاٹتے ہوئے اس نے بگڑ لہجے میں کہا زیادہ گڑ بڑنیئں کرنا مماں، باہر بھجوانے کا نام لئے تو آج سے اسکول جانا بند۔...... لائے نوالہ۔نوالہ پورا کر کے بچہ خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے آئے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر انہوں نے پوچھا، آپ کا بچہ کہاں ہے؟ ہم نے سر اونچا کر کے فخریہ انداز میں کہا، بچہ باہر گیا ہے، گلی ڈنڈا کھیلنے!!

○ ○ ○

ملازمت

۱۹۵۹ء میں، میں نے جامعۂ عثمانیہ سے اُردو سے ایم۔اے کیا۔ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ ملازمت کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ میرے والد محکمۂ تعلیمات سے وابستہ تھے۔ انھوں نے بعد میں ایک اسکول کھولا تھا جس میں ایک یا دیڑھ سال میں نے بھی ان کے ساتھ پڑھایا۔ بہت کم عرصہ میں بڑی تعداد میں بچوں نے داخلہ لیا۔ اسی اثناء میں ماہر دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے مجھے دکنی زبان کی قواعد لکھنے کا کام دیا۔ ماہانہ دو سو روپیے بطور اسکالرشپ ملا کرتے۔ اس زمانے میں دو سو روپیوں کی بڑی اہمیت تھی۔ والد کہتے میری بیٹی کی پڑھائی کا خرچ کچھ بھی نہیں۔ بی۔اے میں بھی اسکالرشپ ملتا تھا۔ بہرحال دکنی زبان کی قواعد لکھنے کے لئے میں نے بہت محنت کی۔ موضوع سے دلچسپی تھی اس لئے بہت کم عرصہ میں یہ کتاب مکمل ہوگئی۔ مسودہ پر ڈاکٹر زورؔ نے لکھ دیا تھا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہندی میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ میں نے ہندی میں ترجمے کا کام بھی شروع کردیا۔ کتاب کی اشاعت شروع ہوئی۔ ابتدائی چند صفحات پڑھنے کے بعد مجھے شبہ ہوا کہ کتابت کی غلطیوں سے قطع نظر مواد میں بہت غلطیاں ہیں۔ میرے پاس موجود مسودے سے مقابلہ کیا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ مواد بدل دیا گیا ہے۔ خصوصاً اشعار کی جو مثالیں تھیں وہ بالکل غلط تھیں۔ متعلقہ لوگوں سے ربط پیدا کیا گیا۔ ان اصحاب نے توجہ نہیں دی۔

کتاب کے ایک ہزار نسخے تیار تھے۔ جلد بندی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیلؔ کے کہنے پر درخواست دینی پڑی کہ اس صورت میں کتاب میرے نام سے شائع نہ کی جائے۔ دراصل ڈاکٹر زورؔ نے غلام رسول صاحب سے کہا تھا کہ ایک نظر مسودے کو دیکھ لیں۔ انھوں نے مسودے کو ایک نظر کیا دیکھا، سارے مواد ہی کو بدل دیا۔ انھیں اپنی قابلیت پر شاید بہت بھروسہ تھا۔ قتیلؔ صاحب اس کتاب کے نگران کار تھے وہ پورا مواد اچھی طرح پڑھ چکے تھے۔

ذمہ دار اصحاب نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے مسودہ غائب کردیا......اور کہہ دیا کہ غلطی تو ڈاکٹر جانسن سے بھی ہوسکتی ہے۔ اسی دوران ڈاکٹر زورؔ کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ۱۹۶۳ء میں جو کتاب چھپ چکی تھی وہ پریس میں دھری رہ گئی۔ ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ یہی کتاب ۱۹۶۹ء میں کراچی سے دوبارہ شائع ہوئی۔ اللہ کے فضل سے ادبی حلقوں میں کافی پسند کی گئی۔ جو ذہنی اذیت پہنچی میں اُسے بھول نہیں سکتی۔ ویسے میں زیادہ گفتگو یا بحث نہیں کرسکتی تھی بلکہ مختلف اصحاب سے بات کرنا میرے لئے بڑا مسئلہ تھا۔ ساری کارروائی میرے والد کے دوست جناب محمد صدیق نے کی۔ بہت دوڑ دھوپ کی۔ ساری بحث، دلائل اور اُن اصحاب کی غلطیوں کی نشان دہی کے لئے مباحثہ انھوں نے ہی کیا۔ جن اصحاب نے مولوی غلام رسول کی تائید کی ان میں ایک بہت ہی نیک اور پارسا بھی تھے۔ مذہب کے پابند، اللہ تعالیٰ معاف کرے، لیکن بار بار میرے ذہن میں یہی سوال ابھرتا ہے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں۔

ایم۔اے کرنے کے بعد مجھے ملازمت کے کافی مواقع تھے۔ لیکن میرا ذہن ملازمت کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی کہ بس شوقیہ پڑھ رہی ہوں۔ میرے استاد محترم، ڈاکٹر حفیظ قتیل نے والد کو خط بھیجا کہ ورنگل میں آپ کی لڑکی کو بہ حیثیت لکچرر ملازمت مل سکتی ہے۔ مگر میں نے سرے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد بدرو کا کالج کا ذکر کیا۔ میرے رویہ پر قتیل صاحب سخت ناراض ہوئے انھوں نے کہدیا ''نالائق ہے۔ اتنا پڑھ کر ملازمت کرنا نہیں چاہتی، میں تو اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی، یوں بھی ملازمت کے نام ہی سے مجھے خوف ہوتا تھا، ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔ اس دوران میں نے پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کرلی۔

۱۹۶۷ء میں اورینٹل اُردو کالج میں انٹرویوز ہونے والے تھے۔ قتیل صاحب نے پھر بطور خاص لکھ بھیجا کہ وہاں ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل ہیں اور ان کے بھائی بدیع حسینی لکچرر ہیں، بہت مہذب آدمی ہیں۔ اس طرح قتیل صاحب کے مسلسل اصرار اور توجہ دینے سے میں نے انٹرویو دیا اور ملازمت مل گئی۔

۲۳ر ستمبر ۱۹۶۷ء میری ملازمت کا پہلا دن تھا۔ کالج کے ان دنوں کو یادگار کہہ سکتی ہوں۔ سوچئے! میں نے کس طرح مخلوط تعلیم والے کالج میں نوکری شروع کی ہوگی۔ پڑھائی کے زمانے میں یونیورسٹی میں اساتذہ سے کم سے کم گفتگو کرتی۔ یوں کہیئے کہ فطرتاً مجبور تھی۔ تو ان حالات میں پڑھانا اور وہ بھی لڑکوں کو۔ لڑکوں کے ذکر پر کہنا ضروری ہے کہ لڑکیاں اور شادی شدہ خواتین تو میرے لئے مسئلہ نہیں تھیں لیکن چونکہ ایوننگ کالج تھا، لڑکوں کے ساتھ مجھ سے عمر میں بہت بڑے اصحاب بھی کلاس میں ہوتے۔ ایم۔ اے لینگوئجس کی کلاس میں پڑھانا تھا۔ ایک تو پڑھانے کی عادت نہیں تھی دوسرے عمر رسیدہ لوگوں کی صورتیں۔ میں نے گھر ہی سے تیاری کرلی تھی۔ اُردو ناول کے آغاز اور ارتقاء پر کچھ مواد نوٹ بھی کرلیا۔ ڈائری سامنے رکھ لی اور پڑھاتے وقت حسب ضرورت اس پر نظریں جمارہی تھی۔ جوں ہی میں ڈائری پر نظر ڈالتی شاگرد صاحبان اپنی نشست سے کچھ اُٹھ کر ڈائری دیکھنا چاہتے۔ بڑی مصیبت کا دور تھا۔ آزمائشوں کا دور تھا۔

ایک دن ایم۔ اے لینگوئجس کی کلاس تھی۔ چار پانچ طلباء بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب، اونچے پورے وارد ہوئے۔ سوٹ میں ملبوس تھے۔ میں نے اُٹھ کر ادب سے انھیں سلام کرلیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ میرے شاگرد تھے۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ ابتدا سے آخر تک مجھے کسی دور میں طالب علموں نے ستایا نہیں۔ سب عزت واحترام سے پیش آتے۔ یہ میرے لئے بہت بڑی بات ہے، بہت بڑا اعزاز ہے۔

جناب صلاح الدین نیر جو مجھے استادنی ماں کہتے ہیں وہ اسی لئے کہ ایم۔ اے۔ ایل کی کلاس میں وہ ایک مرتبہ آئے تھے صرف ایک ہی دن۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ اور یونیورسٹی سے دوسرے اصحاب کالج کے معائنے کے لئے آئے تھے۔ بس اسی دن سے میں نیر صاحب کی استادنی ہوں۔ میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ نیر صاحب میرا بہت احترام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم اور پروفیسر رحمت یوسف زئی بھی میرے لائق شاگرد ہیں۔

بہر حال میں نے پڑھانا شروع کیا، بہت محنت کی۔ بعض مضامین بہت مشکل تھے۔ تصوف، ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اور ایسے کئی موضوعات تھے۔ ابتدائی تیاری کے لئے میں نے پروفیسر بدیع حسینی سے مدد لی۔ میں بالکل عار نہیں سمجھتی تھی کہ کسی سے کچھ پوچھوں۔ ورنہ بعض لوگ معلومات کی کمی ہو تو سرسری گزر جاتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے دیانت داری سے پڑھایا۔ اورینٹل کالج کی پہلی کلاس انٹرنس عثمانیہ ہوتی ہے۔ اس میں ایسے طالب علموں کو داخلہ دیا جاتا ہے جنھوں نے صرف ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہو۔ اس میں طلبا اور طالبات دونوں ہوتے۔ ہر عمر، ہر معیار کے۔ دوسرے اور مضامین کے ساتھ ابتدا ہی سے میں قواعد اُردو بھی پڑھایا کرتی۔ دکنی زبان کی قواعد لکھنے کے بعد قواعد اُردو ازبر ہوگئی تھی اور دلچسپ بھی معلوم ہوتی تھی۔ جبکہ دوسروں کے لئے انتہائی خشک مضمون تھا۔ قواعد میں ایک باب الفاظ کی تذکیر و تانیث کا ہوتا ہے۔ بعض الفاظ تک آ کر میں پریشان ہو جاتی تھی کہ کس طرح انھیں پڑھوں اور پھر پڑھ کر سمجھاؤں۔ بھانڈ، بھڑوا، ہیجڑا، رنڈوا، اور ایسے کئی الفاظ جنھیں تذکیر و تانیث کی مثالوں کے لئے قواعد میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں ان صفحات کے آتے ہی بچوں سے کہہ دیتی فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک چھوڑ دیجئے۔ یہ امتحان میں نہیں پوچھتے! ۔ کبھی ہمت کر کے ان صفحات کو پڑھ دیا کرتی جب کہ کلاس میں بڑی عمر والے لڑکے نہیں ہوتے۔ یا صرف طالبات ہوتیں۔ اب ہنسی آتی ہے اور شرمندگی بھی ہوتی ہے کہ میں کیوں ڈرتی تھی۔ بعد میں تو سب کچھ پڑھانے کی عادت ہوگئی تھی۔ اُردو شاعری میں کیا نہیں ہوتا! اللہ تعالیٰ کا لاکھ احسان ہے کہ یہ دور گزر گیا۔ میں نے کبھی کوتاہی نہیں کی، لاپروائی سے کام نہیں لیا۔ وقت کی پابندی میرا اصول تھا۔ یہ بڑی آزمائشوں کا دور تھا۔ گھر سے کالج تقریباً سولہ کیلومیٹر دور تھا۔ جب میں نے نوکری شروع کی، توفیق صاحب کے پاس اسکوٹر نہیں تھی۔ گھر سے بس اسٹاپ تک کافی دور پیدل جانا ہوتا۔ بالا نگر سے رانی گنج سکندر آباد، وہاں سے کچھ دور پیدل جا کر دوسری بس لبرٹی تک۔ وہاں سے پھر سیکل رکشہ کے ذریعہ اُردو

ہال حمایت نگر، میری ملازمت تو تھی صرف تین گھنٹوں کی لیکن آنے جانے کے لئے کئی گھنٹے درکار تھے۔ میں اپنی تعریف نہیں کر رہی ہوں۔ صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے اپنی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن اور ڈاکٹر حسینی شاہد میرے محسن ہیں۔ ان معزز ہستیوں نے میرا ہر طرح خیال رکھا۔ میں جس راستے سے کالج آتی وہ بڑا سنسان تھا۔ بوئن پلی، سکھ ولیج اور ایسے کئی محلے تھے جہاں آبادی برائے نام تھی۔ بعض جگہوں پر تو کئی کیلو میٹر تک صرف کھلے میدان ہی تھے۔ شاہد صاحب نے اس کا خیال رکھتے ہوئے میرا ٹائم ٹیبل اس طرح بنانے کی اجازت دی تھی کہ مسلسل ۲ تا ساڑھے آٹھ بجے کلاس لے کر واپس چلی جاؤں۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ مجھے واپسی میں اُردو ہال سے پیدل جا کر سیکل رکشہ لینا ہوتا وہاں سے پھر بس کے ذریعہ رانی گنج۔ آئی۔ ڈی۔ پی۔ ال۔ کالونی جانے کے لئے آخری بس سوا نو بجے تھی۔ اس کے بعد کوئی بس نہیں ہوتی۔ میں رانی گنج پہنچ کر اُس مخصوص ڈرائیور یا کنڈکٹر کا چہرہ دور سے دیکھ کر اطمینان کی سانس لیتی۔ اُدھر توفیق صاحب بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرتے۔ چند سال ایسے گزر گئے۔ پھر اسکوٹر آ گئی۔ یہ ضروری بھی تھی اس لئے کہ تلنگانہ تحریک کی وجہ سے بسیں نہیں چلنے لگی تھیں اور دشواریاں بڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد سے ۱۹۸۴ء تک ہمارا یہ معمول تھا کہ دونوں کالج آتے۔ توفیق صاحب مجھے کالج پہنچا کر کبھی لائبریری چلے جاتے۔ کبھی میری خالہ صاحبہ یعنی بیگم ڈاکٹر محمد یوسف مرزا، فرسٹ آر۔ ایم او دواخانہ عثمانیہ کے گھر چلے جاتے۔ کبھی کچھ وقت اسٹاف روم میں اساتذہ کے ساتھ گزارتے اُس وقت جناب بدیع حسینی انچارج پرنسپل، اور اساتذہ میں انگریزی کے لکچرر جناب ٹی۔ وی۔ راؤ ہندی کے جناب بھیم راؤ جادھو اور اُردو کے اساتذہ میں میرے علاوہ جناب موسیٰ کاظم صاحب اور جناب اکرم حسین تھے۔ فارسی کی استاد ڈاکٹر ذکیہ سلطانہ تھیں۔ ان اساتذہ کی میں شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمارا ہر طرح سے ساتھ دیا، بعد میں موسیٰ کاظم صاحب پرنسپل بنے۔ اس طویل عرصے میں مجھے بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کرنے اور آزمائشوں سے گزرنے کا سلیقہ دے دیا تھا۔ میں اسی طرح بلند حوصلہ سے کام کرتی رہی۔ جاڑوں کے موسم میں واپسی میں ناقابلِ برداشت سردی رہتی تھی۔ ہم دونوں گرم کوٹ، دستانے، ٹوپی، شال وغیرہ ساتھ رکھتے توفیق صاحب Monkey Cap استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُردو ہال سے نکل کر گلی کے موڑ پر تھے۔ ایک اسکوٹر پر دو لڑکے جا رہے تھے۔ اُدھر سے آواز آئی۔ دیکھ! دیکھ! ایک اور Monkey جا رہا ہے۔ اس جملے سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ بارش کے موسم میں طوفانی ہواؤں اور شدید بارش کا مقابلہ کرنا ہوتا۔ یہ ہمارا معمول بن گیا تھا۔ واٹر پروف پہن کر تیز بارش ہی میں کالج سے نکل جاتے۔ ایک دفعہ بارش کے ساتھ زوردار بجلی چمک رہی تھی۔ راستے میں کوئی گھر، کوئی سہارے کی جگہ نہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی۔ مرنا تو ایک دن سبھی کو ہے لیکن ہم دونوں ایک ساتھ ختم ہو جائیں گے تو دونوں چھوٹے بچے بے سہارا رہ جائیں گے۔ بہر حال اس دور سے گزر گئے۔ فاصلوں کے علاوہ سڑکیں بے انتہا ناقص تھیں۔ تھکان ہو جاتی تھی۔ ہم اس کے عادی ہو گئے تھے۔ نانی ماں، امی کی حقیقی پھوپی محترمہ امیر فاطمہ صاحبہ بے حد خلوص والی تھیں وہ میلوں کا راستہ طے کر کے ہمارے گھر آتیں۔ وہ کہتیں حبیب کے گھر کا راستہ ایسا ہے معلوم ہوتا ہے کوئی برتن میں جامن پھٹک رہا ہو۔ آٹو کے دھکوں سے وہ نڈھال ہو جاتیں۔ میرے جو بھی رشتہ دار بالاگر آتے، حوصلے اور ہمت کی داد دیتے کہ کس طرح ملازمت کے لئے جدو جہد کرتی ہوں۔

امتحان خواہ اورینٹل کالج کے ہوں یا اُردو آرٹس ایوننگ کالج کے، بحیثیت نگران کار تمام اساتذہ کو بلایا جاتا۔ اس کام کو ملازمت کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ اور بات ہے کہ بیس روپیے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ وقت پر پہنچنے کے لئے مجھے آٹو سے جانا ہوتا، چالیس روپے خرچ ہوتے۔ لیکن میں نے کبھی انکار نہیں کیا، بہانہ نہیں بنایا کہ بچے چھوٹے ہیں یا مجھے دور سے آنا پڑتا ہے۔ اُردو آرٹس ایوننگ کالج کی ایک خاتون لکچرر اس کام کو عیب سمجھتی تھیں امتحان کا ٹائم

نبل ملتے ہی وہ ڈاکٹر سید عبدالمنان کا سرٹیفکٹ پیش کر دیتیں۔ پروفیسر حبیب الرحمن غصے سے آگ بگولہ ہو جاتے چہرہ سرخ ہو جاتا۔ وہ کہتے حبیب ضیاء کو دیکھئے، بالا نگر سے آتی ہیں۔

میں نے اپنی کتابوں میں جناب بدیع حسینی کی قابلیت کا کھلے ذہن سے اعتراف کیا ہے۔ مہذب، ہمدرد انسان بھی ہیں۔ میں اور توفیق صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ آج بھی میں ان کی اتنی ہی عزت کرتی ہوں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، بعض دفعہ بدیع صاحب کا رویہ ایک دم سے تلخ ہو جاتا۔ ساتھی اساتذہ سے کیسی گفتگو کرنا چاہئیے وہ نہیں سوچتے تھے۔ چند باتیں ہیں جنھیں میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔ جب بھی سوچتی ہوں بے حد ملال ہوتا ہے۔

ہمارا یہ معمول تھا کہ پانچ بجے گھر سے کالج کے لئے روانہ ہو جاتے۔ لیکن بعض دفعہ بے قاعدہ ٹریفک یا کسی وجہہ سے کالج پہنچنے میں پانچ دس منٹ دیر ہو جاتی ایسا بہت کم ہوتا۔ بہر حال ایک دن کا واقعہ ہے جسے میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتی۔ ہوا یوں کہ اسٹاف روم پہنچتے ہی میں نے گھڑی دیکھی۔ چھ بج کر چودہ منٹ ہوئے تھے۔ کالج اُردو ہال کی دوسری منزل پر تھا۔ میں نے الماری میں کتابیں رکھیں۔ بازو ہی چھوٹا کمرہ بدیع صاحب کا تھا وہ اپنے متبنیٰ بچے ابراہیم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بچے کی طبیعت خراب ہے۔ میں نے بدیع صاحب کو سلام کیا پھر پوچھا صاب! بچے کی طبیعت کیسی ہے؟۔

سلام کا جواب ایک طرف، بدیع صاحب نے غصہ سے بھری آنکھیں اوپر کیں۔ تیز لہجے میں کہا، وقت کی پابندی کیجئے ڈاکٹر صاحب۔!! اُس وقت میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پایا صبر و ضبط سے کام لے کر اسٹاف روم میں بیٹھ گئی۔ یہ ۲۰۰۲ء ہے۔ برسوں پہلے کی بات ہوئی لیکن میں بدیع صاحب کی وہ آنکھیں اور ان کے ترش لہجے کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ خاص بات یہ کہ اس دن ۶ بجے سے میری کلاس بھی نہیں تھی۔

ایک اور واقعہ ہے جو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کالج کے سالانہ امتحانات چل رہے تھے۔ بی۔ اے لینگوئجس کا پرچہ تھا۔ امتحان ہال میں جانے سے قبل طلبا و طالبات

کے پرس اور جیبیں ٹٹولی جاتی ہیں۔ بدیع صاحب لڑکوں کے ذمہ دار تھے۔ لڑکیوں کے پرس میں نے دیکھ کر انھیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ وہ دور تھا جب بعض طالب علم بے خوف و خطر نقل کر کے کامیاب ہونے پر فخر کرتے تھے بعض مہذب بھی تھے۔ امتحان شروع ہوا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ایک طالب علم جو تین سال کے پرچے ایک سال میں مکمل کر رہا تھا اور جسے موسیٰ کاظم صاحب نے Three in One کا نام دیا تھا۔ اپنے Long Boots میں سے چٹھیاں نکال نکال کر اطمینان سے لکھنے لگا۔ بدیع صاحب چونکہ لیڈر قسم کے بچوں سے ڈرتے تھے اُسے دیکھ کر بھی انجان رہے۔ طلبا و طالبات بھی اس کی حرکت پر نظریں رکھتے تھے۔ بدیع صاحب مدبرانہ انداز میں آگے بڑھے۔ ٹہلتے ہوئے ایک برقع پوش بچے والی خاتون کے پاس گئے۔ جوابی بیاض کے نیچے ایک چٹھی ملی وہ چٹھی اس نے اپنی کمر میں چھپا کر رکھی تھی۔ برقع تو میں اتروا نہیں سکتی تھی۔ بہر حال اُسے ضبط کر کے حاکمانہ، ترش اور تلخ لہجے میں مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔

یہ آپ چلنگ کئے تھے ڈاکٹر صاحب! امتحان ہال میں ان کا اس طرح خطاب کرنا وہ بھی ایک مہذب خاتون سے، انتہائی غلط۔ غیر شائستہ تھا۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ ہال سے باہر آ کر چار سطری استعفیٰ لکھ کر حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس بھیج دیا اور گھر چلی آئی میری طبیعت بگڑ گئی۔ اس دن میں بہت روئی۔ میری محنت کا یہ صلہ، پھر طالب علموں کے سامنے ایک ساتھی لکچرر سے اس طرح کی ترش گفتگو ناقابلِ برداشت تھی۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ تمام طالب علموں نے احتجاج کیا۔ دو اخباروں میں اپنے بیانات بھی دیئے۔ حبیب الرحمٰن صاحب اور شاہد صاحب نے مجھے بلوایا۔ حبیب الرحمٰن صاحب اُردو ہال میں واقع اپنے گھر میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے سمجھایا اپنا استعفیٰ واپس لیجئے۔ آپ حکومت کی ملازم ہیں ان کی نہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک اخبار میں بچوں کے احتجاج کی خبریں خاص طور سے اشاعت سے روک دی گئیں۔ توفیق صاحب نے بھی مجھے بہت سمجھایا کہ ایسے لوگوں کی بات کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ میری

حوصلہ افزائی کرتے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ غیر متعلق باتوں کی پرواہ مت کرو۔ تلخ حقیقتوں کا ذکر چل پڑا۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب کے نواسے کی شادی تھی۔ دونوں کالجوں کے تمام اساتذہ اور آفس کا عملہ مدعو تھا۔ بدیع صاحب سینئیر استاد ہونے کے ناطے ان کے مشوروں پر سب عمل کرتے تھے۔ اُس دن کے لئے بدیع صاحب نے کہا کہ دوسرے دن آکر سب دستخط کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ کالج کی گیٹ کے سامنے سے شادی خانہ گئے لیکن میں نے دستخط نہیں کی۔ دوسرے چند اساتذہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن جب میں نے دستخط کرنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا آفس میں ارشاد صاحب رجسٹر لئے بیٹھے تھے۔ انھوں نے روک کر کہا پہلے کل کا تصفیہ ہونا ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ بدیع صاحب نے سب کو منع کر کے خود دستخط کردی۔ میرا دماغ پھر گیا۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غصہ بہت کم آتا ہے اور جب آتا ہے تو کسی کے باپ کو نہیں مانتی۔ اُس دن کا غصہ ایسا ہی تھا۔ میں قلم پرس میں رکھ کر سیدھے شاہد صاحب کے پاس آئی۔ الف سے لے کر والسلام تک ایک ہی سانس میں سارا واقعہ بیان کردیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں مسلسل بولے جارہی تھی، آپے سے باہر تھی اور شاہد صاحب خاموشی سے سن رہے تھے۔ جب انھیں موقع ملا تو کہنے لگے کیا کرنا بھئی، انوں بیمار ہیں، میں نے اپنے اُسی غصہ بھرے لہجے میں کہہ دیا بیمار ہیں تو علاج کرایئے۔ شاہد صاحب چاہتے تو مجھے ڈانٹ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے۔

باتیں بہت ہیں۔ لکھتی چلی جاؤں تو موضوع طویل ہو جائے گا۔ ۱۰ر فروری ۱۹۸۳ء اورینٹل کالج کے اساتذہ کو دی گئی ایک نوٹس ہے۔ کاغذ پرانا ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے زیراکس کر کے محفوظ کرلیا تھا کہ کام آنے والی چیز ہے۔ کالج کے منتظم جناب ارشاد علی خاں کے الفاظ ہیں۔ اس وقت کے معتمد اعزازی کی دستخط کے ساتھ ملی۔ من وعن نقل کررہی ہوں۔

پرنسپل صاحب اورینٹل اردو کالج کی رپورٹ مورخہ ۴ر فروری ۱۹۸۳ء سے واضح

ہے کہ:

الف: چند لکچرر صاحبان واضح ہدایات کے باوجود رجسٹر حاضری میں واپسی کی دستخط سے انکار کررہے ہیں۔

ب: رجسٹر حاضری میں طلباء کے ناموں کا اندراج کرنے سے انکار کررہے ہیں اور حاضری بھی نہیں لے رہے ہیں۔

ج: یوم جمہوریہ کے موقع پر ذریعہ نوٹس مورخہ ۲۵/جنوری ۱۹۸۳ء حسب معمول جھنڈا وندن کے موقع پر جمیع اسٹاف ممبرس کو ۹ بجے حاضر رہنے کے لئے ہدایت دی گئی تھی۔ لیکن اس کی بھی خلاف ورزی کی گئی اور چند اساتذہ غیر حاضر رہے، و نیز ۲۸/جنوری ۱۹۸۳ء کو غیر حاضری کی وجوہات دریافت کرنے پر کسی قسم کا جواب نہیں دیا۔ پرنسپل صاحب نے مکرر ایک نوٹس بتاریخ ۴/فروری ۸۳ء کو ادائی جواب کے لئے بھجوائی لیکن ان لکچرر صاحبان نے نوٹس لینے سے انکار کیا تاریخ ہذا سے اندرون ایک ہفتہ وضاحت کی جائے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیوں گریز کیا گیا۔

معتمد اعزازی
اورینٹل اردو کالج

پڑھ لی آپ نے نوٹس، الفاظ پر، انداز تحریر پر، دھمکیوں پر غور کیا ہوگا۔ کیا کسی کالج کے اساتذہ کو ایسی نوٹس سے سابقہ پڑا ہوگا۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ بہر حال چپراسی کے ذریعہ کاغذ کے یہ پرزے، جی ہاں پرزے ہی کہوں گی، سب کو دئے گئے۔ اس سے قبل ''ادائی جواب'' کا جو ذکر ہے اس کا بھی دلچسپ قصہ ہے۔ چپراسی نے نوٹس پڑھ کر دستخط کرنے کے لئے کہا کیونکہ اُسے حکم تھا۔ اس وقت موسیٰ کاظم صاحب سب کے گرو تھے۔ انھوں نے کاغذ دیکھ کر واپس کردیا۔ چپراسی نے کہا! صاحب دستخط کرنے بولے۔ کاظم

صاحب نے اُکھڑے لہجے میں اُسے یہ کہہ کر واپس کیا۔ جاؤ نہیں کرتے بولو!! تو..... نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدمزاجی، چڑچڑاپن، غصہ، میں پن، حکومت جتانے کا ناشائستہ جذبہ۔ یہ انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے۔ عزت مانگنے سے نہیں ملتی۔ اپنے رویہ، برتاؤ، شفقت سے ملتی ہے۔ جس کا ڈر تھا وہی ہوا، وظیفہ کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی وظیفہ لے کر چلے گئے۔ واضح رہے کہ کالج کے جتنے بھی معتمدین رہے وہ سب اساتذہ سے شفقت سے پیش آتے۔ یہ نوٹس تو کارگزار پرنسپل اور منتظم صاحب کی طرف سے تھی۔

کالج کے اساتذہ کے بارے میں مختصراً کہنا چاہوں گی کہ سبھی قابل تھے، ذمہ داری کو جانتے ہوئے پوری توجہ سے پڑھاتے۔ جناب بدیع حسینی ماہر دکنیات تھے۔ بہت ہی قابل۔ میں جتنی عزت شاہد صاحب کی کرتی، اتنی ہی ان کے بھائی کی بھی۔ ان ہستیوں کا اب بھی میں احترام کرتی ہوں۔ شاہد صاحب نے کالجوں کے استحکام کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

اورینٹل کالج کی ملازمت کا دور ۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۴ء ہے۔ میں نے اس پورے عرصہ میں پرنسپل صاحب، ساتھی اساتذہ یا طلباء کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ذمہ داری کا احساس ہمیشہ رہا۔ میری پوری کوشش یہ ہوتی کہ طالب علموں پر فرداً فرداً توجہ دوں۔ بی اے لینگویجس کی ایک طالبہ پڑھائی میں بہت کمزور تھی۔ الفاظ کا صحیح املا بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا فلاں لکچرر کہہ رہے ہیں تم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکوگی۔ وہ بے حد مایوس تھی۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے اُسے ہمت دلائی، لکچرر صاحب کے لئے چیلنج تھا۔ روزانہ اس کو دو صفحہ لکھ کر لانے کے لئے کہتی۔ ایک ایک لفظ کی تصحیح کرتی جاتی۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ اس قابل ہوگئی کہ الفاظ اور جملوں کی تراکیب کو صحیح لکھ سکے اس نے کافی محنت بھی کی اور بی اے کی ڈگری آخرکار مل گئی۔ ایسے کئی طالب علموں سے میں نے زائد کام لکھنے کا کروایا۔ شخصی توجہ دیتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ تعلیم میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔

اورینٹل کالج میں لائبریری نہیں تھی کوئی ایسا بجٹ نہیں تھا کہ لائبریری قائم کی جاسکے۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ سرمایہ کی فراہمی کے لئے میں نے بارہ روپے کے آدھا کیلو کاجو خریدے۔ انھیں تل کر سلیقے سے پیکٹ بنائے۔ کالج کے اساتذہ اور طالب علموں نے خرید لئے۔ چوبیس روپے بن گئے۔ اس کے بعد تمام اساتذہ اور طلباء و طالبات نے ساتھ دیا۔ بعض طلباء ماہانہ ایک روپیہ بطور امداد دینے لگے۔ تاج آئس کریم سے تعلق رکھنے والے تجمل، لفافے میں پانچ روپیہ رکھ کر بہت ہی احترام سے دیا کرتے۔ میں ایک کاپی میں اس رقم کا اندراج کرتی جاتی۔ کچھ رقم جمع ہوجاتی تو کتابیں خریدی جاتیں۔ اس طرح لائبریری قائم ہوگئی۔ میں اس کالج کے شاندار مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔ اب بھی کوشش ہے کہ لائبریری کے لئے کچھ کتابیں بطور عطیہ دوں۔

اورینٹل کالج کے طالب علموں کے علاوہ اردو آرٹس ایوننگ کالج کے طلباء بھی عزت واحترام سے پیش آتے۔ بعض دفعہ ہماری اسکوٹر ستانے کے موڈ میں ہوتی۔ توفیق صاحب کو دیکھتے ہی نصرت محی الدین اور عادل فوراً آجاتے اور اسکوٹر اسٹارٹ کر کے ان کی پریشانی دور کرتے۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں، بہت سے واقعات ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔

۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۵ء تک میں نے یونیورسٹی کالج فار ویمن جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ پوسٹ گریجویٹ کالج بشیر باغ اور جامعہ عثمانیہ میں بھی پڑھایا۔ ویمنس کالج کا پورا دور اللہ کے فضل و کرم سے انتہائی پرسکون، خوشگوار اور شاندار رہا۔ شاندار ان معنوں میں کہ ہر سال نتائج اچھے رہے۔ کئی طالبات نے ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کئے۔ تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی کالج کا نام روشن کیا۔ ایم اے کے لئے ۸۰ نشستیں تھیں۔ ۳۰ عثمانیہ یونیورسٹی میں ۳۰ پوسٹ گریجویٹ کالج اور ۲۰ ویمنس کالج میں۔ گولڈ میڈل ان تمام طالب علموں میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے کو دیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مسلسل دو سال ویمنس کالج کی طالبہ ہی نے لیا۔ ایک دفعہ کسی طالبہ نے

پروفیسر مغنی تبسم کے حوالے سے کہا صاحب پوچھ رہے تھے۔ آپ لوگ میڈل کیسے لے رہے ہیں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہہ دیا مغنی صاحب سے کہنا میڈم پڑھ کر پھونک دیتی ہیں! ذہین طالب علم تو ہر کالج، ہر زمانے میں ہوتے ہی ہیں۔ میرا طریقۂ کار یہ ہوتا کہ امتحان سے تین ماہ قبل یا کبھی ابتداہی میں ذہین طالبات کو زائد وقت دیا کرتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زائد کلاس لی جائے۔ میں جب بھی پاکستان جاتی، وہاں سے تنقیدی اور تحقیقی ادب کا خاصا سرمایہ سمیٹ کر لے آتی۔ ظاہر ہے کتابیں میرے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی حفاظت بھی مجھے کرنی ہوتی۔ قابلِ اعتبار طالبات کو میں یکے بعد دیگرے کتابیں گھر لے جانے کے لئے دیتی جاتی۔ مواد اکٹھا کرنے کا طریقہ سمجھا دیتی۔ طالبات کلاس کے بعد وہیں بیٹھ کو نوٹ کرلیتیں۔ اس طرح ان ذہین لڑکیوں کو سبقت لیجانے کے زرین مواقع ہاتھ آتے۔ اکثر میڈل ان ہی طالبات نے حاصل کئے۔ میرے ساتھی اساتذہ کا ہمیشہ تعاون رہا۔ سبھوں نے اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔

ویمنس کالج میں ایم اے کی جماعتوں کا آغاز ہوا تو ابتدائی دور میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر اکبر علی بیگ، پروفیسر عقیل ہاشمی، پروفیسر غیاث متین، پروفیسر رفیع رؤف، پروفیسر بیگ احساس نے جز وقتی خدمات انجام دیں۔ طالبات کے لئے باعث فخر ہے کہ انہیں ایسے قابل اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ پروفیسر افضل الدین، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر تاتار خاں، ڈاکٹر عثمان علی، ڈاکٹر شکور، پروفیسر ابوالفضل محمود قادری صاحب سے مختلف اوقات میں جامعہ عثمانیہ اور پی جی کالج میں گفتگو کے مواقع ملے۔ ڈاکٹر شاذ تمکنت صرف ایک دن ویمنس کالج آئے، اُس وقت وہ علیل تھے۔ ویمنس کالج کا اشاف یہ ہے پروفیسر اختر شاہ خاں، پروفیسر محمد علی اثر، ڈاکٹر میمونہ وحید، ڈاکٹر فاطمہ پروین، ڈاکٹر عطیہ سلطانہ اور ڈاکٹر صبیحہ نسرین، میری خوش قسمتی ہے کہ ملازمت

کے پورے دور میں ان اساتذہ کا مکمل تعاون رہا، عزت واحترام بھی ملا۔ کبھی کسی مسئلے پر کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہوا۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے پروفیسر انورالدین، پروفیسر محبوب حسین اور پروفیسر رحمت یوسف زئی کی نگرانی میں تحقیقی مقالوں کی تکمیل کے بعد بھی بہ حیثیت ممتحن مجھے مدعو کیا۔ سمینار میں بھی مجھے اپنے تحقیقی مقالے پڑھنے کا موقع ملا۔ اس طرح تمام جامعات کے اساتذہ سے عزت واحترام ملا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ میں گروپ بندیوں سے دور بھاگتی ہوں۔ باتیں کم کام زیادہ اس مقولہ پر عمل کرتی ہوں۔ پرسکون ماحول چاہتی ہوں اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ مجھے ویمنس کالج کی ملازمت کے دوران کوئی پریشانی یا ذہنی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک دور ایسا بھی رہا کہ تقررات نہ ہونے کی وجہ سے بی اے کی جماعتوں کے لئے جزوقتی اساتذہ کی خدمات لی گئیں۔ ڈاکٹر فریدہ وقار، ڈاکٹر رضیہ رقیہ، ڈاکٹر ریحانہ پروین، ڈاکٹر سیدہ بہاالدین، شفیعہ قادری شہناز وقار، ساجدہ بیگم اور قمر سلطانہ نے کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وقت مقررہ پر یہ اساتذہ آتے اور مقررہ نصاب کی تکمیل کرتے۔ ورنہ بعض شعبوں میں دیکھا گیا کہ اساتذہ اپنے ساتھی اساتذہ اور شعبہ کے صدر سے الجھتے ہی رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی شکایت، نیچا دکھانے کی کوشش بہت کچھ ہوتا ہے۔ ویمنس کالج کے شعبۂ اردو میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ملازمت کا یہ دور بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔

ویمنس کالج میں بہ حیثیت استاد میں نے ۱۹۸۴ء میں قدم رکھا۔ مجھے طالب علمی کا وہ دور یاد آ گیا جب کسی استاد سے ملنا ہوتا تو ڈرے ڈرے، رکے قدموں سے اسٹاف روم کی جانب رخ کرتی۔ باہر ٹھہر کر متعلقہ استاد کا انتظار کرتی۔ یہاں خصوصیت سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ زینت آپا جیسے استاد تو لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں۔ آپا میرے زمانہ طالب علمی ہی سے میری حوصلہ افزائی کرتیں۔ حیدرآباد کی باوقار محفل خواتین سے سبھی واقف ہیں۔ بہت عرصہ پہلے آپا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس محفل میں آیا کرو۔ میں نے اپنی

مختلف مصروفیات، شہر سے دوری کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ جلسے میں ایک بڑے جلسے میں مضمون سنانا پڑا اور مارے ہیبت کے پسینے چھوٹ گئے تو آپا کا مشورہ یاد آیا۔ اگر میں اُسی وقت سے محفل خواتین سے وابستہ ہو کر مضامین سنانے لگتی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ ڈر نکل جاتا۔ بہر حال زینت آپا میری محسن ہیں۔ جب کبھی مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، یا آپا سے ملنے طبیعت چاہتی ہے ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔

شعبہ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ بھی میری بڑی عزت کرتے، اسٹاف روم میں سینیر میں ہی تھی۔ شعبۂ فارسی سے وابستہ ڈاکٹر زیب حیدر، ڈاکٹر نجمہ صدیقہ اور ڈاکٹر رفیق فاطمہ میری پر خلوص دوست ہیں۔ ہندی، فارسی، عربی، معاشیات کے لئے ایک اسٹاف روم تھا۔ کالج کے دوسرے سبھی اساتذہ مجھ سے خلوص سے ملتے، وظیفہ پر سبکدوش ہوئے سات سال گزر گئے میری ساتھی اساتذہ اب بھی گھر آتی ہیں۔ اسٹاف روم کی مخلص آیا نور جہاں اور جہانگیر بی مجھ سے بے انتہا خلوص سے ملتی ہیں۔ میرے گھر کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہیں۔ میرے دکھ سکھ میں سب کے ساتھ یہ بھی شریک ہیں۔

آج ۱۴ ردسمبر ۲۰۰۲ء ہے۔ توفیق صاحب کا انتقال ہو کر نو ماہ کا عرصہ ہوا۔ میں اپنی اس کتاب کو ان کی زندگی ہی میں مکمل کرنا چاہتی تھی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ انسان مجبور ہے جو چاہتا ہے کر نہیں سکتا۔ قلم ہاتھ میں لیتی ہوں لیکن کچھ لکھ نہیں پاتی۔ انھوں نے گذشتہ ۳۸ سالوں میں مجھے جو حوصلہ دیا، ادبی حلقوں سے میری وابستگی میں تعاون کیا۔ ان ہی کی وجہ سے میں آگے بڑھتی گئی۔ ادبی دنیا میں شہرت ملی، عزت ملی، سب انھیں کی وجہ سے ہے۔ توفیق صاحب کے انتقال کے بعد میں بکھر گئی ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمت دے حوصلہ دے۔ قلم کا سہارا بڑی نعمت ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت قلم، کاغذ اور کتابوں کے درمیان گزارتی ہوں۔ ابھی شارپ کمپیوٹرس کے مالک مصطفیٰ قاسمی نے فون پر بتایا کہ ساٹھ صفحات مکمل ہو چکے ہیں، لکھ رہی ہوں اور دیتی جا رہی ہوں۔ کسی طرح کتاب مکمل ہو جائے، یہی خواہش ہے۔ اللہ تعالیٰ کو

یقیناً مجھ پر ترس آ ہی جائے گا اور قارئین تک سوانح عمری پہنچ جائے گی۔ مایوسی کفر ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پرامید ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عزائم میں کامیاب کرے گا۔

سانپوں کی اردو دوستی:

ویمنس کالج میں جب میں پڑھتی تھی۔ بندروں کی کثرت تھی۔ اِدھر اُدھر خوب دھوم مچاتے پھرتے۔ کبھی کسی کا پرس غائب تو کبھی کسی کا توشہ دان۔ ایک دفعہ اسٹاف روم سے کسی لکچرر کی پلاسٹک کی تھیلی غائب ہوگئی۔ خالی ہوتی تو کوئی بات نہیں، اسی دن خریدی ہوئی ساڑی بھی تھی۔ سارا شبہ آیاؤں پر کیا گیا۔ ظاہر ہے کافی دھمکیاں دی گئی ہوں گی غریبوں کو۔ بعد میں اسٹاف روم کے سامنے والے بڑے درخت پر ساڑی ٹنگی ہوئی ملی۔ یہ تو تھیں بندروں کی کارستانیاں۔ اسی کالج میں جب پڑھانے کا موقع ملا تو اردو والوں کے کمرے، سانپوں کے اڈے تھے۔ ابتدا میں ایم اے اردو اور تلگو کی کلاسس ہوتیں۔ لیکن پتہ ہی نہ چلا کہ تلگو والے کس وقت دبے پاؤں وہاں سے دوسری طرف منتقل ہوگئے۔ ہوتا یوں کہ کبھی کوئی لکچرر کلاس کی طرف جارہے ہوتے تو سیڑھیوں پر سے سانپ گزر جاتا۔ کبھی کہیں نظر آتا، کبھی کہیں۔ ایک دن ایم اے کی طالبات کلاس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لکچر کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ انھیں سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ جب انھوں نے واقعی کچھ دیکھا تو سہم گئیں۔ ایک حاضر دماغ لڑکی کے کہنے پر سب میزوں پر چڑھ گئیں۔ اتفاق سے ایک نابینا لڑکی بھی تھی جو ہاسٹل میں رہتی تھی۔ بعض وقت وہ کلاس میں تنہا بھی ہوتی۔ بہرحال مجھے جب پتہ چلا تو میں نے پوچھا آواز پر آپ ہوشیار کیوں نہیں ہوئیں تو جواب ملا۔ ہم سمجھے کوئی میڈم آرہی ہیں۔ میں نے ازراہ مذاق ان سے کہا آپ لوگوں نے سمجھا ہوگا کہ سانپ کے روپ میں کوئی میڈم آرہی ہیں۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ جو کمرہ ہمیں دیا گیا ہے وہ ہوم سائنس والوں نے اسی لئے چھوڑ دیا کہ اس میں مستقل ایک بڑا سا سانپ رہتا ہے۔ ایک دن چولھے پر لپیٹا لئے بیٹھا بھی تھا۔ اس کے باوجود ہم شریف اردو والے وہیں پڑھاتے رہے۔ روٹی کا معاملہ جو تھا۔

بحیثیت صدر شعبہ اردو مجھے اپنے شعبہ کے مختلف مسائل کو حل کرنا ہوتا تھا۔ میں نے دبی زبان سے پرنسپل صاحبہ سے ان اردو دوست سانپوں کا حال بیان کیا۔ انھوں نے ہنستے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ کیا جی! یہ اردو والوں کو ہی سانپ دِکھتے؟ چلیے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اردو والوں نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا، وہی کمرے، وہی احاطہ۔ ایک دن ڈاکٹر میمونہ ایم اے کی طالبات کو پڑھا رہی تھیں۔ کلاس ختم ہوئی۔ دروازے کے پاس آنے کے بعد سب کو رک جانا پڑا، کیوں کہ سامنے دو بڑے سانپ پہرہ دے رہے تھے۔ کلاس سے باہر آنے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ سانپ لکچر سن کر جب چلے گئے تو استاد اور شاگرد وہاں سے باہر آئے۔ اس دن میمونہ کو دہشت کی وجہ سے بخار آگیا۔ اتفاق سے اُس دن میں کالج نہیں گئی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے صاف کہہ دیا آپا! میں واں کلاس نئیں لیتا۔ جی ہاں نئیں لیتا!۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو اس احاطے سے چھٹکارہ ملا۔ تین کلاس روم تھے، انتہائی خستہ و تاریک۔ دراصل وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ میں اسے جانکی بائی کا محل کہتی تھی۔ بعد میں مجھے بہت افسوس ہوا کہ اردو دانی کے ان شوقینوں کو کیوں محروم کردیا۔ بہت ممکن ہے وہ اردو پڑھنے کے بہانے ان اشعار کو سننا چاہتے ہوں جن میں مختلف طریقوں سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ دشمن کے لئے ناگ، چوٹی کے لئے ناگن، سانپ کا بچہ سنپولا اور اسی طرح کے کئی استعمال اردو زبان میں ملتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہوں گے آستین کا سانپ کیسا ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ کے فضل و کرم سے ہم ہمیشہ محفوظ ہی رہے۔ طالبات گولڈ میڈل لیتی رہیں۔ کئی ادبی مقابلوں میں حصہ لے کر انعامات حاصل کئے اور کالج کا نام روشن کیا۔ اب پرانی عمارت مسمار کردی گئی ہے۔ شاندار نیا بلاک بن گیا ہے۔ صبر کا پھل میٹھا جو ٹھہرا! یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ میں اپنے مرشد قبلہ کی بتائی ہوئی آیت ریتی پر پڑھ کر کمرۂ جماعت کے تین کونوں میں ڈال دیا کرتی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک کونہ خالی چھوڑ دیا جائے۔ سانپ بغیر نقصان پہنچائے چلا جاتا ہے۔

پریوں کی شہزادی

یونیورسٹی کالج فار ویمن کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ دربار ہال اور اس سے ملحقہ عمارت کافی قدیم ہے۔ شاندار فانوس دربار ہال میں لگے ہوئے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جس کالج میں، میں نے تعلیم حاصل کی عرصہ بعد وہیں مجھے ملازمت کرنے، اپنا علم طالبات میں بانٹنے کا موقع ملا دوران ملازمت ایک عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا۔ اساتذہ وطالبات پڑھانے پڑھنے میں مصروف تھے۔ کچھ طالبات دربار ہال میں گھوم رہی تھیں۔ اچانک کچھ ہلچل ہوئی۔ طالبات اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ کچھ ڈری، سہمی، کچھ ہنستی ہوئی۔ پوچھنے پر ایک آیا نے بتایا کہ ایک عورت کبھی کبھی کالج میں آجاتی ہے۔ خود کو پریوں کی شہزادی کہتی ہے۔ دربار ہال کی دوسری منزل تک جاکر کسی کلاس روم میں ٹہل کر واپس آتی ہے۔ آدھا گھنٹہ اس طرح گزر گیا۔ اس دن میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ایک سال بعد وہ آئی۔ مجھے دیکھنے کا تجسس ہوا۔ دربار ہال کے پاس ٹھیری ہوئی تھی۔ طالبات اُسے دیکھ کر بھاگ رہی تھیں۔ طبیعت چاہی کہ اس سے بات کروں۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے خود بہ خود میرے قدم دربار ہال سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے بات کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ تیز ہوگئی۔ کہنے لگی۔ آپ مجھے باہر کیوں لے جارہی ہیں۔ آپ نہیں لے جاسکتیں۔ میں پریوں کی شہزادی ہوں۔ آپ کون ہیں آخر؟ میں نے ایسے ہی کہہ دیا، میں بھی یہاں کی Queen ہوں۔ اس کی جھلاہٹ بڑھ گئی۔ ساتھ چلتے ہوئے اُسے کالج کی بیچ والی گیٹ تک میں چھوڑ کر واپس آنے لگی۔ بلا مبالغہ کہہ رہی ہوں کہ اُس وقت کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ بغیر کچھ سوچے ہوئے میں نے لاحول پڑھ لیا۔ اسٹاف روم آکر منہ دھو کر کلی کی۔ ایسے معلوم ہوا بدن سے آگ نکل رہی ہے۔ یہ بات میں نے کسی اسٹاف ممبر سے نہیں کہی۔

عربی کی لکچرر ڈاکٹر وجاہت مرحومہ نے یہ بات سن تو فکر مند ہو کر کہنے لگیں۔ آپ نے اُسے چھوا کیوں؟ اس کے پاؤں دیکھئے؟ کپڑے تو نہیں لگے؟ اسی طرح کے سوالات انھوں

نے مجھ سے کیئے۔ وہ کون تھی، کیا تھی، مجھے پتہ نہیں لیکن ایک انوکھا تجربہ ضرور تھا۔ اس واقعہ کو گزرے تقریباً سترہ، اٹھارہ سال گزر چکے۔ میں نے کالج کی آیاؤں اور دوسرے چند اساتذہ سے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ دوبارہ وہ نظر نہیں آئی۔

○ ○ ○

کہیں دیکھا ہے

توفیق صاحب کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ ذخیرۂ الفاظ، محاوروں کا بروقت استعمال، سیاسی، مذہبی، ادبی معلومات غیر معمولی تھیں۔ مگر ایک عرصہ تک علم نہیں تھا کہ وہ صرف ادب دوست، ادب نواز ہی نہیں، اچھے ادیب بھی ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھیں مطالعہ کا شوق تھا۔ شفیق الرحمٰن ان کے پسندیدہ ادیب تھے اس کے علاوہ تمام مشہور ادیبوں کے ناولوں کو انھوں نے پڑھ ڈالا۔ طنز و مزاح سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو انتہائی دلچسپی سے پڑھتے۔ کئی جملے ازبر تھے۔

بہر حال اچانک جب یہ لکھنے لگے تو بڑی خوشی ہوئی۔ کتاب چھپنے کے بعد تو کئی لوگوں نے مبارکباد دی۔ خصوصیت سے لوگ کہتے کہ میاں بیوی دونوں طنز و مزاح لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے جب اپنی کتاب کاغذی ہے پیرہن مجھے دی تو اس پر لکھا مزاح نگار جوڑی حبیب ضیا اور سید رحیم الدین توفیق کے لئے۔ ایک دن ٹی وی پر ایک مذاکرہ کے سلسلے میں مجھے جانا پڑا۔ حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ اور ممتاز مزاح نگار رشید الدین بھی تھے۔ ریکارڈنگ سے واپس ہوتے ہوئے رشید الدین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا آپ غور کرے کی نیں کی، ہندوستان میں آپ اور رحیم صاحب واحد میاں بیوی ہیں جو طنز و مزاح نگار ہیں۔ توفیق صاحب کی کتاب کہیں دیکھا ہے شائع ہوئی تو رسم اجرا کے جلسے میں اردو اکیڈیمی کے صدر جناب نور الحق قادری نے اعلان کیا کہ میں عموماً ادیبوں کی پچاس کتابیں خریدتا ہوں لیکن چونکہ آپ دونوں طنز و مزاح نگار ہیں اس لئے سو کتابیں خرید رہا ہوں۔ اس اعلان سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ظاہر ہے توفیق صاحب نے بھی یہ بات محسوس کی ہوگی کہ لوگ ہم دونوں کے ادیب ہونے کو جان رہے ہیں اور اس کا صلہ بھی مل رہا ہے۔

زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام کہیں دیکھا ہے کی رسم اجرا تقریب شاندار پیانے

پر منعقد کی گئی۔ کتاب کی اشاعت میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا مکمل تعاون رہا۔ تقریب رسم اجرا کے صدر نور الحق قادری صاحب تھے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے رسم اجرا انجام دی۔ مقررین میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، پرویز یداللہ مہدی تھے۔ جناب طالب خوندمیری اور رؤف رحیم نے جلسے کی کارروائی کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ میں نے اس موقع پر اپنے جو مختصر تاثرات بیان کیے یہاں نقل کر رہی ہوں۔ بعض واقعات کا اعادہ بھی ہو سکتا ہے یہ میں ایک جگہ بتا چکی ہوں۔

کتاب اشاعت کے آخری مراحل میں تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہمارے غریب خانہ پر تشریف فرما تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھا۔ مقدمہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، پیش لفظ سید رحیم الدین توفیق، کچھ مصنف کے بارے میں، حبیب ضیاء، کمال صاحب نے کاغذ پڑھ کر ہنستے ہوئے کہا، کچھ مصنف کے بارے میں کی بجائے کچھ ان کے بارے میں اچھا رہے گا۔ بات جی کو لگی۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے واقعی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ابتدائی ملازمت لیک ویو گیسٹ ہاؤز میں کی۔ اس کے بعد آئی ڈی پی ال گیسٹ ہاؤز مینیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ایک دن گیسٹ ہاوز سے واپسی پر اچانک ایک مضمون لکھ کر ساتھ لائے وہ تھا نان میٹرک۔ کسی دن ایسا ہوتا کہ دو دو مضامین ساتھ ہوتے ایک ہی نشست میں لکھے ہوئے۔ مجھے حسد ہونے لگا لیکن چند ہی دنوں میں یہ حسد رشک میں تبدیل ہو گیا۔ توفیق صاحب دیانت دار اور محنتی ہیں۔ شاید ان کی اسی خوبی کو بھانپ کر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں شامل کیا۔ حساس طبیعت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے انھیں کسی طرح نقصان پہنچایا، یا ذہنی الجھن میں مبتلا کیا انھیں کچھ کہے بغیر خاموشی اختیار کر لی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے، ان کی خاموشی ہی سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ ایک معاملے میں بڑے خوش قسمت ہیں وہ ہے گھریلو معاملہ۔ ایک عدد وفا شعار نیک بیوی کے شوہر اور دو اطاعت گزار بچوں کے باپ ہیں۔ دونوں بچوں کی شادی ہو چکی ہے۔ داماد سید افتخار الدین

اور بہو آمنہ کوثر ہے۔ بیٹی داماد، بہو بیٹا سبھی عزت کرتے ہیں اور ہر طرح ان کا خیال رکھتے ہیں۔ تین پیاری نواسیاں سارہ، حمیرا اور عائشہ اور سب کی آنکھوں کا تارہ ایک پوتی صدیعہ یہی زندگی کا سرمایہ ہے۔ ان بچوں کے درخشاں مستقبل کی دعائیں کرتے ہیں۔ کسی قسم کا نشہ نہیں کرتے۔ صرف ایک نشہ ہے وہ ہے محبت کا نشہ۔ بیوی بچوں کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ بچوں کی ذرا سی بھی تکلیف سہہ نہیں سکتے۔ چہرے پر تفکر کے آثار جھلکنے لگتے ہیں۔ اس دوران وہ گاتے بھی ہیں اور گنگناتے بھی ہیں، اپنی پریشانی کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ انھوں نے کالج کی ملازمت کے لئے اصرار نہیں کیا۔ آئی ڈی پی ال کالونی بالانگر سے روزانہ دو بسیں بدل کر تقریباً ۱۶ کلومیٹر اورینٹل اردو کالج حمایت نگر جایا کرتی تھی۔ واپسی رات کے دس بجے ہوتی۔ جب اسکوٹر آ گئی تو توفیق صاحب اپنے آفس کے بعد فوراً میرے ساتھ چلنے لگے۔ تیرہ چودہ گھنٹے مسلسل حرکت میں رہتے۔ میں سوچا کرتی کہ ان پر سراسر ظلم ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ میرے بارے میں یہی سوچا کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ظلم کسی پر نہیں ہوا۔ باعزت زندگی اور کسب حلال کے لئے ہم نے یہ ضروری سمجھا۔

بیوی کی طبیعت ٹھیک نہ لگے تو ہمدردی سے کہتے ہیں آج کھانا مت پکاؤ کھچڑی پکا لو۔ گویا کھچڑی پکانے کے لئے چولھا ضروری نہیں۔ بغیر چولھے والی کھچڑی کے لئے تو دو چار خواتین کا سر جوڑے بیٹھنا ضروری ہے۔ یہ کھچڑی مجھے پکانی نہیں آتی۔ سنا ہے کہ چند نادر میٹھے بنانے کی تراکیب سے یہ خوب واقف ہیں لیکن باورچی خانے میں قدم نہیں رکھتے۔ سوچتے ہوں گے بعض ڈھونگی بیویوں کی طرح کہیں یہ بھی چولھے کا کام نہ لگا دے۔

غصہ کس چڑیا کا نام ہے یہ نہیں جانتے۔ ان ۳۶ سالوں میں، میں نے بہت سر مارا، لاکھ تدبیریں سوچیں کہ انھیں کسی طرح غصہ دلاؤں۔ سالن میں نمک تیز کیا، پھیکی چائے میز پر رکھی سب تدبیریں ناکام ہوئیں۔ ایک ترکیب ہاتھ لگی ہے وہ ہے، راستے میں رکوا کر کسی ہوٹل میں کھانے کی درخواست۔ جی ہاں! درخواست ہی سمجھئے۔ ایک دن یونیورسٹی سے واپسی پر میں

نے ان کی خوشامد کی کہ آج دوپہر کا کھانا کہیں باہر کھالیں گے۔ بچے حیدرآباد میں نہیں تھے۔ دو بج رہے تھے۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں پکایا تھا۔ ہم کافی تھکے ہوئے تھے۔ ہوٹل کی نشان دہی بھی کردی۔ اسکوٹر آگے بڑھتی گئی۔ میں نے دہرایا دیکھئے کھانا کہیں کھالیں گے نا۔ کچھ جواب نہ ملا۔ کاچی گوڑہ پر ایک فالتو سی نورست ہوٹل کی گیٹ میں جاکر اسکوٹر ٹھیرادی۔ ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ آرڈر دیا۔ تھالی آئی۔ موٹے چاول کا خشکہ، دو تین قسم کی دالیں، رسم، سانبر، چٹنی وغیرہ۔ لانے میں دیر بھی ہوئی۔ بیرار پس میں آگیا۔ میں خاموشی سے انھیں دیکھتی رہی۔ جس موڈ میں ہم دونوں نے کھانا کھایا وہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے جان لیا کہ دو تین روٹیاں پکالینے ہی میں عافیت ہے۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ انھیں کبھی غصہ دلانا چاہوں تو یہ حربہ استعمال کرسکتی ہوں۔ شہر کی کتنی ہوٹلوں کے نام اور راستے انھیں یاد ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شام کسی میٹنگ سے واپسی میں دیر ہوگئی۔ رات کا کھانا میں نے نہیں تیار کیا تھا۔ گھر آکر ہم دونوں ہی کے کھانے کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے چولھے سے بچنے کے لئے دبے لہجے میں ان سے کہا، کھانا کہیں باہر کھالیں گے۔ معظم جاہی مارکٹ CDR ہاسپٹل کے پاس اسکوٹر ٹھہرا کر اندر جانے لگے۔ واچ مین نے پوچھا ایمرجنسی ہے کیا؟ دونوں میں کون بیمار ہے؟ انھوں نے کہا ہوٹل آداب۔ واچ مین نے وعلیکم آداب کہہ کر اشارے سے ہوٹل آداب کا راستہ بتایا۔ آگے بڑھے۔ اس ہوٹل پر سے بیسیوں دفعہ گزر چکے ہیں۔ کبھی بورڈ نہیں پڑھا۔ ہوٹل پر سے آگے بڑھ گئے اور پھر پھر سیدھے گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔

ہمارے گھر میں پکانے والی، ملازمہ ٹائپ کی کوئی مخلوق نظر نہیں آئے گی۔ اللہ کے فضل سے یہ کام میں بخوبی انجام دے لیتی ہوں۔ ایک دفعہ ہمدردی میں ایک خاتون کو کسی نے بھیجا۔ انھیں پکوان کم اور چکر زیادہ آتا تھا۔ زردے کی پھکی مار کر بیٹھ جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ تین چار ماہ بعد ان کا حساب چکا دینا پڑا۔ بعد میں کبھی کام والی کا ذکر آیا تو کہنے لگے۔ وہ تو ۱۹۴۸ء کا ماڈل

تھا۔سوچا تو یاد آیا کہ اُس زمانے کی ہیروئینیں تالو پر ہیر پن لگا کر بال جمایا کرتی تھیں۔ان کی نظریں تو بظاہر جھکی ہی رہتی تھیں باریک بینی کی داد دینی پڑے گی!

ماہ اکتوبر توفیق صاحب کے لئے کئی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے اور مبارک بھی۔ ۴/اکتوبر ۱۹۳۲ء ان کی پیدائش کا دن ہے۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۶۳ء کئی گواہوں کی موجودگی میں حبیب ضیاء کو قبول کیا۔ ۷/اکتوبر ۱۹۹۵ء تیسری نواسی عائشہ کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۵ء بہت ہی مبارک۔اس لئے کہ اسی دن پہلا عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آج ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۹ء صاحبِ کتاب بنے۔مزاح نگار رحیم الدین توفیق کی شریک حیات ہونے پر میں فخر کرتی ہوں ان کی صحت وسلامتی کے لئے دعا گو ہوں۔مخلص دوست احباب نے کتاب کے جلسۂ رسمِ اجرا میں شریک ہو کر خلوص کا اظہار کیا۔آپ حاضرین محفل کی شرکت میرے لئے مسرت کا باعث ہے۔

○ ○ ○

زندگی کے ۳۸ سال

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں میری شادی سید رحیم الدین توفیق گسٹ ہاوز منیجر آئی ڈی پی ایل سے ۱۱/اکٹوبر ۱۹۶۳ء کو ہوئی۔ ہمارا ساتھ ۳۸ سال سے کچھ زیادہ عرصہ رہا۔ انتہائی خوشگوار، پرسکون زندگی ہم نے گزاری۔ ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کا کرم اس کی مہربانیاں شامل حال رہیں۔ لوگ کہتے کہ یہ مثالی جوڑا ہے۔ ہم دونوں کے مزاج بھی کچھ ایسے تھے کہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ حالات سے سمجھوتا کرنا ہم دونوں کو آتا تھا۔ چھوٹے بڑے تمام فیصلے آپسی مشورے سے ہوتے۔ ہمارے کچھ اصول تھے۔ بے جا رسومات کو دونوں ناپسند کرتے تھے۔ سیر تفریح یا ہوٹلوں میں کھانا کھا کر ہم نے کبھی روپیے پیسے کا غلط استعمال نہیں کیا۔ مستحق کی مالی امداد کرنا ہم نے اپنا فرض جانا، معیار زندگی کو بڑھانے اور عزت کی روٹی کھانے کے لئے دونوں نے جو محنت کی خاندان کے سبھی افراد اور دوسرے جاننے والے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ خوش قسمتی ہے کہ ہمارے دونوں بچوں نے تعاون کیا۔ کبھی بے جا ضد یا فرمائش نہیں کی۔ توفیق صاحب مجھے بے پناہ چاہتے تھے۔ کبھی میری دل آزاری نہیں کی نہ کبھی تیز لہجہ میں گفتگو کی۔ میں نے بھی ان کا ہر طرح خیال رکھا۔ صبح ان کے کپڑے، تولیہ وغیرہ دے دیا کرتی۔ کبھی انھیں شکایت کا موقع نہ دیا کہ کپڑے دھلے ہوئے نہ ہوں۔ اتنے برسوں میں ایک یا دو بار ایسا ہوا کہ صبح دھلی ہوئی بنیان نہیں تھی بلکہ مل نہیں رہی تھی بعد میں کپڑوں میں مل گئی۔ ان کے حمام میں جاتے ہی میں نے چند ہی منٹوں میں بنیان دھو کر استری کر کے دے دی۔ توفیق صاحب کے جوتوں پر پالش کر کے مجھے دلی مسرت ہوتی۔ بعض وقت جوتا پہننے کے بعد باہر جاتے ہوئے مجھے لگتا کہ تھوڑی سی گرد ہے تو میں فوراً صاف کر دیتی۔ مجھے وہ منع کرتے ہنس کر کہتے کہ اتنی بڑی رائٹر ہو کر میرے جوتے صاف کر رہی ہو۔ میں جس طرح گھر کے کام کا خیال رکھتی وہ باہر کی ساری ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ بنک جانا میرے لئے بڑا مشکل

کام ہے۔ایک طرح سے بیزاری کا احساس ہوتا ہے۔تنخواہ کا چک انھیں حوالے کرتی وہ بنک سے روپیہ لاتے ،جمع کرتے ، جائیداد کے ٹیکس اور دوسرے بل پابندی سے وقت پر دے دیا کرتے۔ مجھے بڑی بے فکری رہتی۔بس صرف ایک دو دن قبل یاد دہانی کر دیتی کہ پیسے لانے ہیں۔ پتہ نہیں اور گھرانوں میں روپیہ پیسہ، گھر کا خرچ، سامان کی خرید وفروخت، شادی بیاہ، دعوتوں میں شرکت کے لئے تحفوں کی خریدی اور دیگر حساب کتاب کیسے ہوتا ہے۔ ہمارا طریقہ یہ تھا کہ ہم دونوں اپنی تنخواہ ایک جگہ رکھ دیتے۔تنخواہ ملنے کے بعد پہلے ہفتہ ہی میں گھر کی ضروری اشیاء، نل، لائٹ، اخبار، ٹی وی وغیرہ کے بل دے دیئے جاتے اور پھر اطمینان سے دوسرے اخراجات کے لئے بجٹ میں گنجائش رکھی جاتی۔ ہمارے بیٹے فہیم نے ملازمت شروع کی تو وہ بھی تنخواہ ملتے ہی ہماری الماری کے لاکر میں رکھ جاتا۔اس طرح ہم نے کبھی یہ نہ سوچا کہ یہ کس کی تنخواہ ہے۔کون زیادہ روپیہ لاتا ہے۔کس کا ذاتی خرچ کتنا ہے۔ہم آپسی مشورے سے سامان کی خریداری کرتے۔ اور دیگر ضروری اخراجات پورے کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس معاملے میں کبھی کوئی کشیدگی یا تناؤ نہیں ہوا۔اتنے برسوں میں کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو وہ کسی تیسرے آدمی کی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ایک واقعہ یہاں لکھ رہی ہوں جسے میں مرتے دم تک بھلا نہ پاؤں گی۔ بیٹا باہر جانے والا تھا۔اس کے ہوائی ٹکٹ کے دس ہزار روپے الماری میں رکھے تھے۔ چند دن قبل مجھے نوٹوں کا وہ بنڈل نظر نہیں آیا۔ میں نے ساری الماری چھان لی۔ بار بار Locker میں ڈھونڈے لیکن روپے وہاں نہ تھے۔ میری پریشانی بڑھنے لگی دوسرے دن بھی پریشان تھی۔توفیق صاحب کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔شاید ذہنی تناؤ کی وجہ سے۔ میں نے آخر کار دبی زبان سے اس بات کا تذکرہ ان سے کر ہی دیا کیوں کہ ٹکٹ وہی لانے والے تھے۔میرے پوچھنے پر انتہائی پریشانی کے عالم میں انھوں نے کہا ان کے دوست عبدالرحمٰن خاں نے مانگے تھے۔ وعدہ تھا کہ وقت پر لوٹا دیں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ ان سے واپس لے لیجئے۔تو جواب ملا وہ کہہ رہے ہیں کہ کیسا بھی

adjust کرلو۔ اس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میں نے خاموشی سے اپنے سونے کے کڑے فروخت کرڈالے۔ فہیم ملک سے باہر چلا گیا۔ بنی داماد جدہ میں رہتے تھے۔ اس ایک واقعہ نے ہم دونوں میں کشیدگی بڑھائی۔ توفیق صاحب مجھے بہت چاہتے تھے دل شکنی کا تو کبھی سوال ہی پیدا نہ ہوا لیکن ان کی مروت اور خاموشی کا دوست نے استحصال کیا۔ میں صرف اتنا بتانا چاہتی تھی کہ جو آدمی غلط کام کرتا ہے اس کو تنبیہہ کرنی چاہئے۔ آگے اس سے احتیاط برتنی چاہئے۔ لیکن توفیق صاحب کی شرافت دیکھئے کہ اتنی پریشانی مول لی لیکن دوست کو کچھ کہہ نہ سکے۔ دوست کی غلطی کو نہ مانتے ہوئے مجھ سے کچھ دن کھنچے کھنچے سے رہے۔ ظاہر ہے یہ انھوں نے جان بوجھ کرنہیں کیا تھا۔ میرا اصول ہے کہ میں کسی کی غلط بات برداشت نہیں کرسکتی۔ یہاں غلطی سراسر اُن صاحب کی تھی جنھوں نے دوستی کے نام پر پریشان کیا۔ اپنے اخراجات کے لئے ان کی بیوی کے پاس بھی سونا تھا جسے وہ فروخت کرسکتے تھے۔ تقریباً پندرہ دن ہمارے ایسے گزر گئے۔ یہ بڑا تلخ واقعہ تھا۔ مجھے اب زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس مرجانے کو طبیعت چاہتی تھی۔ پکچرس میں دیکھا تھا کہ کس طرح ہیروئن پنکھے سے لٹک کر پھانسی لیتی ہے لیکن ایسا نہ کرسکی۔ پھر اوڑھنی کو گلے پر باندھ کر زور سے کس ڈالا لیکن صرف ذرا سی سانس میں رکاوٹ آئی پھر پھندہ کامیاب نہ ہوا۔ میں شاعر نہیں ہوں کبھی وقتی موڈ میں دو چار اشعار قلم کی زبان پر آئے۔ خودکشی میں ناکامی کے بعد یہ شعر ذہن میں آیا۔ پتہ نہیں شعر ہے بھی یا نہیں۔

جینے سے جب بیزار ہوئے پھانسی کا ارادہ ہم نے کیا
پھندے نے کہا یہ کام غلط دُنیا کو تیری ضرورت ہے

دوبارہ پڑھ رہی ہوں تو یہ آنو کا شعر لگ رہا ہے۔ بہر حال ایسے دل آزار حادثات ایک دو ہی ہوئے لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے درمیان رنجش ہوئی۔ ہم لوگوں نے ایسے مواقع پر بحث کبھی نہیں کی۔ خاموشی ہی کو بہتر طریقہ جانا۔ چند گھنٹوں کی یا چند دنوں کی۔ میرے حافظے پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ہماری ازدواجی زندگی میں یہی ایک ایسا واقعہ تھا جس نے چند

دنوں تک ہمیں پریشان رکھا۔ میں توفیق صاحب سے کچھ نہیں کہتی بس کاغذ قلم کا سہارا لیتی اور جو بھی ہو لکھ دیتی۔ اس وقت بھی میں نے ان کے دوست کی غیر اصولی بات کا ذکر ایک خط میں کر دیا۔ خط کیا ہے ڈائری کے اوراق کہہ سکتی ہوں۔ وقت اور تاریخ ان پر لکھی ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ یہ تحریریں میرے پاس ہی محفوظ رہ جاتیں انھیں بتاتی نہیں تھی کہ کیوں پریشان کروں۔ یہاں میں ایسے دوستوں سے درخواست کرتی ہوں کہ دوستی کے نام پر کسی کی زندگی کو داؤ پر نہ لگائیں۔ خصوصاً توفیق صاحب جیسے شریف، مروت والے انسانوں کا استحصال ہرگز نہ کریں۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جو مروت کی وجہ سے خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ بیوی بچوں سے زیادہ دوست، کسی رشتہ دار کی ضرورت کو اہم جانتے ہیں۔ میرا پیام ان سب کے لئے ہے۔ خود غرض دوست احباب سے بچے رہیں۔ تاکہ ان کی غلطی، خود غرضی یا لالچ کی وجہ سے خاندان میں دراڑ نہ آنے پائے۔

ہم دونوں میں کبھی رنجش یا ذہنی ٹکراؤ ہوا تو ہمیشہ کسی اور کی غلطی سے ہوا۔ بھگتنا ہمیں پڑا۔ میری ساس کبھی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہم دونوں کہیں جائیں۔ وہ تو میری نوکری کو بھی تفریح جانتی تھیں۔ ذہنی مریض تھیں ہو سکتا ہے کہ انھیں پتہ ہی نہ چلتا ہو کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ سمجھانے پر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ برسوں پہلے کی بات ہے۔ توفیق صاحب کے ایک بہت ہی قریبی دوست عزیز بیگ کی بہن کی شادی تھی۔ میری ملازمت اورینٹل کالج میں تھی کالج رات نو بجے تک ہوتا تھا۔ توفیق صاحب نے طے کیا کہ کالج سے وہاں چلے جائیں گے۔ ساس صاحبہ کو پتہ چلا تو انھوں نے موڈ خراب کر لیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماحول ہو تو کسی تقریب میں جانے کے لئے طبیعت نہیں چاہے گی۔ میں معمولی سوتی ساڑی پہن کر کالج چلی گئی۔ واپسی میں توفیق صاحب نے کہا کہ دعوت میں چلیں گے۔ میرا کہنا تھا کہ میں گھر چلی جاتی ہوں آپ دعوت میں شریک ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا تم نہیں چلوگی تو میں بھی نہیں جاؤں گا دونوں گھر چلے جائیں گے۔ ان کا دل رکھنے کے لئے میں مجبوراً اُسی سادہ

لباس میں شادی میں چلی گئی لیکن انسان ہوں وقتی طور پر اس کا اثر مجھ پر رہا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی اور فریق کی وجہ سے نشانہ بنے۔ اس کا اثر میزبان پر بھی پڑا۔ اس قسم کے حادثات زندگی میں رونما ہوتے رہے۔ ہم دونوں نے بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں ان کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ بچوں پر یا ہماری دیگر مصروفیات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ساس صاحبہ کی طنزیہ اور دل آزار باتیں برداشت نہیں ہوتیں تو میں بے اختیار رو دیتی لیکن ہمیشہ اپنے بند کمرے میں۔ بعد میں تو یوں ہونے لگا تھا کہ تصور سے ہی میری طبیعت خراب ہو جاتی۔ شدید گھٹن اور گھبراہٹ۔ برسوں Valiam5 اور نیند اور سکون کے لئے مختلف دوائیں لیتی رہی۔ بعض دفعہ بلڈ پریشر بہت کم ہو جاتا تو کیفیت عجیب سی ہوتی۔ نقاہت بڑھ جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ میں جان نہیں ہے۔ پھر ڈاکٹر کے مشورہ پر دوا کے علاوہ سوپ وغیرہ استعمال کر کے انسان بنتی۔

بعض خواتین کی نفسیات کا میں نے تجزیہ کیا ہے کہ وہ بہو کو آرزو اور ارمانوں سے تو گھر لے آتی ہیں لیکن اس کے آتے ہی یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ اب بیٹا مجھ سے چھین لیا گیا۔ بہو کا ہو گیا۔ یا کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ بیٹے کی محبت کو بانٹنا نہیں چاہتیں۔ ماں اور بیٹا بس یہی دو رہیں۔ تیسرا درمیان میں نہ آئے۔ ہو سکتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ میرا شوہر صرف میرا ہو کر رہ جائے۔ میں نے کسی کی حق تلفی بھی نہیں کی اور ہمیشہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ میں کہہ چکی ہوں کہ توفیق صاحب کے اور کوئی بھائی نہیں تھے تو ظاہر ہے کہ ان کی والدہ کو ہمارے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ہر طرح کی دیکھ بھال میرے ہی ذمہ تھی۔ اور میں نے احسان کبھی نہیں جتایا اپنا فرض سمجھ کر سب کی خدمت کرتی رہی۔ میری ساس کی جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی انھیں تنہا کہیں جانے کے لیے ہم منع کرتے تھے لیکن جیسا کہ ان کی فطرت تھی وہ ہمیشہ خود کو بیمار ظاہر کرتی تھیں اور دواخانے جانا تقریباً روز کا معمول تھا۔ کمپنی کا دواخانہ تھا اس لیے کسی قسم کے اخراجات کا سوال نہیں تھا۔ اسی سہولت کا

انھوں نے فائدہ اٹھایا ایک دن گر گئیں اور ہاتھ میں فریکچر آ گیا۔ اس زمانے میں میری ملازمت اورینٹل اردو کالج کی تھی۔ صبح ۹ بجے ہفتہ میں تین بار انھیں جراح کے پاس لے جایا کرتی۔ اس وقت وہ تو ناشتہ کرلیتیں لیکن میں گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے صرف چائے پی کر ان کے ساتھ جاتی۔ کافی دیر بعد میرا ناشتہ ہوتا۔ پھر بہت ہی عجلت میں مجھے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنا ہوتا۔ اس دوران انھیں نہلانا، کپڑے تبدیل کرنا میری ہی ذمہ داری تھی کیوں کہ ہاتھ سے مجبور تھیں۔ طبیعت میں ضد تھی اس لئے اچھی بات کو بھی غلط انداز سے سوچتی تھیں۔ آنکھ کا آپریشن ہوا تو دواخانے سے گھر آنے کے بعد پورا عرصہ میں نے ہر طرح ان کا خیال رکھا۔ اس زمانے میں آپریشن کے بعد بہت زیادہ احتیاط بتائی جاتی تھی اس سے دگنی وہ کرتی تھیں۔ بہرحال میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ان کا سلوک تو میرے ساتھ تکلیف دہ، دل آزاری کی حدوں کو چھو لینے والا ہے میں کیوں کروں ان کی خدمت؟۔ میں کسی صلہ، نام نمود، ایوارڈ کی امید کے بغیر اپنا فرض نبھاتی گئی۔ یہاں میرے مخالفین اللہ کو حاضر و ناظر جان کر جواب دیں کہ میری جگہ وہ ہوتے تو کیا کرتے۔ بہرحال۔ میں اور توفیق صاحب نے کسی سے برا سلوک نہیں کیا۔ نہ شکوہ نہ شکایت، بس خاموشی، صبر، احتیاط۔ اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان رہا۔ دنیا والوں نے دیکھا کہ ہم دونوں کی ادبی حلقوں میں کتنی عزت ہے۔ بس اور کیا چاہئے۔ ایڈیٹر شگوفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے شگوفہ کے ایک سالنامہ میں میرا مختصر تعارف لکھا۔ ایک جملہ ہے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کے صدر جناب صلاح الدین نیر نے فون پر دوران گفتگو کہا۔ آپ کو پتہ نہیں، ادبی حلقوں میں آپ کی کتنی عزت ہے۔ حیدرآباد کی مذہبی اور ادبی انجمنیں اور ادارے، سب ہی مجھے مدعو کرتے ہیں اور بڑی عزت دی جاتی ہے۔ سسرالی رشتہ دار میری قدر کرتے ہیں۔ میرے بہن بھائی جو ہندوستان سے باہر ملکوں میں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہیں سبھی ہمارے بچوں اور ہم دونوں کو چاہتے ہیں، عزیز رکھتے ہیں ہر طرح دکھ سکھ میں شریک ہیں بس میں مطمئن ہوں۔

میری خالہ محترمہ بدرالنساء صاحبہ، بیگم ڈاکٹر محمد یوسف مرزا میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ بچپن میں، میں انھیں کے پاس رہا کرتی تھی بچوں کی طرح بلکہ بچوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں امی پپا کے پاکستان جانے کے بعد خالہ صاحبہ اور خالو جان نے ان کی کمی کو محسوس ہونے نہیں دیا۔ ان کے بچے بھی خلوص سے ملتے تھے۔ میرے خالو ڈاکٹر محمد یوسف مرزا جو دواخانۂ عثمانیہ کے فرسٹ آر ایم او تھے انتہائی دیانت دار اور اصولی انسان تھے۔ کسی غلط بات اور غلط انسان کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ توفیق صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ بے تکلف ہو کر ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ توفیق صاحب بہت کم لوگوں سے کھل کر بات کرتے تھے۔ خالو جان کے علاوہ ہمارے سمدھی امام الدین اظہر، محمد برہان حسین اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال یہ ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے ان کے مزاج کو پہچانا۔ اظہر نے ہر موقع پر ہمارا ساتھ دیا۔ بہت عزت کرتے تھے۔ توفیق صاحب سے بہت بے تکلف بھی تھے۔ ساتھ ہی اظہر نے ان کی بیماری کے زمانے میں بھی بہت خیال رکھا۔ اس وقت میرا بیٹا اور داماد دونوں حیدر آباد میں نہیں تھے۔ ان کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ ممتاز مزاح نگار برہان حسین جو توفیق صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں اکثر آجاتے اور ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی۔ توفیق صاحب کے وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد کمال صاحب نے انھیں جب شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں لے لیا تو شگوفہ کی پروف ریڈنگ کے لئے وہ دفتر شگوفہ جایا کرتے۔ بس اپنے کام سے کام۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ توفیق صاحب خاموش رہیں تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال انھیں مخاطب کر کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کبھی دفتر شگوفہ پر ہی مشہور مزاح نگار شعرا حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ بھی ان سے بے تکلف انداز میں گفتگو کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ توفیق صاحب نے رویہ بدلا اور کمال صاحب سے بے تکلف ہو کر بات کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے کہا کہ پروف ریڈنگ کے لئے مسودہ گھر لا لیں میں مدد کروں گی۔ وہ پڑھتے اور میں تصحیح کرتی جاتی۔ انتقال سے پندرہ بیس دن قبل بھی انھوں نے مضامین پڑھے۔ ذکر ہو رہا تھا کمال صاحب کا ایک دن تصحیح شدہ مضامین لینے آئے توفیق

صاحب سے کہنے لگے دفتر شگوفہ میں کہہ آیا ہوں۔ میں ایک بہت ہی مہذب گھر جا رہا ہوں۔ یہ جملہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ ہمیں اتنی عزت ملی۔ مسز قیصر کمال بھی بہت ہی خلوص سے مجھ سے بات کرتی ہیں۔ فون پر میری خیریت دریافت کرتی ہیں اس سے بڑا حوصلہ بڑھتا ہے۔

بعض گھرانوں کی روایت ہے دستور بنالیا گیا ہے کہ صدر خاندان سے سب ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ وہ گھر آتے ہی سب دبک جاتے ہیں۔ سناٹا سا ہو جاتا ہے۔ ادھر وہ شیر بنا دہاڑتا ہے۔ صابن جگہ پر نہیں تو آفت مچادی۔ کھانا وقت پر نہ ملے تو بہو بیٹیوں کو نواز دیتا ہے۔ وہ بچوں کو الو کا پٹھا، سور کی اولاد، حرامی، ڈھیر سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ بیوی کی تو وقعت ہی نہیں گویا پیسے دے کر خرید لایا ہے۔ یہ نظارے میں نے کئی نام نہاد ''مہذب'' گھرانوں میں دیکھے ہیں۔ زبان ایسی گویا منہ سے کانٹے جھڑ رہے ہیں۔ اسی زبان سے جب وہ گھر کے باہر یا اپنے دوست احباب سے بات کرتا ہے منہ کھولتا ہے تو لوگ واہ واہ کرتے ہیں کیا مزاج ہے کیا شائستگی ہے!۔ کتنی میٹھی گفتگو، منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں! پھول کانٹوں سے نکل کر میں اپنے گھر میں آتی ہوں۔ توفیق صاحب انتہائی سادہ مزاج تھے۔ اپنے بچوں سے دوستانہ تعلقات تھے نہ کہ ڈرانے والے۔ بچوں کے علاوہ داماد افتخار سے بھی کھل کر بات کرتے۔ افتخار بھی انھیں بڑی عزت دیتے دورانِ گفتگو افتخار کے قہقہوں سے لطف اٹھاتے۔ اپنی بہو آمنہ کو بھی وہ بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ تینوں نواسیوں اور پوتی سے ان کی والہانہ محبت کو سبھی نے دیکھا ہے۔ ایک عرصہ تک بچیوں کو بس اسٹاپ پر چھوڑ آتے۔ جب کار آگئی تو کار خود چلاتے اور وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر ان کا انتظار کرتے۔ پوتی صدیعہ جب تک حیدرآباد میں رہی کھلونا تھی سب کے لئے۔ دوبئی جانے کے بعد اس کی آواز سننے، بات کرنے کے لئے بے چین رہتے۔ بیٹے سے فون پر جب بھی بات کرتے اس سے پوچھ لیتے ترقی ہوئی؟۔ ہر جمعہ درود شریف پڑھ کر اس کی ملازمت اور ترقی کے لئے دعا مانگتے۔ کہتے تھے درود شریف میں بڑی برکت ہے۔ میں

مسلسل دعا مانگ رہا ہوں۔ اپنی بیٹی عفت کو بھی بے پناہ چاہتے تھے۔ اس نے چلنا سیکھا تھا تو دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلاتے بہت خوش ہوتی۔ اور پھر.......... جب توفیق صاحب کمزور ہو گئے تھے، انتقال سے ڈیڑھ ماہ قبل، چڑھاوی جوتا لینا چاہتے تھے کہنے لگے نمائش سے لینا چاہتا ہوں وہاں اچھا ملے گا۔ عفت فوراً اپنی کار سے انھیں نمائش کے احاطے میں دکان تک لے گئی اور ان کی فرمائش پوری کی۔ ڈیک کے لاوڈ اسپیکر لینے تھے۔ واپس آ کر مجھ سے کہنے لگے عفت اسی طرح سہارا دے کر مجھے لے گئی جس طرح اس کے بچپن میں ہاتھ پکڑ کر اسے چلایا کرتا تھا۔

توفیق صاحب کے دوستانہ تعلقات اپنے دونوں سمدھیوں سے تھے۔ اظہر کے بارے میں لکھ چکی ہوں، دوسرے سمدھی، بیٹی کے سسر سید فخرالدین احمد صاحب سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ جب جدہ میں تھے تو دونوں کی پابندی سے خط و کتابت ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے کو طویل طویل خط لکھتے۔ حیدرآباد آنے کے بعد بھی آنا جانا رہا۔ چھوٹی موٹی تقاریب میں بھی ہمارے سمدھاوے میں مدعو کیا جاتا۔ ہماری ہر پریشانی میں ان سب نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔

جان ہے تو جہان ہے:

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا فضل ہے کہ اس نے مجھے کئی نعمتوں سے نوازا۔ اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ چاہنے والا شوہر فرماں بردار نیک اولاد اور ان کے پیارے سے بچے۔ ماں باپ کی شفقت اور محبت بھی ایسی کہ زمانہ مثال دے۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ زندگی، موت، بیماری، صحت، خوشی وغم یہ سب زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ قادرِ مطلق ہی ہے جو دنیا کو چلاتا ہے۔ آزمائشوں سے گزارتا ہے۔ کسی کو دولت دے کر آزماتا ہے کہ وہ کس طرح اس کو خرچ کرتا ہے، کسی کو نہ دے کر آزماتا ہے کہ وہ اِس حال میں ناشکری کرتا ہے یا صبر۔

میں ہر سانس پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے صحت جیسی دولت سے نوازا۔ اتنی ساری زندگی میں' میں نے گھریلو ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا، دینی و دنیاوی مصروفیات میں حصہ لیا۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے علاوہ ملازمت کے دوران لاتعداد بچوں کو پڑھایا۔ ان کی کردار سازی کے لئے ممکنہ کوششیں کیں اور کامیاب رہی۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے اپنی یادداشت کے سہارے اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اللہ کے فضل سے بچپن سے صحت مند رہی۔ سوائے کبھی موسمی سردی وغیرہ کے کوئی پریشان کن بیماری نہیں آئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ابتدا ہی سے دماغی محنت کے ساتھ ساتھ جسمانی محنت بھی کرتی رہی۔ گھر کی صفائی، باورچی خانے کا کام، پودوں کی دیکھ بھال یہ میری دلچسپی کے کام تھے۔ زبردستی کسی نے لادے نہیں کیوں کہ اُس زمانے میں متوسط طبقے کے ہر گھر میں دو تین نوکر لازمی طور پر رہا کرتے تھے۔ مجھے گھرداری سے دلچسپی ابتدا ہی سے رہی۔ ایک دو واقعات ہیں جو یادگار رہیں گے۔ شاید ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے میری ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک تہنیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ۲۰ رنومبر کو جلسہ تھا۔ ۱۹ رنومبر کو اخبار میں اس جلسے کی خبر پڑھ کر کسی خاتون نے فون پر مبارکباد دی۔ میں نے ذرا جھک کر ریسیور اٹھایا اور بس۔ کسی اور دنیا میں پہنچ گئی۔ ایک عجیب قسم کا چکر تھا۔ پورا کمرہ تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ میں سر ہلا بھی نہیں سکتی تھی۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر محمد محسن اس وقت ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے تشخیص کی کہ Spondylitis ہے اس وقت یہ لفظ ادا کرنا بھی نہیں آتا تھا تو میں نے اس طرح یاد رکھا۔ اسپان ڈی لائی ٹِز ایک گولی تجویز کی جو فوراً منگائی گئی۔ اس وقت میں بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ذرا سنبھلنے کے بعد میں نے ان سے کہا کل ایک جلسے میں جانا ہے کیا میں جاسکوں گی؟ پھر یہ بھی پوچھ لیا کہ کہیں یہ تہنیتی جلسہ تعزیتی جلسے میں تو نہ بدل جائے گا؟ انھوں نے کہا آرام لینے کے بعد ٹھیک ہوں تو جاسکتی ہیں لیکن گردن میں پٹہ ڈالنا پڑے گا۔ میں پریشان ہوگئی کہ بلاوجہ مستقل گلے میں پٹہ رہے گا۔ مجھے فکر یہ تھی کہ جلسے کو ملتوی کرنے کے لئے

فون کروں یا نہ کروں۔ بڑی تشویش رہی۔ پھر میں نے اللہ کا نام لے کر تہیہ کر لیا کہ جلسے میں جاؤں گی' انشاء اللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ صلاح الدین نیر صاحب کو اس کی اطلاع نہیں دی بلکہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی انھیں معلوم ہوگا۔ اس وقت میری بیٹی عفت اور بہو آمنہ میرے پاس ہی تھے۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ یہ بچے مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ دونوں میرے پاس رہ کر خدمت کرتی رہیں۔ موسمی کا رس دے رہی ہیں، انار کے دانے نکال کر مجھے کھلا رہی ہیں۔ چکر کے خوف کے مارے میں مستقل لیٹی رہی۔ دوسرے دن جلسے میں جانا بھی تھا۔ بہر حال میرا شاندار تہنیتی جلسہ ہوا ڈاکٹر سید عبد المنان، پروفیسر قادری بیگم، ڈاکٹر مصطفےٰ کمال، عبدالرحیم خاں صاحب، ڈاکٹر صادق نقوی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، محمد منظور احمد منظور، ڈاکٹر نہپال سنگھ ورما، جناب صلاح الدین نیر، جناب مومن خاں شوق، جناب رئیس اختر، ڈاکٹر نجم السحر نے میری ادبی خدمات کی بھرپور ستائش کی۔ میں مقرر نہیں ہوں۔ مختصراً میں نے اظہارِ تشکر کے طور پر چند سطریں لکھ لی تھیں لیکن پریشانی کے عالم میں، میں نے دو چار جملے ہی زبانی کہہ دیئے۔ ایک ہیبت تھی۔ ایسا چکر زندگی میں ایک ہی بار آیا۔ اب اسپان ڈی لائی ٹرز کو بھول چکی ہوں کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ڈھول اور جھوٹ سے البتہ زبردست الرجی ہے۔ یہ چیزیں مجھے جچتی نہیں۔

جنوری ۲۰۰۳ء میں اپنے گھر اکبر ناورس ملک پیٹ میں تھی۔ بیٹی داماد ملنے آئے۔ آتے ہی افتخار نے چہرہ دیکھ کر کہا مماں آج آپ کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہی ہیں۔ ہمارے ساتھ چلیئے۔ کافی اصرار کے بعد مجھے جانا پڑا۔ اس دن واقعی میں بہت روئی تھی شاید بلڈ پریشر بھی نارمل نہ ہوگا۔ بہرحال ان کے گھر جانے کے بعد چک اپ کروایا۔ گھر آتے ہی دوائیں میں نے لے لیں۔ ۱۵ منٹ بعد ہی مجھے کسی دوا کاری ایکشن ہوا۔ ہتھیلیاں سرخ ہوگئیں پھر ذرا سی دیر میں لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں نے بچوں سے **AVIL** مانگی جو معمولی الرجی وغیرہ میں کام دیتی ہے اثر کر جاتی ہے۔ دوا کے لئے ڈبہ دیکھنے کی بھی مہلت نہ تھی میری طبیعت اچانک

بگڑنے لگی۔ گارڈن ٹاورس مال صاحب ٹینک کے روبرو ہی دواخانہ ہے لیکن کار میں وہاں پہنچتے پہنچتے ایسا لگا کہ بہت دور جارہی ہوں۔ بات نہیں کرسکتی تھی حلق بند ہورہا تھا۔ دواخانہ جاتے ہی ڈیوٹی ڈاکٹر نے فوراً ایک انجکشن دیا پھر دوسرا ڈاکٹر آیا۔ چک اپ ہوا۔ دوتین انجکشن لگادیے گئے۔ یہ صرف ایک دوا کاری ایکشن تھا۔ چند گھنٹوں بعد بالکل ٹھیک تھی۔ اس وقت میرے بھائی ظہیر اور بھاوج صفیہ کنیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ صفیہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہنے لگیں اچھا ہوا آپ وہاں تھیں ورنہ آپ کو فوراً لے جانا مشکل تھا۔ صفیہ نے یہ بھی کہا کہ بعض وقت حلق بند ہونے سے موت بھی واقع ہوئی ہے۔ بہرحال بس یہ دو واقعات، حادثات جو بھی کہوں، ناقابلِ فراموش ہیں۔ ورنہ زندگی کے اِن ۶۷ برسوں میں، میں نے کبھی شوہر یا بچوں کو پریشان نہیں کیا۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے اندازہ ہے کہ کوئی پریشان کن بات نہیں لیکن ڈاکٹر خصوصاً اسپشلسٹ کے چکر میں ایک بار آجائیں تو نکلنا مشکل ہے انسان مجبور ہے۔ اسی گردش سے متاثر ہوکر کئی برس پہلے ایک طنزیہ مضمون بڑا ڈاکٹر لکھا تھا جو طنز و مزاح کے کئی شائقین کی نظر سے گزر چکا ہے۔ فبروری ۲۰۰۲ء کی بات ہے توفیق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی دوران مجھے کان کے درد کی وجہ سے ڈاکٹر سے رجوع ہونا پڑا۔ ایک ہفتہ بعد سر کی Scanning کروائی گئی۔ سب نارمل تھا تو ڈاکٹر نے سوچا اب کیا کیا جائے اس نے اپنے ہی گروہ کے ENT کے ماہر سے رجوع کروایا۔ یہاں بھی انھیں ناکامی ہوئی۔ اس کے برابر والا دروازہ آرتھوپیڈک تھا۔ مجھے سوفیصد یقین تھا کہ اب مجھے وہاں بھیجے گا۔ میرا شبہ صحیح نکلا۔ ڈاکٹر نے کہا ایسا کیجئے پاس ہی ڈاکٹر ہیں وہاں چک اپ کروالیجئے۔ میں توفیق صاحب کی بیماری کی وجہ سے پریشانی میں گھری ہوئی تھی۔ ادھر ڈاکٹرس روپے بٹورنے کی دھن میں تھے۔ وہاں سے فوراً گھر چلی آئی۔ Tension کی دوا دینی تھی۔ اس کی بجائے تین ہزار روپے ڈاکٹروں نے سمیٹ لئے، اللہ غارت کرے۔

توفیق صاحب اللہ کے فضل سے ہمیشہ چاق و چوبند، مصروف رہا کرتے۔ با اصول انسان تھے ہر جگہ وقت کی پابندی، ذمہ داری کا احساس، رشتوں کی باریکی کو سمجھنا انھیں خوب آتا تھا۔ بالانگر میں زیادہ تر مختلف قسم کے کارخانے تھے۔ یہ ان کے لئے نقصان دہ لگتے تھے۔ آئیل پینٹ، دھول، سینٹ اور پھولوں کی تیز خوشبوان چیزوں سے انھیں الرجی تھی۔ وقتی طور پر طبیعت پر اس کا اثر پڑ جاتا تھا۔ انتقال سے چند سال پہلے سے ہائی بلڈ پریشر کا رجحان دکھائی دیا۔ ہر ماہ پابندی سے چک اپ ہوتا۔ نارمل بھی ہوتو دوائیں جو ضروری ہوتی ہیں وہ ایک دفعہ شروع کروادی جائیں تو زندگی بھر لینی پڑتی ہیں۔ کبھی پیچیدگی کی وجہ سے ڈاکٹرس نے انھیں ایک ماہ یا پندرہ دن مکمل آرام کا بھی مشورہ دیا۔ یہ صراحت کردوں کہ قلب پر حملہ کبھی نہیں ہوا۔ عارضہ ضرور تھا۔ دوا اور علاج پابندی سے چلتا تھا اور وہ اپنی ملازمت اور دیگر مصروفیات میں لگے رہتے۔ آواز بہت اچھی تھی۔ مشہور شعرا کی غزلیات انھیں از بر تھیں شوقیہ گاتے تھے۔ میرے ہی کہنے پر مشہور گلوکار جناب وٹھل راؤ کے شاگرد بنے اور ان سے اس فن میں بہت کچھ سیکھا۔ یوں تو کئی برس پہلے میوزک کالج سے کلاسیکل موسیقی سیکھ کر سند بھی حاصل کی تھی۔ بہر حال یوں ہی دن گزر رہے تھے۔ ڈاکٹر سے تو مسلسل ربط میں تھے ہی۔ میں چاہتی کہ مہینے میں کم از کم ایک بار بلڈ پریشر چک کروالیں۔ نسخہ دے کر میں دواخانہ جانے کے لئے اصرار کرتی اور واپس آتے ہی فوراً نسخہ مانگتی۔ کبھی مجھے ستانے کے لئے کہہ دیتے آج نہیں گیا پھر جاؤں گا۔ دوسرے ہی لمحے مسکرا کر میرے ہاتھ میں نسخہ تھمادیتے بلڈ پریشر عموماً نارمل ہی ہوتا۔ یہ دیکھ کر میں بے حد سکون محسوس کرتی۔ دوا کھانے میں انہوں نے کبھی تساہل، لاپروائی نہیں برتی۔

ڈسمبر ۲۰۰۱ء تک بھی ادبی محفلوں اور دیگر تقاریب میں شرکت کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مظفر النساء ناز کی کتاب کی رسم اجراء میں ہم دونوں شریک رہے۔ پھر میں نے بھی محفلوں میں شرکت ترک کردی تھی۔ ان کی کمزوری بڑھ رہی تھی۔ فبروری ۲۰۰۲ء میں انھیں یرقان ہو گیا۔ بھوک بالکل بند ہو چکی تھی۔ ساری تکالیف اور علامات ڈاکٹر سے کہتے لیکن انھوں نے

بالکل توجہ نہیں دی۔ ایک ہفتہ میں دس پونڈ وزن کم ہوگیا۔ اپنی غلطی نبھانے کے لئے کہہ دیا۔ ہم آپ کا وزن کم کررہے ہیں اس کی پروامت کیجئے۔ سانس لینے میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ دو تین بار ڈاکٹر سے کہا کہ مجھے دواخانے میں شریک کرکے آکسیجن دیجئے۔ لیکن ان کا ایک ہی جملہ ہوتا میں آپ کی صحت سے مطمئن ہوں۔ مجھے شکایت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دھوکے میں رکھا۔ وقت پر صحیح علاج نہیں کیا۔ صرف باتیں اچھی کرتے تھے۔ علاج میں لاپروائی کی۔ لاپروائی کا ذکر بعد میں کئی لوگوں نے کیا جنھیں ان سے سابقہ پڑا تھا۔

میں مانتی ہوں کہ موت کا وقت معین ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا لیکن جو سانسیں انھوں نے تکلیف سے لیں کم از کم سکون کی ہوسکتی تھیں۔ ڈاکٹر کی اسی لاپروائی کی وجہ سے پریشان ہوکر ۷/مارچ صبح ۱۱ بجے چک اپ کے لئے کیر ہاسپٹل رجوع ہوئے۔ ڈاکٹر کا پہلا جملہ یہی تھا اتنی دیر کیوں کردی؟ آکسیجن لگانے کے چند منٹ بعد ہی وہ سکون محسوس کرنے لگے۔ مشہور ماہر قلب ڈاکٹر سوماراجو کے زیر علاج رہے۔ رات دن بہترین ڈاکٹرس اور فرض شناس نرسیس کی خدمات ملیں۔ تیسرے ہی دن Iccu سے AMC میں منتقل کردیا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے بیمار تھے ہی نہیں۔ ہشاش بشاش، رنگ پہلے جیسا سرخ وسفید۔ اپنے بھائی برہان حسین سے باتیں کیں۔ انجیر کا ذکر آیا۔ برہان مل کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ انجیر لے کر آئے۔ بڑے اشتیاق سے انھوں نے کھائے۔ اس دن کھانا اپنے ہاتھ سے کھایا۔ کئی دن بعد ٹھیک سے کھاتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ بالکل نارمل، صحت مند لگ رہے تھے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک دن بعد رات میں بے چینی محسوس کرنے لگے۔ فوراً Iccu منتقل کیا گیا۔ اس وقت میں بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ پاگلوں کی طرح وارڈ سے دو منزلیں سیڑھیاں اتر کر فون کرنے جاتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میرے کہنے پر عفت اس رات اپنے گھر چلی گئی تھی۔ کچھ سنبھلنے کے بعد کہنے لگے گھر جاؤ۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو جواب دیا۔ تیاری کرنا ہے نا! مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ تیاری کیسی ہے جس کے لئے توفیق صاحب مجھے گھر جانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اُس دن ڈاکٹرس نے مجھ سے کہہ

دیا کہ اب زندگی کم رہ گئی ہے۔ میں نے فون کر کے فہیم کو دوبئی سے بلالیا۔ آکسیجن اور دیگر آلات لگے ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ تھامے، بیٹھے بیٹھے میں نے پوچھا میں آپ کی کون ہوں؟ جھٹ کہہ دیا بیوی اور کون! ایک دفعہ میں نے نام پوچھا تو میرا نام بھی بتا دیا۔

فہیم رات میں آنے والے تھے۔ میں نے صبح کہا صنیعہ آرہی ہے۔ پوتی کے لئے بے چین تو تھے ہی کہنے لگے مگر میں اس کو لینے ایرپورٹ نہیں جا سکوں گا۔ میں نے اطمینان دلایا وہ خود آپ کے پاس آرہی ہے۔ فہیم، آمنہ اور صنیعہ تینوں ایرپورٹ سے سیدھے دواخانے آگئے۔ انھیں دیکھ کر رو پڑے۔ نواسیوں سے صبح مل چکے تھے۔ شام میں انھیں پھر یاد کیا۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ فہیم کے دوبئی سے آنے تک میں نے کس طرح صبر اور ہمت سے کام لیا اس وقت میرے داماد افتخار بھی جدہ میں تھے۔ فون پر مجھے تسلی دیا کرتے۔ دوسرے مریضوں کے ساتھ رہنے والی بچیاں مجھ سے کہتیں، آپ بڑی صبر والی ہیں۔ ایک تیمار دار ڈاکٹر رفیعہ بعد میں میرے گھر آئیں، کہنے لگیں میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

۱۳/ مارچ کو توفیق صاحب کچھ بے چین سے تھے۔ سانس لینے میں تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ ۱۴/ مارچ کی صبح وہ بالکل پرسکون، سانس دھیمی دھیمی۔ میں ان کے قریب بیٹھی یٰسین شریف پڑھ رہی تھی۔ انھیں دیکھتی جاتی تھی۔ نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ آپ مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں۔ میں بھی کتنی نادان تھی۔ تھک ہار کے اپنے سہاگ کے لئے اللہ میاں سے سودا کرنا شروع کیا۔ یا اللہ! میں تیرے نام پر پانچ ہزار روپیہ خیرات کروں گی۔ کوئی جواب نہ ملا تو میں نے دل ہی دل میں کہا دس ہزار اور پھر بیس ہزار، تیس ہزار، چالیس ہزار۔ اللہ میاں نے سنی ان سنی کر دی تو میں نے کہا پچاس ہزار، ایک۔ دو۔ تین۔ اُدھر سے آواز آئی۔ اری پاگل! اگر میں ایسے ہی روپیوں کی لالچ میں آجاؤں گا تو پسندیدہ بندوں کو اپنے پاس کیسے بلاؤں گا۔ چل راہ لے اپنی۔ اس وقت میں نے دیکھا ان کا بلڈ پریشر گر رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے دھیمی رفتار سے سانس لے رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے ان سانسوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا بس

اسی وقت میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی ۱۲ بجے تھے۔ ۱ بجے گھر لایا گیا اور اسی دن جمعرات بعد نماز مغرب نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ نماز جنازہ اور تدفین کے وقت رشتہ داروں، پڑوسیوں کے علاوہ حیدرآباد کے کئی نامور شاعر اور ادیب موجود تھے۔ کثیر تعداد میں مختلف ادبی مذہبی انجمنوں سے وابستہ خواتین گھر آئیں اور ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کی۔ میرے شاگرد ڈاکٹر عباس متقی کا لکھا یہ قطعہ تاریخ وفات توفیق صاحب کی قبر پر کندہ ہے:

صاحبِ ایمان کی تربت ہے یہ
پیکرِ ایقان کی تربت ہے یہ
سال یہ نایاب[۱۴] لکھ دو لوح پر
اک شریف انسان کی تربت ہے یہ
۱۴۲۲ھ

بعد میں حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب شاغل ادیب نے بھی ذیل کا قطعہ تاریخ وفات لکھا:

سوگ میں آج ہیں حبیب ضیا
آج شاغل بھی ہے بہت غمگیں

ہوئے ترپن[۵۳] جو کم تب سب نے کہا
خلد توفیق کو عطا ہو حسین

۱۴۷۵-۵۳=۱۴۲۲ھ

برسوں پہلے میری ساس مرحومہ نے مجھے بڑے گھر کی بیٹی کا خطاب دیا تھا کاش وہ مجھے بڑے دل کی بیٹی کہتیں۔ جی ہاں، بڑے دل کی۔ میں نے دل بڑا کر کے ان کے بیٹے کو انھیں سونپ دیا۔ اب وہ مطمئن ہیں، ان کا چہیتا بیٹا ان کے برابر ابدی نیند سو رہا ہے۔ برسوں سے چلی آئی ان کی شکایت بھی ختم ہوئی۔ مجھے اطمینان ہے کہ ایک بیٹے نے اپنی ماں سے اور ایک بہو نے اپنی ساس سے جو سلوک روا رکھا، اللہ تعالیٰ کو وہ پسند آئے گا۔ ماں باپ کا درجہ بہت بلند

ہے۔خصوصاً ماں جو نو مہینے تکالیف اٹھا کر بچے کو دنیا میں لاتی ہے اور ہر قسم کی قربانی دے کر اس کی پرورش کرتی ہو۔اس لئے ماں کیسی بھی ہو،اس کی ہر بات کو سہہ جانا ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔اس کا بہت بڑا اجر ہے۔توفیق صاحب کی یہ نیکیاں رائیگاں نہیں گئیں۔پورے بھروسے، اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انھیں نیک اور خدمت گزار بیوی حبیب ضیا ملی۔بیٹی داماد، بہو بیٹا،پوتی،پوتا اور نواسیاں یہ انشاء اللہ ان کا نام روشن کریں گے۔

اب میری نواسیاں مجھے سمجھاتی ہیں تسلی دیتی ہیں۔پوتی جو صرف ساڑھے تین سال کی ہے کہتی ہے دادی! اللہ میاں سے بولئے میرے دادو کو واپس کر دیں۔میں اُسے کیسے سمجھاؤں کہ اللہ میاں نے اپنی امانت لے لی۔اب وہ واپس نہیں مل سکتی۔رونے پر مجھے سمجھاتے، کیوں پریشان ہوتی ہو میں اچھا ہوں۔واقعی بہت اچھے تھے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے، تبھی تو جلد بلا لیا۔

توفیق صاحب کے انتقال کے بعد صدمے کی وجہ سے بیٹی دواخانے میں شریک رہی۔ بیٹا دوبئی واپس جاتے وقت میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔مجھ سے کہہ گیا ہے ماں اپنا خیال رکھئے۔ہم ماشاءاللہ دس بھائی بہن ہیں۔میرے سوائے سب ہندوستان سے باہر ہیں۔حالات کی خبر سن کر ایک بھائی مرزا ظہیر الدین بیگ کینیڈا سے آ گئے تھے۔اس سے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔بعد میں سبھی بھائی بہنوں نے فون کر کے تسلی دی اب بھی ان کے ٹیلی فون آتے ہیں صبر کرو، ہمت سے رہو۔ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اور میرے بچوں کو صبر عطا فرمائے۔اس صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت دے،حوصلہ دے۔ساتھ ہی یہ بھی دعا کرتی ہوں کہ میرے بچے آپس میں مل جل کر رہیں اور ہمیشہ کی طرح میرا خیال رکھیں۔ملک اور بیرون ملک کے ان تمام دوست احباب اور رشتہ داروں کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے جنھوں نے شخصی طور پر اور بذریعہ خط اور ٹیلی فون اظہار تعزیت کیا۔صحافت کے علاوہ ان ادبی اور تہذیبی انجمنوں کی بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے تعزیتی جلسوں کا انعقاد کیا۔

○○○○

۱۴/ مارچ ۲۰۰۲ء کے بعد

۱۴/ مارچ جو حادثہ ہوا ایک عرصہ تک میں اس پر یقین کرنے تیار ہی نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا توفیق صاحب آئیں گے۔ کہیں نہیں گئے۔ میرا بیٹا فہیم، بہو آمنہ اور پوتی صنیعہ میرے ساتھ تھے۔ مجھ سے چھوٹے بھائی ظہیر جو کناڈا سے آگئے تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ تھے۔ ہر طرح سے حوصلہ بڑھاتے، صبر کی تلقین کرتے۔ ان کے سامنے میں رو بھی نہیں سکتی تھی۔ ان لوگوں کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت پتہ نہیں کیسے صبر دے دیا۔ ضبط غم کا سلیقہ دے دیا تھا۔ ظہیر سے چھپ کر رو لیتی۔ صنیعہ تو مجھے سمجھاتے ہوئے خود بھی رو دیتی۔ اپنے دادا کو بہت چاہتی تھی۔ فہیم ایمرجنسی ویزا پر آئے تھے۔ ۱۶/ اپریل کو واپسی تھی۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن اس کے جاتے وقت رکے ہوئے آنسو اُمڈ آئے۔ وہ بھی بے اختیار رونے لگا۔ توفیق صاحب کی حین حیات وہ اسی فکر میں لگا ہوتا کہ میں چلا جاؤں گا تو مماں بابا کا خیال کون کرے گا۔ اس وقت، میری بیٹی داماد جدہ میں تھے اور اب تو اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر وہ دوبئی جانے پر مجبور تھا۔ اسے جانا ہی پڑا۔ اللہ کی مہربانی ہے کہ بیٹی داماد پھر حیدرآباد منتقل ہو چکے ہیں۔ ۲۰/ اپریل کو ظہیر چلے گئے۔ شدید قسم کا ذہنی تناؤ لئے، مجھے ڈھیر ساری تسلیاں دے کر۔ میرے خاندان کی کوئی خاتون ایسی نہ تھیں جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے پاس آسکتیں۔ بیٹی کے اپنے مسائل تھے۔ ایک تو وہ خود بیمار ہوگئی تھی۔ دوسرے تینوں بچیوں کی پڑھائی کا معاملہ تھا۔ افتخار جدہ میں تھے اور وہ اپنی سسرال میں۔ اس کے سسرال والوں نے اس کی تیمارداری کی، اُسے سنبھالا۔

میری سرگذشت کا یہ باب لاکھ کوشش کے باوجود نہ جلد شروع ہوا اور نہ میں اس کو مکمل کر پا رہی ہوں۔ قلم بار بار رک جاتا ہے۔ اور پھر میں ماضی کے اُس دور میں چلی جاتی ہوں جہاں ہر دم پر میں اور توفیق صاحب ساتھ ساتھ ہوتے۔ گھر کی خوش حالی اور بچوں کے روشن

مستقبل کے لئے منصوبے بناتے، لکھتے، پڑھتے اور ادبی جلسوں اور دیگر تقاریب میں ساتھ جاتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کبھی پکچر چلے جاتے، کبھی تہذیبی تقاریب میں بھی دلچسپی سے شریک ہوتے۔ یوم قلی سے لے کر ڈراما ادرک کے پنجے، ہنگامہ، ڈیڑھ متوالے، شام غزل، بہر حال مختلف کلچرل پروگرام دلچسپی سے خالی نہیں ہوتے۔ ہماری پسند بھی ایک تھی۔ یہ نہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرا جبراً جا رہا ہو۔ کبھی وہ پکچر چلنے کے موڈ میں ہوتے اور میں انہیں اپنی کسی مصروفیت یا تھکان کی وجہ سے اکیلے چلے جانے کہتی تو تنہا جانا نہیں چاہتے تھے۔ بہت ہی محبت بھرے انداز میں کہتے چلو تیار ہو جاؤ۔ Fresh ہو جاؤ گی۔ اور ان کے کہنے پر میں ساتھ چلی جاتی۔ واقعی تھکان وغیرہ سب غائب۔ رشتہ داروں سے ملاقات، ان کی خیریت، بیمار کی عیادت، ان سب باتوں کا ہم خیال رکھتے۔ توفیق صاحب خاص طور سے کہتے کہ فلاں رشتہ دار کے پاس جانا چاہئیے، بہت دن ہوگئے۔ ادبی جلسوں کے لئے مجھے کبھی کوئی تبصرہ، مضمون لکھنا ہوتا تو وہ مجھ سے زیادہ یاد رکھتے پوچھ لیتے، ہوگیا مضمون تیار؟ جلد لکھ لو۔ ان کی حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی تو تنقید، تحقیق کے علاوہ طنز و مزاح میں بھی مجھے یہ مقام حاصل نہ ہوتا۔ میری ترقی سے وہ بہت خوش ہوتے فخر محسوس کرتے۔ اب جب کہ ان کا ساتھ نہ رہا ایسے لگتا ہے کہ میں دکھاوے کے لئے جی رہی ہوں۔ ان کا انتقال ہوئے ایک سال تین ماہ کا عرصہ ہو چکا۔ اس دوران میں نے کوئی مزاحیہ مضمون نہیں لکھا۔ کئی عنوانات ہیں، مواد ذہن میں ہے۔ جملے محفوظ ہیں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ محفل خواتین کی تمام اراکین میرے مزاحیہ مضامین پسند کرتی ہیں۔ سننا چاہتی ہیں۔ دبستان جلیل، شعبہ خواتین کی ہر محفل میں میری مخلص دوست ڈاکٹر حمیرا جلیلی مدعو کرتی ہیں، ان کا اصرار ہوتا ہے کہ آپ کوئی بھی پرانا مضمون ہی سہی سنا دیجئے۔ یہاں کی شرکا آپ کے مضامین بہت پسند کرتی ہیں۔ میں طبیعت پر جبر کر کے ہی سنا دیتی ہوں اگر میرے مضمون سے کسی کو کچھ وقت کے لئے سکون ملتا ہو، میں انہیں مسرت بخش لمحات دے سکتی ہوں تو اتنی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔ اس وقت مجھے پروفیسر محسن عثمانی ندوی

کے مضمون ''کچھ طنز و مزاح کے بارے میں'' کا ایک جملہ یاد آجاتا ہے، وہ لکھتے ہیں: مژدہ ہو فنکاران طنز و ظرافت کے لئے کہ ان کے فن کا نور قرآن و سنت سے اور آسمانی کتابوں سے مستعار ہے۔

بہر حال میں شہر حیدرآباد کی تمام ادبی انجمنوں کی شکرگزار ہوں۔ ساتھ ہی ایک التجا ہے کہ اگر میں کبھی کسی جلسے میں شرکت نہ کروں تو اسے میری مجبوری پر محمول کریں۔ میری پوری کوشش ہے کہ طنز و مزاح کے پیرائے میں سماج کے مختلف مسائل، سماج میں رونما ہونے والی برائیوں اور خواتین سے متعلق دیگر اہم موضوعات پر کھل کر لکھوں ان کا حل پیش کروں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں خواتین کو محنت کرتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہیں مرد کے ظلم سے بچانا چاہتی ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو اور یہ خود اعتمادی تعلیم کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ خواتین خود کو مجبور' بے بس نہ جانیں' اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا سیکھیں۔ گھر کے معیار' وقار کو بڑھانے میں صدر خاندان کی مدد کریں۔ میری یہ خواہش' کوشش' پیام جو بھی سمجھئے برسوں سے ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ اخبار اور رسائل میں شائع ہونے والے میرے بہت سے مضامین، انشائیوں میں، میں نے عورت کو باشعور، حوصلہ مند اور محنتی دیکھنا چاہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گھر کے ہر فرد کو خوشحال زندگی گزارنے کے لئے محنت کرنی چاہیئے۔ ملک سے باہر جا کر جھاڑو دے سکتے ہیں۔ برتن دھو سکتے ہیں تو اپنے شہر، اپنے ملک میں آٹو چلانے میں شرم کیسی؟ ایک اور بات میرے ذہن کو جھنجھوڑتی ہے، بار بار سوچتی ہوں کہ ایک دائی یلماں کے دو بچے ڈاکٹر بن گئے ہیں تو خواجہ بی کے بچے سڑکوں، گلیوں میں آوارہ گردی کیوں کرتے ہیں۔ کیا ان کی زندگی کا مقصد ہی گٹکا' پان مسالہ کھا کر پڑے رہنا اور ان کی ماؤں کی قسمت میں شوہر کی مار کھاتے ہوئے دو چار گھروں کی نوکری لکھ دی گئی ہے۔

اپنے بارے میں سوچتے سوچتے میں سماج کی ناہمواریوں اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں میں بھٹک گئی۔ افراد خاندان کی اصلاح، خوشحالی کے ساتھ میں سماج کے مختلف طبقات سے تعلق

والی خواتین سے بھی اتنی ہی ہمدردی رکھتی ہوں۔ ایک صراحت، میں جب بھی بات کرتی ہوں انسانیت کی بات کرتی ہوں، کسی خاص مذہب، طبقے یا فرقے تک میری گفتگو محدود نہیں۔

یہاں مجھے مختصراً لکھنا ہے کہ فہیم اور ظہیر کے واپس چلے جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ اس کی گواہ میری مخلص دوست پڑوسن مسز ثمینہ رضوی ہیں۔ جو مجھ سے بہت خلوص سے ملتی ہیں۔ میں لکھ چکی ہوں کہ اتنے بڑے خاندان میں ایک بھی ایسی خاتون نہیں تھیں جو چند دن ہی سہی مجھے حوصلہ دیتیں یا چند گھنٹوں کے لئے میرے گھر آ جاتیں۔ اس وقت مجھے اپنے سگے بہن بھائی شدت سے یاد آنے لگے۔ وہ قریب ہوتے تو مجھے اس قدر بے بس نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے فلیٹ میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی۔ کبھی ہال میں آ کر بیٹھ جاتی ...... روتے روتے میری چیخیں نکل جاتیں۔ کوئی سننے والا نہ تھا...... بہت برداشت کرتی لیکن سب بے سود۔ کبھی بیٹے سے فون پر بات کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو سنبھال نہ پاتی۔ بیٹی صدمے سے بیمار، دواخانے میں شریک رہی اس سے مجھے اپنی حالت کو چھپانا تھا...... پھر بھی ایک بار اپنے بھائی ظہیر کے ساتھ اُسے دیکھنے، ملنے دواخانہ چلی گئی تھی۔ بہر حال، توفیق صاحب کے گزر جانے کا صدمہ میں سہہ نہ سکی۔ صبر کے لئے لاکھ دعائیں پڑھ لیتی لیکن میرے آنسو تھمتے نہیں تھے ...... اور اب ...... میں پھر رونے لگی۔ ۷ر جولائی رات کے ۹ بجے ہیں۔ میرا قلم رک گیا۔ آنسو البتہ جاری ہیں۔

رات ۱۲ بجے میں نے قلم پھر سنبھالا ہے۔

پتہ نہیں، میں ان صفحات کو کب مکمل کر پاؤں گی۔ میں موت سے ڈرتی نہیں۔ لیکن توفیق صاحب کے انتقال کے بعد سے موت کا انتظار زیادہ رہنے لگا ہے۔ ساتھ ہی ایک انجانا سا خوف ستاتا ہے کہ یہ باب مکمل نہ ہو سکے تو کتاب ادھوری رہ جائے گی۔ جن باتوں کو برسوں سے سینے میں دفن کر رکھا ہے۔ اپنے خیر خواہوں کو بتانا چاہتی تھی کہ حقیقت میں، میں کیا ہوں اور انہوں نے مجھے کیا سمجھا، انجانے میں نہیں جان بوجھ کر۔

دن میں ایک دو بار کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ بعد میں محسوس ہوتا یہ دورہ پڑنے والی جیسی کیفیت ہے جس پر میرا کچھ بھی اختیار نہیں تھا۔ بس رونا اور روتے رہنا۔ دو تین مرتبہ اتنی طبیعت خراب ہوئی کہ مجھے دوا کی شدید ضرورت پڑی۔ اکبرناور میں رہنے والی ایک بہن مسز رفیعہ رفیق کو بے قابو حالت میں فون کر دیا میرا بھانجا مصطفی آ جاتا اور دوا دے کر کچھ دیر بعد تسلی دے کر چلا جاتا۔ میں تصور ہی تصور میں اس قبرستان پہنچ جاتی جہاں توفیق صاحب اپنی ماں کے برابر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کبھی تصور ہی میں میں نے پرس لیا گھر کو قفل ڈالا اور قریبی یشودھا ہاسپٹل پہنچ گئی کہ میں دواخانے میں رہنا چاہتی ہوں۔ بہت دیر بعد اس فرضی دنیا سے نکلتی تو پھر وہی گھر' توفیق صاحب کو سفید چادر اڑھا کر سلا دیا گیا ہے۔ جمعرات کا دن آتا تو ان کے لے جانے کی تیاری' جمعہ 12:30 بجے وہ مسجد جانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ میں ان کی دتی، مسجد میں دینے کے لئے کچھ روپے اور وہاں کے فقیروں کے لئے سکے خیال سے جیب میں رکھتی، ایک بجے تک درود شریف پڑھتے ہوئے جانماز پر بیٹھے ہوتے۔ کھانے کی میز کے پاس ہوتے تو میں ان کے آنے سے پہلے ہی سیب دھو کر رکھ دیتی۔ روٹی جب رکھنے جاتی تو سیب کے کٹے ہوئے ٹکڑے مجھے دیتے۔ میں لاپروائی سے ٹالنا چاہتی تو زبردستی مجھے کھلاتے۔

گلاب ہم دونوں کا پسندیدہ پھول ہے۔ ایک کلی بھی نئی آتی تو بہت خوشی سے کہتے۔ آج نئی کلی کھلی ہے، پھر میں ان کے ساتھ بالکنی میں وہ پودا دیکھ آتی۔ یہ باتیں ہر لمحہ مجھے یاد آتی ہیں اور پھر سوائے رونے کے میرے پاس کچھ نہیں رہ پاتا۔ الماری کھولوں تو کپڑے' دتی' میز پر گھڑی۔ الماری میں رکھے اخبار پر نظر پڑے تو ڈاکٹر وہاب قیصر کا مضمون توفیق صاحب پر لکھا گیا۔ ایک لفافہ دیکھوں تو برہان حسین کا جلسے میں پڑھا گیا مضمون ملتا۔ کہیں نئے مزاحیہ مضامین کے مسودے اور میں بے قابو سی ہو جاتی۔ یہ سب نہ بھی ہوں تب بھی میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ نہ بیٹی سے کچھ کہہ سکی نہ بیٹے سے، مجھے اپنے کھانے کا ہوش نہ رہا۔ صبح اپنی کام والی بچی کے ساتھ کچھ تیار کر لیتی وہ پھر اپنے گھر چلی جاتی۔ مجھے مطلق کھانے سے رغبت نہ رہی

بس زندہ رہنا ہے۔ جو حیات ملی ہے، اُسے پوری کرنا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا مجھ پر کچھ دورہ سا پڑتا۔ مجھے خود نہیں معلوم کیا ہوتا تھا۔ میں بے اختیار رونے لگتی۔ اتنا کہ مجھے اپنی آواز سے خوف ہونے لگتا کہ کہیں پڑوسی سن لیں گے۔ کمرے میں ہوتی تو فلیٹس کے نیچے والی بستی میں رہنے والوں کا ڈر۔ کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آواز بھی مجھے صاف سنائی دیتی تھی۔ یہ تو الگ نوعیت تھی۔ اس ڈر سے کمرے سے ہال میں دیوانوں کی طرح آتی تو سوچتی' میری مخلص دوست مسز ثمینہ رضوی سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں روتے روتے بے قابو ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ دروازے تک جاتی کہ انہیں کچھ دیر کے لئے بلاؤں۔ پھر سوچتی وہ خود میرے لئے پریشان ہیں، انہیں مزید کیسے فکر مند کروں۔ کبھی وہ میرے گھر آتیں تو مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ کر پاتی تھیں۔ میں دروازے کے پاس سے لوٹ آتی اور منہ دھو کر پانی پی لیتی۔ صبر کے لئے دعائیں مانگتی جاتی اپنے رب کو پکار پکار کر۔ امی کہتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف طرح سے آزماتا ہے۔ اُس نے توفیق صاحب کو مجھ سے چھین کر شاید مجھے آزمالیا ہے۔ صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ ہر طرح کی مصیبتوں، پریشانیوں میں ڈال کر، میں اس کی آزمائش میں پوری اتروں گی۔ مجھے اب اتنا اطمینان ہے کہ دور دراز ملکوں میں رہنے والے میرے بھائی بہن میری بیٹی داماد، نواسیاں اور بہو بیٹا اور پوتی میرا خیال رکھتے ہیں۔ میری باقی زندگی وہ میرا ساتھ دیں گے۔ میرے لئے بس یہ سہارا بہت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی یہ بھی ہے کہ اس نے قلم کا سہارا عطا کیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ میں اس کا صحیح استعمال کروں گی۔ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی نہ اس سے کسی کی دل آزاری کا سامان ہوگا۔ اصلاح معاشرہ کے لئے طنز و مزاح نگار، افسانہ نگار، فرضی کردار، واقعات کا سہارا لیتے ہیں۔ مخصوص فرد کو نشانہ بنانے کی بجائے وہ خود نشانہ بنتے ہیں۔ قاری کھلے ذہن سے مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ تو بگڑے سماج کا سدھار ہے،

ہم اس کے مخاطب تو ہیں مگر نشانہ نہیں۔

چہلم، برسی اور بریانی:

میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ مرنے والا تو دنیا سے چلا جائے اور پھر چہلم، برسی کے نام سے بریانی پکا کر اہتمام سے لوازمات کے ساتھ خوشحال لوگوں کو کھلائی جائے۔توفیق صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ایسا نہیں کیا۔رواج کی خاطر بھی نہیں۔میرے خیال میں اس معاملے میں کسی کے کچھ سوچنے یا کہنے کا بھی سوال نہیں۔شرعی لحاظ سے بھی دعوت کا اہتمام غلط ہے۔میرا ضمیر مجھے جو کرنے کی ہدایت دے رہا ہے بس میں وہی کر رہی ہوں۔بالکل مجبور ہوں اپنے ضمیر کی آواز پر۔یٰسین شریف پڑھتی ہوں، صدقہ خیرات دیتی ہوں جو بھی دے سکوں۔زیادہ سے زیادہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ غریبوں کو کھانا کھلا دوں۔اس کے لئے مجھے جب بھی موقع ملتا ہے کھانا پکا کر آسانی سے فراہم ہونے والی غریب عورتوں میں تقسیم کر دیتی ہوں۔فلیٹس میں کام کرنے والی ایسی غریب خواتین مل جاتی ہیں جنہیں ٹھیک سے پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا۔مذہب کی کوئی قید نہیں۔ہر مذہب کے غریب صدقہ خیرات کے مستحق ہیں۔ساس، سسر، والدین اور دیگر مرحومین بھی ذہن میں ہوتے ہیں کہ ان سب کے ایصال ثواب کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے۔

○○○

بڑے گھر کی بیٹی

(اس باب کا ابتدائی حصہ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کو لکھا گیا جب ساس صاحبہ اور میرے شوہر بقید حیات تھے)

جی ہاں!...... بڑے گھر کی بیٹی۔ یہ خطاب مجھے میری ساس محترمہ اشرف النساء بیگم صاحبہ نے دیا تھا۔ جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں توفیق صاحب کی پوری تنخواہ وہ لے لیا کرتیں۔ ٹھیک ہے، اس کی کوئی شکایت نہیں۔ لیکن ہوتا یہ کہ وہ گھر کے لئے ضروری اشیاء بھی منگوانا نہیں چاہتی تھیں۔ کبھی چائے کی پتی کا ڈبہ خالی تو کبھی چاول ندارد مجھے صبح چائے کی عادت ہے، چائے ہی تو پیتی ہوں۔ ہر باذوق، ادب دوست ادب نواز چائے ضرور پیتا ہے۔ ایک دن میں نے چائے بنانے کے لئے کیتلی چولھے پر رکھی۔ چائے کی پتی کا ڈبہ خالی تھا۔ مجھے جواب ملا کہ پتی ختم ہوگئی۔ پیسے نہیں ہیں۔ پھر اپنے آپ، یعنی توفیق صاحب کو سنانے کے لئے کہنے لگیں ''میں جبھی بولی تھی، بڑے گھر کی بیٹی ہے نہیں نبھے گی'' میں خاموش تھی، توفیق صاحب بھی خاموش تھے کیونکہ ایسے بیسیوں واقعات ہوئے، بے شمار مقامات ایسے آئے جبکہ علانیہ ناانصافی ہورہی تھی، غلط بیانی ہورہی تھی وہ خاموش ہی رہتے۔ ایسے لگتا کہ کسی بڑی کمپنی کا مضبوط قفل ان کے منہ پر ڈال دیا گیا ہے۔ بہرحال...... مجھے اپنی خودنوشت کے لئے عنوان ''بڑے گھر کی بیٹی'' صبح چائے نہ ملنے کی وجہ سے ہی ملا۔ چائے کی پتی کے اُس خالی ڈبے کو میں سلام کرتی ہوں!!

شادی کے چند دن بعد ہی میں اپنی نند کے ساتھ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ کیونکہ میں ان دلہنوں میں سے نہیں تھی جو پانچ جمعگیوں تک پلو میں کھوپرے کی بٹی باندھے گھر، گھر کے کام سے بے خبر رہتیں۔ کام کی تقسیم خود بہ خود ایسے ہوگئی کہ ناشتہ میری نند اختر تیار کرتیں اور

دوپہر، شام کا پکوان میں کرلیتی۔ گوشت، ترکاری اور دیگر چیزوں کی خریداری میں، توفیق صاحب یا میرا کوئی دخل، کوئی مشورہ نہ ہوتا۔ جو ساس صاحبہ لاتیں وہی پکا دیا جاتا۔ میں نے کبھی اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ میں کہہ چکی ہوں کہ ہمارے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا۔ میری ساس دنیا سے نرالی فطرت لے کر دنیا میں آئیں۔ سسرال کے سبھی لوگ ان کی عادتوں کے شاکی تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے گھر اور گھر کے افراد کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ تین ہی افراد تھے، ساس، نند اور شوہر۔ توفیق صاحب کے تعلق سے میں ابتدا ہی میں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ وہ انتہائی خاموش طبیعت اور شریف النفس انسان ہیں۔ بے حد خوددار اور حساس۔ مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ میں اور اختر بہت ہی اچھے انداز، دوستانہ ماحول میں گھر کا کام کرلیا کرتے۔ کبھی کوئی مسئلہ یا اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا لیکن ساس صاحبہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کام کرے۔ انہوں نے جان بوجھ کر مسائل پیدا کرنے شروع کئے۔ مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتیں۔

اسکوٹر اور تفریح:

ملازمت کے ابتدائی دور میں بس کے ذریعہ کالج جاتی تھی۔ اس کے بعد توفیق صاحب کے ساتھ اسکوٹر پر جانے لگی۔ ساس صاحبہ کو ہم دونوں کا روزانہ باہر جانا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ مطلق نہیں چاہتیں کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ اللہ کی نیک بندی یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ہم کہاں جاتے ہیں اور کیوں جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی میں نے ان کے طعنے سنے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں بلاوجہ گھومتی ہوں۔ ہمارے کالج جانے کے بعد کبھی معصوم بچوں کے سامنے دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ ایک دفعہ میری بیٹی عفت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مماں! آپ اور بابا کے کالج جانے کے بعد امی بول رہی تھیں ''اماں اسکوٹر پہ تفریح کو جاتے'' یہ بات مجھے بہت بُری لگی، سخت تکلیف ہوئی کہ میں گھر کا سارا کام کاج کر کے، بچوں کا، ساس کا کھانا میز پر رکھ کر ملازمت کے لئے جاتی ہوں۔ رات کو دس بجے آ کر روٹی پکاتی ہوں اور مجھے وہ اس طرح طعنے

دے رہی ہیں۔ میں بہت روئی، ان کا یہ جملہ ''اماں اسکوٹر پر تفریح کو جاتے'' میرے ذہن سے کبھی نہیں نکلتا۔ گھر سے کالج کا فاصلہ سولہ کیلومیٹر، راستے انتہائی خراب، سڑکیں خستہ اور سنسان، کوئی ہمیں مار کر پھینک دیتا تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہم اللہ تعالیٰ کا نام لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ آیتہ الکرسی کا وِرد رہتا ہے، طبیعت تھک جاتی ہے۔ سارا خاندان اور محلے کے لوگ داد دیتے ہیں۔ بزرگ دعائیں دیتے ہیں۔ والدین جب پاکستان سے آتے ہیں تو میرے پاس ہی ٹھہرتے ہیں۔ سارا حال ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ مگر وہ ہیں بڑے صابر خصوصاً والدہ۔ یہی صبر وراثت میں مجھے ملا ہے۔ امی نے کبھی اس معاملے میں کچھ نہیں کہا۔ نہ توفیق صاحب سے اور نہ ہی اپنی سمدھن سے۔ ان کی فطرت کے بارے میں کیا کہوں۔ لاکھوں خواتین میں ایک ہیں۔ توفیق صاحب کو بہت چاہتی ہیں۔ اپنی سمدھن کی بہت عزت کرتی ہیں۔ ہم دونوں پانچ بجے گھر سے نکلتے ہیں اور رات دس یا ساڑھے دس بجے گھر لوٹتے ہیں۔ واپسی میں بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لیتے ہیں۔ میری خالہ صاحبہ، بیگم ڈاکٹر یوسف مرزا ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں۔ توفیق صاحب کبھی مجھے کالج چھوڑ کر ان کے گھر چلے جاتے ہیں اور رات کا کھانا کبھی ان کے پاس کھالیا کرتے ہیں۔ کیونکہ خالہ صاحبہ کا خلوص ہے کہ وہ کھانے پر اصرار کرتی ہیں۔ اب اگر گھر آ کر توفیق صاحب صرف یہ کہہ دیں کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں وہ گھر میں ہنگامہ کر دیتی ہیں۔ طعنوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ وہ نہیں چاہتیں کہ ہم کہیں جائیں۔ وہ کچھ نہیں کہتے، نہ میری زبان سے کچھ نکلتا ہے۔ بس سنتے ہیں اور خاموش، اندر ہی اندر دونوں کڑھتے ہیں۔ بچوں پر ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنا شعور دیا ہے کہ گھر میں ہونے والی یہ باتیں کمرے تک ہی محدود رکھتے ہیں۔

اختر کی شادی کے بعد پورا کام میں کرتی ہوں۔ میری طبیعت چاہے کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، وہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ اپنے مخصوص ٹھکانے پر بیٹھی کھانا، چائے، پان اور مقررہ وقت پر دیگر چیزیں کھالیتی ہیں۔ اخبار، 'شمع پڑھ لینا' کاغذ پر کچھ ڈرائنگ کر لینا یا سلائی۔

بس اسی میں مصروف' اتنے برس یوں ہی گزر گئے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ یہ میرے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہیں۔ میں حد درجہ حساس ہوں۔ ماں باپ کی چہیتی، بھائی، بہنوں کا پیار پانے والی۔ ماں باپ نے کبھی مجھ سے تیز لہجے میں بھی بات نہیں کی۔ یہاں آ کر جو حشر ہو رہا ہے وہ روتے روتے سب سہہ گئی۔ صبح ناشتہ، چائے، دودھ وغیرہ ان کی میز پر لا کر رکھ دیتی ہوں۔ ابتدا ہی سے وہ سب سے الگ بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں۔ انہیں وہم ہے کہ کوئی دیکھ لے تو نظر لگ جاتی ہے۔ اس کے لئے دعائیں پڑھوانا اتارے کروانا یہ معمولات ہیں۔ بہر حال، جب شام کو اورینٹل اردو کالج جاتی تب بھی بچوں کا کھانا دستر خوان پر رکھ دیتی، ان کا کھانا الگ قریب رکھ کر جاتی۔ اس پر بھی وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ مسائل نکالتی ہی رہتیں کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔ میں انہیں سمجھاتی رہی کہ آپ پورے خاندان کے لوگوں سے مقابلہ کر کے دیکھیے، اللہ کے فضل سے آپ ہر طرح خوشحال ہیں، آرام سے ہیں، لیکن بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بس ایک ہی بات ان کے دل میں وہ یہ ہے کہ میں جس طرح روزانہ جاتی ہوں وہ بھی اسی وقت گھومنے جائیں۔ بعد میں انہوں نے یہ معمول بنایا کہ اتوار کے دن یا کبھی کام کے دنوں میں ایک دم سے اتنا پریشان کر دیتیں کہ مجبوراً گھر سے خاندان کے کسی فرد کے پاس چھوڑ دینا ہوتا۔

جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں میں کام سے بالکل نہیں گھبراتی۔ لیکن کبھی طبیعت خراب ہو تب بھی وہ میرا ساتھ نہیں دیتیں۔ ایک دو ایسے واقعات ہیں جنہیں میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتی۔ توفیق صاحب گسٹ ہاوز گئے ہوئے تھے۔ دونوں چھوٹے بچے اور ساس صاحبہ گھر میں تھے۔ میں نے دہی کی کڑی کے لیے بھجیئے تل کر کڑی میں ڈالے۔ تیل کم کر کے کڑی بگھارنی تھی۔ تیل کے ڈبے کو ہاتھ سے پکڑ کر کڑائی سے تیل انڈیل دیا۔ کھولتا ہوا تیل بائیں ہاتھ پر گر گیا۔ مجھے چکر آ گیا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا شدید تکلیف سے میں رونے لگی۔ بچے پریشان ہو کر پوچھنے لگے کیا ہوا مماں آپ کو؟ شاید کسی کو یقین آئے نہ آئے انہوں نے جھوٹی تسلی کے

لئے بھی نہ پوچھا کہ کیا ہوا۔ توفیق صاحب آئے، دواخانے لے گئے چند دنوں میں چھالا اتنا بڑھ گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے کاٹ کر ڈریسنگ کی۔ کئی مہینے ہاتھ میں شدید تکلیف رہی۔ اس تکلیف سے میں بیلن پکڑ نہیں سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے روٹی پکاتی، کھانا سالن سبھی پکانا ہوتا۔ لیکن انہوں نے باورچی خانے کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ ایک پالیسی ہے۔ وہ خود کو ہمیشہ بیمار ظاہر کرتی ہیں۔ سوچتی ہیں کہ اگر ایک مرتبہ چولہے کے پاس جاؤں تو پھر کام لگ جائے گا۔ بہر حال ہاتھ جلنے سے جو تکلیف رہی اسے میں بھول نہیں سکتی۔ اپنی امی کو یاد کر کے خوب رو لیتی ہوں کہ وہ ہندوستان میں ہوتیں تو میری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ تقریباً ۳۸ سال گزر گئے۔ تیل سے جلے ہوئے نشان میرے بائیں ہاتھ پر اب تک موجود ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں ہمارا گھر شہر سے بہت دور تھا۔ روزانہ کئی کیلومیٹر کا راستہ اسکوٹر سے طئے ہوتا۔ ایک دن میرے سیدھے ہاتھ میں درد ہونے لگا۔ کالونی کے فیملی ڈاکٹر سے رجوع ہوئی۔ کچھ دوائیں وغیرہ دیں لیکن کم نہیں ہوا۔ انہوں نے ایکسرے کروانے کا مشورہ دیا۔ پتہ چلا کہ کہنی میں **Jerk** ہے۔ یہ اوبڑ کھابڑ راستوں کی دین تھی۔ تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ نمس ہاسپٹل لے جایا گیا۔ وہاں ہفتہ میں ایک دن کہنی پر انجکشن دیا جاتا تھا آپریشن تھیٹر میں یہ علاج ہوتا۔ متاثرہ حصے کو سن کر دیا جاتا۔ کچھ دیر بعد میں توفیق صاحب کے ساتھ گھر واپس ہوتی۔ دوا کا اثر زائل ہونے کے بعد انجکشن کی تکلیف شروع ہو جاتی۔ میں ان سے کہتی کہ تھوڑی دیر کے لئے اسکوٹر روک دیں۔ یہ تکلیف ایسی تھی کہ برداشت کرتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے۔ کئی دن یہ علاج چلتا رہا۔ اس وقت بھی میری ساس نے مجھ پر رحم نہیں کھایا۔ وہی وقت پر ان کا کھانا تیار کرنا، بچوں کی تیاری، ان کا کھانا وغیرہ رکھ کر مجھے کالج جانا ہوتا۔ سردی بخار ہو یا شدید کھانسی میں گھر کا کام کئے جاتی۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، بغیر کچھ کام کئے ہی ساس صاحبہ مختلف مسائل پیدا کرتیں۔ ہم دونوں کو ذہنی اُلجھن میں مبتلا کرتیں۔ جتنی زندگی انہوں نے گزاری کبھی

انہیں خوش نہیں پایا۔کبھی وہ مطمئن نہیں رہیں۔ ہمیشہ شکوہ شکایت۔ بہو کا برتاؤ ان کے خیال میں ان سے اچھا نہیں تھا۔ محلے میں، خاندان بھر میں میری شکایتیں کرتیں۔ میرے مائیکے والوں سے بھی میری شکایت، سسرال کے لوگ میری فطرت، میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے وہ سن کر ظاہر ہے یقین نہیں کرتے تھے پھر بھی جب یہ باتیں مجھ تک پہنچتی تھیں تو میں بہت روتی تھی، روتے روتے میری آنکھیں سوجھ جاتی تھیں۔لیکن بچوں کو ان باتوں سے دور رکھنا چاہتی تھی اس لئے ان کے سامنے نہیں روتی تھی۔ پُر خلوص دوست اورینٹل کالج کی فارسی کی لکچرر ڈاکٹر ذکیہ سلطانہ سے بھی میں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔

ویمنس کالج میں جز وقتی لکچرر شہناز وقار آتی تھیں۔ وہ چہرہ شناس تھیں۔ میرے چہرے کو زہ پڑھ لیتی تھیں لیکن میں تفصیل بتا نہیں سکتی تھی کہ میری آنکھیں کیوں سوجھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح شعبۂ ہندی کی ڈاکٹر کرانتی اکثر میرے پاس آکر بیٹھتیں۔کبھی وہ مجھے اداس پاتیں یا آنکھوں کو دیکھتیں تو فوراً پوچھ بیٹھتیں۔ ڈاکٹر میمونہ جو میرے ہی شعبہ میں لکچرر ہیں بے حد خلوص والی۔ میں نے ان سے بھی کبھی ان گھریلو پریشانیوں کا ذکر نہیں کیا۔ کتاب ہی سے انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی آپا کیا کیا سہہ گئیں۔ سگے بہن بھائی جن سے ہر سال پاکستان میں ملاقات ہوتی ہے، حیدرآباد بھی آتے رہتے ہیں۔ والدین، خصوصاً والدہ سے بھی میں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔ حیدرآباد میں رہنے والی میری خالہ صاحبہ جن کے پاس میں بچپن میں رہا کرتی، اب بھی وہ مجھے بے حد چاہتی ہیں انھیں بھی ان باتوں کا علم نہیں۔ میرے خالہ زاد بہن بھائی بھی ان دل آزار باتوں سے ناواقف ہیں۔ کسی کے دل میں شاید یہ سوال اُبھرے کہ ساس کے تکلیف دہ رویے کا ذکر میں نے کسی سے کیوں نہیں کیا۔ شاید اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہو۔ مجھ میں اتنا صبر کیسے آ گیا، میں خود نہیں جانتی۔ گذشتہ دنوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے خود اپنے آپ پر یقین نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس گھر کی بہو اس لئے بنایا کہ خاندان کا سدھار ہو، خاندان بکھرنے نہ پائے اور توفیق صاحب کو مزید ذہنی اُلجھنوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

سسرالی رشتہ دار مجھے شاباشی دیتے ہیں۔ ہر ایک کی زبان پر بس یہی ہے کہ بہت اچھی بہو ہے۔ حقائق کا اظہار ہے، خودستائی نہیں۔

میرے سسرالی رشتہ داروں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ سبھی میری ہمت بندھاتے رہے۔ ساس کی فطرت کے بارے میں مختلف واقعات، مختلف باتیں سنا کر مجھے تسلی دیتے رہے۔ سب سے پہلے میں توفیق صاحب کے خالو جناب سید غفور حسین صدیقی، ان کی بیگم محترمہ افضل بیگم صاحبہ (پاشاہ خالہ) کا ذکر کروں گی۔ پاشاہ خالہ صاحبہ ابتدا سے ہی مجھے سمجھاتی رہیں۔ وہ اپنی بہن کو ہر طریقے سے سمجھاتیں، بلکہ تنبیہ کرتیں کہ بہو بہت حساس ہے، سمجھ دار ہے، اُسے طعنے نہ دیں۔ لیکن کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ غفور حسین صاحب کے چار لڑکے اور ایک لڑکی بشیر بانو ہیں۔ یہ وہی بشیر بانو ہیں جنہوں نے اتنا اچھا شریک زندگی مجھے دلوایا۔

مظفر حسین صدیقی ان کی اہلیہ محترمہ صفیہ بانو، مشہور مزاح نگار برہان حسین صدیقی سائنٹسٹ آر آر لیب، ان کی اہلیہ محترمہ سکندر جہاں یہ سب میرا بہت خیال رکھا کرتے اور اب بھی رکھتے ہیں۔ انتہائی خلوص سے ملتے ہیں۔ میں اپنے مائکے والوں سے ساس صاحبہ کی ذہنیت کا ذکر نہیں کرتی۔ ان لوگوں کے سامنے بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ مجھے آگاہ کرتے ہیں کہ کس طرح میری ساس نے اپنا گھر تباہ کرلیا۔ سید اکبر حسین صدیقی اور صدیق نظام ان بھائیوں کا قیام بیرون ملک ہے۔ بشیر کو میری طبیعت کا اندازہ ہے وہ بھی مسلسل مجھے حوصلہ دیتی رہتی ہیں۔ حالات سے میں نے سمجھوتہ تو کرلیا لیکن سارے سسرالی رشتہ دار یہ جان گئے کہ مجھ پر کتنا ظلم ہوا، کتنی زیادتی ہوئی۔

سعید الدین عرف قمران کی بیگم آصف اور لڑکے علیم اور سلیم ہر طرح سے میرا خیال رکھتے ہیں۔ پریس فوٹوگرافی کی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے علیم اور سلیم میرے ایک فون کرنے پر آجاتے ہیں اور پوچھتے ہیں چاچی جو بھی کام ہے کہیے۔ ان سب کے لئے دعاؤں کے سوا اور میں کیا کرسکتی ہوں۔ توفیق صاحب کے انتقال کے بعد سسرال کے یہ سب رشتہ دار

مجھے جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ بشیر میری نند ہیں اس سے زیادہ پرخلوص دوست ہیں۔ برسوں وہ بھی میری ذہنی تکالیف کے بارے میں دیکھتیں سنتیں اور اس پر پریشان بھی ہو جایا کرتیں۔ بس توفیق صاحب کی چاہت نے ڈھارس دی اور ان کی مجبوریوں کا احساس کر کے میں چپ ہی رہی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ان حالات میں بھی گھر کو ٹوٹنے نہ دیا...... بہرحال میرے یہ سب رشتہ دار ٹیلی فون پر بات کر کے یا کبھی گھر آ کر مجھے تنہائی کا احساس ہونے نہیں دیتے۔

آگے اور رشتہ داروں کا ذکر آئے گا۔ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس طویل عرصہ میں قدم قدم پر میرے لئے سخت آزمائشیں تھیں۔ میری مسلسل یہی کوشش رہی کہ گھر کو بکھرنے سے بچالوں۔ ہمارے کالج سے واپس آنے تک وہ اکثر کوئی نہ کوئی پریشانی کی بات یا دل آزار بات کہہ دیتیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بچوں کی پروا کئے بغیر وہ اپنے کسی رشتہ دار کے پاس جانے کا پروگرام بنالیتیں۔ دس پندرہ دن بالانگر سے شہر آ جاتیں۔ وہ مطلق نہیں سوچتیں کہ گھر کی بڑی ہیں۔ ان پر بھی کچھ ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے جب میں بھی ملازمت کر رہی ہوں تو معیار زندگی بڑھانے کے لئے ہی کر رہی ہوں گی۔ جو روپیہ آئے گا وہ گھر پر ہی خرچ ہوگا۔ بچوں کے مستقبل میں کام آئے گا۔ بہرحال وہ اچانک جانے کا پروگرام بنا بیٹھتیں۔ کبھی کمر کی تکلیف کا علاج جراح سے تو کبھی کچھ اور۔ حالانکہ ایسا کوئی مرض نہیں تھا جس کا علاج ہمارے محسن، فیملی ڈاکٹر رتن سنگھ کے پاس نہ ہو۔ انہوں نے اور ان کی بیگم صاحبہ اور بچوں نے بھی ہمارا بہت ساتھ دیا۔ انہیں سمجھایا بھی کہ چین سے گھر میں رہیں۔ لیکن سب بے سود، جب وہ گھر سے چلی جاتیں تو ہم اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے بارے میں سوچتے۔ اوپری کام والی صبح شام آکر چلی جاتی۔ ایسے وقت محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ جناب شیخ احمد عمودی جو آئی ڈی پی ال ہی میں برسرروزگار تھے وہ ہمارے بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے اور ان کی بیگم محترمہ صالحہ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ ان دونوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ صالحہ بیگم صاحبہ کے پاس ہم دونوں بچوں کو کالج جاتے ہوئے

چھوڑ دیتے۔ کتابیں، گرم کپڑے اور کبھی واٹر پروف بھی...... ہماری واپسی تک وہ ان دونوں کا خیال رکھتیں۔ کھانا کھا لینے کے بعد اگر وہ سونے لگتے تو کسی طرح کہانیاں سنا کر انہیں جگائے رکھتیں تا کہ اسکوٹر پر لیجانے کے لئے مشکل نہ ہو۔ شکریہ تو ادا نہیں کرسکتی۔ دعائیں دے سکتی ہوں۔ میں سوائے کالج کے کالونی میں کسی گھر نہیں جاتی تھی۔ یہ ابتدا ہی سے میرا اصول تھا، یا طبیعت کا تقاضا کہ گھر سے کہیں اور نہیں نکلتی تھی جبکہ وہ روزانہ مارکٹ سے لے کر کسی نہ کسی کے گھر اور دواخانہ کا چکر ضرور لگا آتیں۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ میری ''شہرت'' تو دور دور تک پھیل گئی ہے۔ کالونی میں کوئی تقریب ہوتی اور کبھی میں چلی جاتی تو بعض خواتین عجیب نگاہوں سے دیکھتیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ضرور میرے بارے میں غلط باتیں پھیلا دی گئی ہیں۔ لیکن جھوٹ بہت دنوں تک کام نہیں کرتا۔ اس کا اثر زائل ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ کالونی کے لوگ ان سے واقف ہو گئے۔

ایک ہاتھ کی تالی:

نند بھاوج کا جھگڑا ہو کہ ساس بہو کا، دو دوستوں میں رنجش ہو جائے یا پڑوسیوں میں نا اتفاقی، ایک دوسرے کی شکایت، خاندان بھر میں کی جاتی ہے۔ عموماً ہر دو فریق مختلف لوگوں تک مختلف طریقوں سے رسائی کرتے ہیں اور پھر کیچڑ اُچھالنے کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں پر سننے والے بعد میں یوں کہتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی کچھ تو قصور ہوگا اُن کا بھی۔ بات خواہ کسی قسم کی ہو، موضوع چاہے کچھ بھی ہو، کہنے والے دعوے سے یہی کہتے ہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میرے سسرال میں بھی برسوں تالی بجی ہے لیکن ہمیشہ ایک ہاتھ کی! اللہ تعالیٰ کی مصلحت، مہربانی، کرم جو بھی تھا، اُس نے مجھے اور توفیق صاحب کو ہر قسم کی غلط باتوں کو سہنے، برداشت کرنے کا سلیقہ عطا کیا تھا۔ کبھی ساس صاحبہ کی شہ پر میری نند اختر بھی منہ کھولتی تھیں۔ دیکھنے میں وہ مجبور، مظلوم سی لگتی تھیں لیکن ماں کی ہمت پر وہ مسئلے کھڑے کرتی تھیں۔ ان کے طعنے بھی بڑے جان دار، جان لیوا ہوتے تھے۔ شادی کے بعد ان کی عادتیں

بدل گئیں۔قسمت سے سسرال بہت اچھا ملا۔ بات ہو رہی تھی تالی کی، تو ہوتا یہ کہ Sadism کی شکار میری ساس محترمہ محلے، خاندان، دوست احباب، سبھی سے میرے بارے میں جو کہنا چاہتیں کہہ دیتیں۔ بالا نگر میں ہمارے فیملی ڈاکٹر، رتن سنگھ صاحب تھے۔ بہت ہی قابل، خاموش طبیعت۔بس مرض کی حد تک مریض سے بات کرتے۔ ہم سبھی کو جب بھی ضرورت ہوتی انھیں سے رجوع ہوتے۔ڈاکٹر صاحب کی بیوی سے بھی تقاریب میں ملاقات ہوتی۔ ساس صاحبہ ڈاکٹر صاحب سے تو شکایتوں کے دفتر کھولتی ہی تھیں۔ان کے گھر جا کر ان کی بیوی سے بھی اپنی فرضی بیماریوں اور فرضی مجبوریوں کا ذکر پریشان کن انداز میں وقتاً فوقتاً کرتی ہی رہتیں۔سب کی ہمدردیاں سمیٹنی جو تھیں انھیں! مجھے بہت بعد پتہ چلتا کہ میرا تذکرہ کس انداز میں ہوتا ہے۔

میں یہ واضح کر چکی ہوں کہ خودنوشت کا اہم باب بڑے گھر کی بیٹی ۱۹۸۸ء میں، میں نے لکھنا شروع کیا تھا ادھورا، نامکمل، بکھرا بکھرا سا پڑا رہ گیا۔اس دوران میں نے پریشانی کے عالم میں ایڈیٹر سیاست اور ڈاکٹر مجید خاں کے نام کتنے ہی خطوط لکھ ڈالے جو الماری میں رکھے رہے۔کبھی دس، دس، بارہ بارہ صفحات بھی لکھے۔اب جب میں نے دوبارہ قلم اٹھایا پرانی فائلیں نکالیں تو یہ کاغذات ہاتھ آئے۔ مجھے خود پتہ نہیں کہ میں نے کن حالات میں لکھا تھا۔ان سب میں بس یہی ہے۔ذہنی تناؤ، شدید احساس اپنی بدنامی کا، یعنی میرے برتاؤ، میرے رویہ، سلوک کے بارے میں سراسر غلط باتیں، ایسی باتیں جو میں نے کبھی کہی نہیں، ایسے کام جو میں نے کبھی کئے نہیں۔ بہرحال اب میں سوچتی ہوں کہ اسی وقت مجھے ڈاکٹر مجید خاں سے رجوع ہونا چاہئے تھا، یا ایڈیٹر سیاست سے اپنے حالات بیان کر دینا بہتر تھا۔لیکن ایسا نہ کر سکی۔

مجھے اپنے آپ پر اپنے رویہ پر پورا بھروسہ ہے کہ میں نے توفیق صاحب کو کتنا سکون دیا، کتنا ان کا خیال رکھا کوئی تیز مزاج، خودغرض ہوتی تو گھر کو جہنم بنا دیتی اور شوہر کو لے کر الگ چل دیتی جیسا کہ کئی گھروں میں ہو رہا ہے۔ دونوں بچوں نے بھی پرسکون ماحول کے
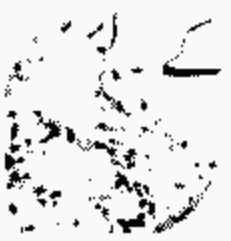
ساتھ دیا۔ کبھی کوئی تلخ بات نہیں کی، تیز لہجہ اختیار نہیں کیا۔ دونوں دل و جان سے انھیں چاہتے تھے۔ اپنی دادی کی بے تکی باتیں دونوں سنتے تھے۔ انھیں یہ بھی کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ مجھے پریشان کرتی ہیں۔ مختلف قسم کے مسائل پیدا کرتی ہیں۔ دونوں بچے بھی ان کے طنز کے تیروں سے محفوظ نہیں رہے۔ میں انھیں شاباشی دوں گی کہ کبھی پلٹ کر ان سے تلخ کلامی نہیں کی۔ اسے میری تربیت ہی سمجھئے۔

گھر بکھرا تو کیسے:

عورت کے مختلف روپ ہیں۔ کئی رشتوں میں یہ بندھی ہوئی ہے۔ ماں، بیٹی، بہن، بیوی، پھر کہیں ساس ہے تو کہیں نند، بھاوج، دیورانی، جٹھانی اور بہت کچھ۔ کسی کی دوست ہے کسی کی دشمن۔ کسی کی پڑوسن ہے تو کسی کی سوکن۔ آخری رشتے سے اللہ ہر عورت کو بچائے آمین۔

عورت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اچھائیاں بے شمار ہیں۔ خامیوں کو وہ دور کرسکتی ہے۔ ایک عورت گھر کو بنانے، سنوارنے اور رشتوں کو نبھائے رکھنے کی جہاں تنہا ذمہ دار ہے، وہیں اس کی ذرا سی لغزش سے بھرے پُرے گھر دیکھتے ہی دیکھتے بکھر جاتے ہیں۔ میں جس گھر کی بات کررہی ہوں وہ میرا ہی گھر ہے سسرالی گھر، جو میرے قدم رکھنے سے پہلے بکھر چکا تھا۔

میرے سسر جناب سید یوسف الدین پولیس میں امین کے عہدہ پر فائز تھے۔ توفیق صاحب اپنے والد کے بارے میں کہا کرتے کہ ابا جان کا رنگ انتہائی گورا، سرخی مائل تھا، لوگ انھیں لال امین صاحب کہتے تھے۔ ان کی شخصیت بارعب تھی۔ میں نے اپنے سسر صاحب کو نہیں دیکھا کیوں کہ ان کا انتقال ۱۹۶۲ء یعنی ہماری شادی سے ایک سال قبل ہو چکا تھا۔ طبیعت کے بارے میں توفیق صاحب کے علاوہ بھی سسرالی رشتہ دار کہتے تھے کہ وہ غیر معمولی خوبیوں کے حامل تھے۔ انتہائی خوددار، ایماندار، فرض شناس اور بیوی بچوں کو چاہنے والے۔ شوہر کی

چاہت کا بدلہ چاہت ہی سے دیا جانا چاہئے۔ کئی بیویاں یہی کرتی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ شوہر کی چاہت کا استحصال کیا گیا۔ میرے سسر محترم اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے۔ ان کی ہر بات کو در گزر کرتے، گھر کی ذمہ داریوں سے دور رہ کر وہ سارا کام نوکرانیوں کے بھروسے چھوڑ دیتیں۔ اس کی بھی وہ پروا نہ کرتے۔ پولیس کی اہم ذمہ داریوں کی وجہ سے انھیں مختلف اضلاع جانا ہوتا۔ لیکن ان کی شریک حیات چاہتی تھیں کہ وہ حیدرآباد ہی میں رہیں۔ دوست احباب، رشتہ دار، سیر تفریح، سب سے زیادہ یہ کہ وہ چوں کہ بہت زیادہ وہمی بھی تھیں، موت کا ڈر ہمیشہ لگا رہتا تھا اس لئے ان کا خیال تھا کہ گاؤں میں ڈاکٹر نہیں ہوتے۔ بیمار پڑیں گی تو علاج کیسے ہوگا۔ وہم اپنی جگہ، لیکن ان کی خود غرضی اور لاپروائی نے خاندان کو بکھیر دیا۔ توفیق صاحب کہا کرتے تھے کہ ابا جان، امی کو بہت چاہتے تھے۔ روپیہ پیسے کی حفاظت کے معاملے میں لاپروا تھیں تو گھر کے دالان اور کمرے میں چھوٹی تجوریاں انھوں نے بنوادی تھیں کہ جہاں بیٹھیں کم از کم روپئے مقفل رہیں۔ گھر کی سجاوٹ کے لئے عمدہ قسم کے پیتل کے بڑے گلدان انھوں نے بنوائے تھے۔ بہرحال بیوی بچوں کو وہ بہت چاہتے تھے۔ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اضلاع پر چلنے کے لئے وہ اصرار کرتے۔ کبھی کہتے کہ میں وہاں اکیلا رہتا ہوں۔ پولیس کے جوان ساتھ ہوتے ہیں۔ خاندان والوں کی کمی کو وہ شدت سے محسوس کرتے۔ اپنے کھانے کے بارے میں کہتے کہ کھانا ڈھنگ کا نہیں کھا سکتا۔ تمام باتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ انھیں ساتھ جانا تھا نہ گئیں۔ ہاں۔ توفیق صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ ابا جان جب بھی گھر آتے وہ کچھ نہ کچھ پریشان کن مسائل ضرور سامنے رکھتیں۔ کبھی بیماری کا ذکر، کبھی خاندان والوں کا شکوہ۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ میرے سسر نے دوسری شادی کر لی۔ بس، یہیں سے گھر بکھر گیا۔ یوں بھی مردوں کی دنیا کا دستور ہے کہ جب دوسری شادی رچا لیتے ہیں تو پہلی بیوی کو اولاد سمیت گہری کھائی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ توفیق صاحب اپنی پچھلی زندگی کے ان حادثات کو بھلا نہ پائے۔ مجھ سے کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ کبھی کہتے لوگ جو خونی رشتوں کا ذکر

کرتے ہیں سب بیکار کی باتیں ہیں۔ ان کے ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لئے میں ہمیشہ انھیں تسلی دیتی کہ اب جانے دیجئے جو ہو چکا سو ہو چکا۔

ماں کی غلطیوں کا خمیازہ اولاد کو بھگتنا پڑا۔ دوسری شادی کرنے کے بعد بیوی کے ساتھ ساتھ دونوں بچوں سے بھی غفلت برتنی شروع کی۔ توفیق صاحب کو زمانۂ طالب علمی ہی میں ملازمت کرنی پڑی۔ بی اے اور ایم اے کی تکمیل بعد میں کی۔ محلۂ یاقوت پورہ میں ذاتی گھر تھا کشادہ صحن، چار ملگیاں بھی تھیں۔ اپنی والدہ اور بہن اختر کے ساتھ اسی گھر میں رہتے تھے۔ ایک دن انھیں اپنے والد اور علاتی والدہ کا پیام ملا کہ وہ گھر خالی کردیں۔ فروخت کر کے اختر کی شادی کا انتظام کیا جائے گا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ ان تینوں نے گھر خالی کردیا لیک ویگسٹ ہاوز منتقل ہو گئے۔ مقررہ دن رجسٹریشن آفس گئے۔ یہ لوگ ایک دروازے کی جانب باہر منتظر کھڑے تھے۔ رقم لے کر دوسرے دروازے سے دونوں نکل گئے۔ اختر کی شادی کا ذمہ توفیق صاحب ہی کو لینا پڑا۔ یہ تو ہوئی جائیداد کی بات۔ ملنے ملانے کا سلسلہ بھی منقطع رہا۔ توفیق صاحب کہتے تھے کہ ابا جان بیمار ہوئے تو انھیں حیدرآباد لایا گیا لیکن رہتے تو وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہی۔ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

توفیق صاحب کے دادا کی آبائی جائیداد تھی اب بھی ہے۔ قدیم ایرپورٹ کی کئی ایکڑ پر پھیلی زمین انھیں کی تھی۔ اس جائیداد میں خاندان کے اور لوگ بھی حصہ دار تھے۔ توفیق صاحب کے والد اضلاع پر رہتے تھے اور ہیرا پھیری کرنے والوں سے نپٹ نہیں سکتے تھے تو مختلف وقتوں میں جب بھی زمین فروخت ہوتی انھیں برائے نام حصہ دے دیا جاتا یا کبھی نہیں دیا جاتا۔ ان کے انتقال کے بعد توفیق صاحب سے خاندان والوں نے ناانصافی کی۔ یہ ناانصافی میں نے بھی دیکھی ہے۔ ایرپورٹ کی زمین فروخت ہوتی گئی۔ لوگ کھاتے رہے فرضی قصے گھڑتے گئے کہ غنڈوں نے قبضہ کر رکھا ہے یا فلاں ایجنٹ نے دھوکہ دے دیا۔ ایک دفعہ ہزار روپیہ دیے گئے کہ یہ بیعانہ کے طور پر حصہ میں دیا جا رہا ہے۔ اس رقم میں توفیق

صاحب کے بیس ہزار دو بہنوں کے ۱۵ ہزار اور والدہ کے ۵ ہزار۔ اس طرح میں نے اس امانت کو سب تک پہنچا دیا۔ بیس پچیس ہزار اور ایسے ہی ملیں ہوں گے۔ باقی ساری زمین کے لاکھوں روپیے بدنیت لوگوں نے ہڑپ کر لئے، اب بھی کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک اور بہت بڑا باغ ہے یہ بھی ان ہی لوگوں کا ہے۔ جو افراد خاندان کسی کی حق تلفی کر رہے ہیں وہ خدا کے پاس جواب دہ ہوں گے۔ آبائی جائیداد سے محرومی، حق تلفی اور ناانصافی کا ذکر جب بھی توفیق صاحب کرتے، میں انھیں یہی سمجھاتی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہے۔ ہم عزت کی زندگی گزار رہے ہیں خوش حال ہیں۔ اور جو لوگ حق تلفی کر رہے ہیں وہ سب کچھ لے لینے کے باوجود بدحال ہیں۔

میری ساس محترمہ نے اس زمانے کے لحاظ سے ہائی اسکول تک کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن وہ بڑی ذہین تھیں۔ سلائی پکوان میں ماہر۔ ڈرائینگ بہت اچھی کرتی تھیں۔ اپنی ہر چیز سلیقہ سے جما کر رکھتی تھیں۔ پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بہت ہی خوش اخلاقی سے ملتیں۔ خصوصاً میرے مائکے کے لوگوں سے بہت اچھی طرح پیش آتیں۔ مختلف قسم کے چٹکلے، دوائیں ان کے پاس محفوظ تھیں۔ کئی کاپیوں میں دواؤں کے نسخے مختلف بیماریوں کا علاج یہ سب کچھ ان کے پاس تھا۔ محلے میں کوئی خاتون بیمار ہوتیں تو ان کے ساتھ وہ دواخانے جاتیں۔ گھر اور گھر والوں سے ان کا برتاؤ بالکل الگ تھا۔ دور سے جاننے والے یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ گھر میں بھی اسی طرح رہتی ہیں۔ میرے ایک رشتہ کے ماموں سسر تھے آغا ماموں، وہ اپنی بہن کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اس کی دو بہنیں ایسی نہیں تھیں۔ وہ بھی خوب جانتے تھے جب بھی آتے سمجھا کر جاتے تھے لیکن فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور قسمت ساتھ دے، ہر بات برداشت کرنے والے سہنے والے ملتے رہیں تو ضدی، بدمزاج، خودغرض سب کی زندگی مزے میں گزر جاتی ہے۔ ورنہ مزاج خود بہ خود بدل جاتا ہے۔ بدلنا پڑتا ہے۔ میری ساس ایک لحاظ سے بڑی خوش قسمت تھیں۔ شوہر، بچوں کے ساتھ بڑے مزے میں گزری۔ بہو کے قدم

بھی اچھے رہے کہ سارے گھر کی ذمہ داری اُس نے سنبھال لی۔ ہاں۔ گھر جو بکھرا تو اس کی انھیں پروانہ تھی۔ شوہر نے دوسری شادی کی تو اس کا خمیازہ بچوں نے بھگتا۔ خود بھی پریشان رہیں اور بچوں کا سکون بھی چھن گیا۔

پچیس تیس برسوں کی تفصیل لکھنے بیٹھوں تو پوری ایک کتاب تیار ہوگی۔ وقت نہیں ہے، بات کو مختصر کرتے ہوئے اتنا کہوں گی کہ میری ساس صاحبہ کو میں نے بہت سنبھالا۔ ان کی فطرت کا اندازہ کر لینے کے بعد میں ان کی ہر بات کو برداشت کرتی چلی گئی۔ توفیق صاحب اور سارے سسرالی رشتہ داروں نے بتادیا تھا کہ خاندان بھر میں ایسا مزاج رکھنے والی کوئی خاتون نہیں۔ ایک نفسیاتی مریض سے کس طرح نباہنا ہے میں جان گئی تھی۔ وہ ہر لمحہ، ہر دن یہی چاہتی تھیں کہ ان کو پوری توجہ ملے۔ مسلسل بیماری کا تذکرہ وہ کرتیں میں سن لیتی۔ اللہ کے فضل سے وہ آخری عمر تک بالکل صحت مند تھیں، طویل عمر پائی۔ البتہ آخری دو تین سالوں میں کمزور ہوگئی تھیں۔

میں ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے، دکھ بیماری ہر چیز کا خیال رکھتی تھی۔ وقت پر کھانا تیار کر کے ان کے کمرے میں رکھ دیا کرتی۔ دودھ، چائے، میوہ مٹھائی بسکٹ ہر چیز ان کے کمرے تک پہنچایا کرتی۔ ابتدا میں انھیں وہم تھا کہ فریج میں رکھی ہوئی چیز کھانے سے انھیں نقصان ہوسکتا ہے۔ کسٹرڈ پڈنگ، آئس کریم، تربوز وغیرہ یہ کھانا نہیں چاہتی تھیں۔ میں جبر تو نہیں کرسکتی تھی لیکن خیال سے ہر چیز فریج میں رکھنے سے پہلے ان کے لئے الگ نکال دیتی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ ان چیزوں سے محروم نہ رہیں، کھائیں گی تو طاقت رہے گی۔ کوئی سرپھری بہو ہوتی تو سوچتی چلو ان کے نہ کھانے سے میرا کیا بگڑے گا۔ لیکن میری فطرت الگ ہے۔ گھر کی بڑی تھیں، توفیق صاحب کی والدہ، میں بالکل اپنی امی کی طرح ان کا خیال رکھتی۔ کپڑے دھلوانا، ان کے لئے پانی گرم کر کے حمام میں رکھنا۔ نماز کی اوڑھنی، چادر، غلاف یہاں تک کہ دستی کا بھی میں خیال رکھتی کہ ہر چیز صاف ستھری رہے۔

کئی میوے وہ کھانا نہیں چاہتی تھیں یہ کہہ کر کہ سخت ہے چبانے میں تکلیف ہوتی ہے۔

میں چاہتی تھی کہ وہ تھوڑا ہی سہی لیکن کھائیں۔ بعض میوے وہ اپنے وہم کی وجہ سے نہیں کھاتی تھیں کہ فلاں میوہ گرم ہے فلاں سرد ہے۔ میں نے اس کے لئے کافی محنت کی، ہر طریقہ سے سمجھایا، قائل کیا۔ مجھے یہ کہنا پڑتا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے خود کو محروم کرنا اچھا نہیں۔ کبھی میں سیب کا چھلکا نکال کر اس کے چھوٹے ٹکڑے کر کے توڑ کر بتاتی کہ دیکھئے کتنا نرم ہے، وہ کھالیتیں تو مجھے خوشی ہوتی کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ رفتہ رفتہ فریج کا ڈر بھی کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ٹھنڈا پانی، شربت وغیرہ پینا شروع کر دیا اور آئس کریم کے علاوہ دیگر ٹھنڈی چیزیں شوق سے کھانے لگیں۔ گھر میں جب بھی سوپ تیار کرتی، میں پہلے ان کے پاس لیجاتی اور سامنے ٹھہر کر انھیں پلاتی۔ کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ بعض وقت وہ پینا نہیں چاہتی تھیں اور پھینک دیتی تھیں۔ بہر حال میری برسوں کی محنت کے بعد وہ نارمل زندگی گزارنے لگی تھیں۔ وہم، ڈر، خوف، احساس کمتری ان سب سے نجات پا گئیں۔

یہ سب کچھ تھا لیکن خاص بات یہ کہ جب کبھی ہم نے گھر تبدیل کیا انھوں نے مسائل کھڑے کئے۔ لیک ویو گسٹ ہاؤز (راج بھون روڈ) سے بالانگر منتقل ہونا پڑا تو جانے سے پہلے ہی انھوں نے پریشان کیا کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ بالانگر میں تقریباً پچیس سال گزارنے کے بعد توفیق صاحب کے وظیفہ پر سبکدوشی کے وقت ہم نے اکبر ٹاورس میں فلیٹ خریدا۔ بالانگر کا گھر تو کسی حال چھوڑنا ہی تھا، اس وقت بھی بڑی دقت ہوئی۔

مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ رہنا چاہتی ہیں۔ توفیق صاحب کی علاتی والدہ نے مجھے وہ سارے خطوط بتائے جو کئی ماہ پہلے سے وہ لکھتی چلی آرہی تھیں۔ ہر خط میں یہی اصرار ہے کہ انھیں آکر لے جائیں۔ اکبر ٹاورس میں آنے کے بعد بھی میں نے ان کی ہر طرح ناز برداری کی۔ سمجھایا کہ گھر کی بات کہیں اور نہیں آئے گی اور یوں بھی اپنی اولاد کے ساتھ رہنے کی بجائے کسی اور رشتہ دار کے پاس رہنے کے بارے میں سوچنا بھی غلط ہے۔ بہر حال جب کبھی ان کی طبیعت چاہتی، طنزیہ کہہ دیتیں کہ میں نے اپنا انتظام کر

ہے۔ میں نے کئی مضامین پڑھے جن میں بتایا گیا ہے کہ **Sadism** کے شکار ایسے افراد ہوتے ہیں جو کسی حال خوش نہیں رہتے۔ ہمیشہ خود کو مظلوم، بے بس ظاہر کرنا ان کا معمول ہوتا ہے۔ یوں بھی میری فطرت ایسی نہیں تھی کہ کسی ماں کو اس کے اکلوتے بیٹے سے الگ کردوں۔ میں نے ہر قسم کے حالات کا ہمت سے مقابلہ کیا یہ ہمت خود بخود مجھ میں آ گئی تھی یعنی اللہ تعالیٰ نے ودیعت کردی تھی۔ سمجھانے کے باوجود انھوں نے میری بات کو سنی ان سنی کردی آخر خود بے بس ہوکر میں نے انھیں تنبیہہ بھی کی کہ گھر سے مت جائیے اور یہاں سے جانے کے بعد کہیں کی بھی نہ رہیں گی۔ لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ادھر فکروں اور ذہنی تناؤ کی وجہ سے میری طبیعت اکثر خراب ہوجایا کرتی۔ ایک علامت یہ کہ سر میں شدید درد، اور بلڈ پریشر کم ہوجاتا۔ اس دوران مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں بالکل ٹوٹ سی گئی ہوں۔ طبیعت نڈھال ہوجاتی اور ہاتھ پاؤں بے جان۔ توفیق صاحب اپنی ماں سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن پریشان تو وہ بھی ہوتے تھے۔ میری پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں انتہائی حساس اور خوددار واقع ہوئی ہوں۔ صرف سوچ کر ہی فکرمند ہوجاتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا:

ہونی کو کوئی ٹال نہ سکا۔ اور وہی ہوا جس کے تصور ہی سے میں کانپ جاتی تھی۔ ایک دن میں کالج گئی ہوئی تھی۔ اس دن کسی کے انتقال کی وجہ سے تعزیتی جلسہ ہوا اور ایک بجے میں گھر آ گئی۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی یہ دیکھ کر کہ انھوں نے الماری سے کپڑے نکال کر جس سوٹ کیس میں رکھ لئے تھے وہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ میری غیر متوقع آمد پر شاید ساس محترمہ کو پریشانی ہوئی ہوگی انھوں نے بالکنی کی جانب دیکھنا شروع کیا تاکہ میرا سامنا ہی نہ ہو۔ سوائے میرے انھیں کوئی منع نہیں کرسکتا تھا۔ اس دفعہ وہ مکمل تیاری کے ساتھ جارہی تھیں اور کامل بھروسہ بھی تھا اپنے آپ پر کہ وہ کہیں بھی رہ سکتی ہیں صرف بہو کا ساتھ نہ ہو۔ مقررہ وقت پر توفیق صاحب کی علاتی والدہ انھیں لینے آ گئی تھیں۔ چند ماہ حیدرآباد ہی میں رہ کر دونوں ناسک

چلی گئیں جہاں سرور سلطانہ صاحبہ کی بھتیجی قیام پذیر تھیں۔ اس موقع پر چند لوگوں نے اہم رول ادا کیا۔ ساس ضعیفی میں کیوں گئیں۔ انھیں بلا لینا چاہئے۔ بیٹے کا کام ہے کہ ماں کو ساتھ رکھے۔ کسی نے مختلف قسم کے طنز آمیز کلمات سے بھی نوازا۔ جب کہ یہ سب جانتے تھے کہ میں نے تو برسوں انھیں گھر سے، گھر والوں سے جوڑ کر رکھا۔ کہنے والی خواتین کو اگر ایسی ساس سے سابقہ پڑتا تو کچھ ہی عرصہ میں شوہر کو لے کر الگ ہو جاتیں۔ خیر، میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ راست مجھ سے بات کرنے کی اُن میں ہمت بھی تو نہیں۔

اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ برداشت کرنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ برسوں سے ہوتی آئی باتیں میرے دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں زندہ تھی تو صرف توفیق صاحب کی چاہت اور ان کے اس جملے پر ''میں تو کچھ نہیں کہتا نا''۔ ساس صاحبہ کے گھر سے جانے کے بعد میرے دل میں یہ خیال بار بار آتا کہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔ بعض لوگوں نے تو جان بوجھ کر بتنگڑ بنایا۔ میں زندگی سے بیزار آ چکی تھی۔ خودکشی حرام ہے۔ اگر مر بھی جاتی تو توفیق صاحب اور بچوں سے ناانصافی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جواب دہ ہوتی۔ اچانک میرے اندر کی بہادر عورت جاگ اٹھی۔ اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ اب اگر وہ آئیں گی بھی تو ان کے ساتھ نہ رہے گی۔ میں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں توفیق صاحب سے کہہ دیا کہ اب میں اُن کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میرے جملے یہی ہیں میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی، کسی ہاسٹل میں رہ جاؤں گی، آپ کی ماں ہیں آپ انھیں ساتھ رکھنا۔ اس کے لئے میں نے کافی منت سماجت کی۔ توفیق صاحب سوچ میں پڑ گئے کہ میرے بغیر گھر کیسے چلے گا وہ تو یوں بھی گھر اور گھر داری سے لاپرواتھیں اب تو ضعیفی بڑھ چکی تھی بیمار تھیں انھوں نے کہا ایسے کیسا ہوگا۔ دیکھیں گے، کچھ انتظام کریں گے۔ خاندان کے سارے لوگ ان کی ناز برداریاں دیکھ چکے تھے۔ تیمارداری تو بہت ذمہ داری کا کام ہے اور اولاد ہی کرتی ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ وہ جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد پھر گھر آنا چاہتی تھیں۔ میں نے کئی بار اُن سے کہا تھا

میرے سوائے کوئی بھی ایسی باتیں برداشت نہیں کرتا۔ ان کی ہر قسم کی حرکات کو میں سنبھال لیتی تھی کیوں کہ مجھے گھر کو بکھیرنا نہیں تھا اور نہ توفیق صاحب جیسے چاہنے والے شوہر کو پریشان کرنا تھا۔ دو تین ماہ بعد وہ ناسک میں بیمار ہو گئیں۔ بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ جن لوگوں نے انھیں رکھا تیمارداری کی، ناز اٹھائے، ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ لیکن بہر حال وہ آنا چاہتی تھیں اور میں گھر سے نکل کر کسی ہاسٹل میں رہنا مناسب سمجھتی تھی۔ توفیق صاحب کی خوشامد کرتی کہ آپ مجھے اسی طرح کرنے دیجیے۔ کچھ تو حل نکالنا ہی تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے کہ گھر کون سنبھالے گا۔ ادھر میرے بیٹے کی شادی کی تاریخ بھی قریب آ گئی اُدھر انھیں انتہائی کمزور اور بیمار حالت میں ناسک سے لانے کی اطلاع ملی۔ میری مرنے کی حالت ہو گئی' توفیق صاحب کو پریشان کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اتفاق سے ایک فلیٹ خالی ہوا۔ اس کے مالک رضوی صاحب انتہائی مہذب، شریف انسان ہیں انھوں نے فوراً گھر دے دیا۔ میری نند اختر کو میں نے بلا لیا وہ ساتھ رہتیں۔ توفیق صاحب دن بھر وہیں رہتے ہمارے دونوں گھر بالکل پاس پاس تھے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب ان کی خدمت نہیں کروں گی۔ چند دنوں تک میں اپنی طبیعت کے خلاف ان کے پاس نہیں گئی۔ لیکن ان کے لئے ہر قسم کی غذا، سوپ، ہریرہ جو بھی تیار کرنا ہوتا وہ تیار کر کے بھیجتی رہتی۔ میں بہت پریشان تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو روک رہی ہوں۔ ادھر توفیق صاحب کی حالت دیکھی نہ گئی۔ وہاں سے آتے ہی افسردہ ہو جاتے، کبھی پریشان ہو جاتے کہ تیماردار کی بات وہ نہیں سن رہی ہیں۔ اختر میں اتنی صلاحت نہیں تھی کہ ٹھیک سے تیمارداری کریں۔ ویسے میں نے ایک نرس کا انتظام کر دیا تھا۔ انجکشن دینا اور آخری دنوں میں گلوکوز روزانہ چڑھایا جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ دواخانے میں شریک کرنے کی بجائے گھر پر ہی نگرانی کی جائے وہ آ کر چیک اَپ کر لیا کرتے۔ اب دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت تھی۔ عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔ کمزوری بے انتہا بڑھ چکی تھی۔

حیدرآباد جس وقت آئیں غذا ٹھیک ہی تھی۔ صبح میں ایک اوسط پراٹھا، انڈا، دوپہر

میں کبھی کھچڑی یا نرم کھانا کھالیتی تھیں۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتیں، ان کی طبعیت جس غذا کے لئے مائل ہوتی وہ کہلا بھیجتیں اور میں وقت پر تیار کر دیا کرتی۔ لیکن چند دنوں بعد میرا ضمیر سرزنش کرنے لگا۔ میں نے قسم توڑ دی۔ بعد میں کفارہ بھی دیا۔ اور پھر میں سیدھے ان کے پاس پہنچ گئی۔ ان کا بستر ٹھیک کیا اور پھر اپنے ہاتھ سے دوا وغیرہ دینی شروع کی۔ اس دن توفیق صاحب بہت مطمئن تھے۔ بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا کہنے لگے ایک بے بس عورت پر رحم کیا۔

میں رحم کرنے والی بھلا کون ہوتی ہوں یہ تو اُس ذات کے حکم سے ہوا جو ارحمہ الراحمین ہے۔ سب کو دیکھتا سب کی سنتا ہے۔ اب توفیق صاحب کی کافی فکر دور ہو چکی تھی۔ میں مسلسل تیمارداری کرنے لگی۔ میری نند میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ ایسے نازک مریض کی دیکھ بھال کر سکیں۔ وہ جو دوا پلاتی تھیں تکیے کی نذر ہو جاتی۔ غذا بھی بہت احتیاط سے دینی ہوتی۔ بہر حال میں اپنی نگرانی میں ان کا بستر تبدیل کرواتی، گلوکوز اور دیگر دوائیں بھی دینی ہوتیں۔ آخری دنوں میں مسلسل گلوکوز دینا پڑا کیوں کہ غذا بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ اکثر بڑبڑاتی تھیں کبھی بات سمجھ میں آجاتی کبھی بے معنی جملے دہراتیں۔ میرا نام لے کر پکارتیں۔ کبھی حبیب کبھی حبیب ضیاء۔ آخری دنوں میں، جب کہ مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ اب زندگی کم رہ گئی ہے میں نے قریبی رشتہ داروں کو فون کر کے اطلاع دی۔ سبھی آتے گئے۔ میرے خالہ زاد دیور برہان حسین انہیں اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار رو پڑے۔ وہ اپنی خالہ کو بہت چاہتے تھے۔

آخر کار وہ دن آ گیا، وہ وقت آ گیا جسے کوئی ٹال نہیں سکتا، صبح دس بجے ان کی سانس کی رفتار کم ہوتی گئی اور چند ہی لمحات میں ان کی روح پرواز کر گئی۔ میں توفیق صاحب کے پاس گئی۔ ان سے کہا جلدی چلئے، اب کچھ نہیں رہا، سب ختم ہو چکا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جتنا ستائی گئی، اس وقت رونے والی میں ہی تھی۔ غسل کے بعد کفن پہنایا گیا۔ خواتین دیدار کے لئے آگے بڑھیں۔ میں سبھوں کے ساتھ آگے بڑھ کر کفن میں لپٹی لاش کے قریب ٹھہر

گئی پھر کچھ ہی دیر میں جنازہ اٹھا اور وہ چلی گئیں۔ گذشتہ برسوں میں وہ کئی بار غصے میں، بیزارگی کا اظہار کر کے یا طنز کے تیر برساتے ہوئے گھر سے جایا کرتیں۔ ستارے کسی سے میل نہیں کھاتے پھر ہمارے پاس ہی آ جاتیں۔ اصولاً رہنا بھی یہیں چاہئے تھا۔ ایک ہی تو بیٹا تھا۔ انتہائی نیک اور ماں باپ کا فرماں بردار۔ اس دفعہ گھر سے گئیں تو ایک الگ طریقے سے گئیں۔ ایسی جگہ جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ برسوں سے چلتی آئی کہانی، یہی کہانی یہاں ختم ہوئی۔

○ ○ ○

مجھے کچھ کہنا ہے

مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ جی ہاں! بہت کچھ۔ سوچتی ہوں تو نیند اُڑ جاتی ہے۔ کس کس سے کہوں، کیا کیا کہوں اور کس طرح کہوں، سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی ہیں اور حضرات بھی، مختلف رشتوں میں بندھے ہوئے بے شمار مہذب لوگ ہیں جن کا ظاہر ایک اور باطن ایک ہے۔ خودغرض، لالچی، حاسد، دھوکہ باز بھی ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچار ہے ہیں۔ بہر حال وقت کم رہ گیا ہے کہنا بہت ہے۔

مسلمانوں کی معاشی پست ماندگی پر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس کا ذمہ دار، میں مسلمانوں ہی کو ٹھیراتی ہوں۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ ان کی کاہلی، کام چوری اور غیر ذمہ داری ہے۔ یہ بالکل محنت کرنا نہیں چاہتے، آرام طلبی بڑھ گئی ہے۔ بہت سے خاندانوں میں، میں نے دیکھا ہے کہ بچوں کو اللہ کے بھروسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں ان کی مصروفیات کیا ہیں۔ ان کے ملنے والوں کا حلقہ کیسا ہے یہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ معلوم کرنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ بعض خواتین اپنے گھر سے زیادہ دوسرے گھروں کے اندرونی حالات سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ حضرات ملازمت سے فرصت پانے کے بعد زیادہ وقت دوست احباب، سیر تفریح اور عیاشی میں صرف کرتے ہیں۔ ان گھروں کے بچوں کو دیکھئے، نہ پڑھنے میں دلچسپی نہ کسی کام کے بارے میں فکر مند، بعض گھرانوں میں ایک طویل عرصہ تک بچے کچھ نہیں کرتے۔ نہ پڑھائی نہ نوکری۔

ایک صاحبہ مجھ سے ملنے گھر آئیں۔ باتوں باتوں میں، میں نے پوچھا آپ کا لڑکا کیا کر رہا ہے کہنے لگیں باہر جانا چاہتا ہے یہ کوئی معقول جواب نہیں۔ باہر جانے کی خواہش کو ملازمت نہیں کہتے۔ پھر وہ کہنے لگیں پچاس، ساٹھ ہزار روپے چاہیں جانے کے لئے۔ میں نے فوراً کہا کہ باہر جانے کا موقع ملنے تک اسے ملازمت کر لینی چاہئیے۔ کچھ روپے پس انداز ہو

لگے تو صورت نکل آئے گی۔ ایسے لڑکے زندگی بھر کچھ نہیں کرتے۔ ماں باپ کی زندگی تک انہیں پریشان کرتے ہیں۔ یا پھر خاندان یا ملنے والوں میں سے کسی خوشحال، مروت والے کا در پکڑ لیتے ہیں۔ ایسے دو تین گھران کے لئے کافی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بے غیرتی میں زندگی گزارنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اچھے خاصے صحت مند ہوتے ہوئے ملازمت نہ کریں تو ان لڑکوں پر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ملازمت ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔ یا تو ہندوستان سے باہر جانے کے خواب دیکھتے ہیں یا پھر گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ شام ہوتے ہی گھر سے جو نکلے تو رات دو تین بجے گھر لوٹتے ہیں۔ سڑکوں پر، گلی کے نکڑ پر، فلیٹس کے احاطوں میں ایسے لڑکے ہر جگہ مل جائیں گے۔ بعض سگریٹ نوشی کے علاوہ نشہ آور چیزوں کے استعمال کے عادی ہیں۔ میں سوچتی ہوں ان کا مستقبل کیا ہے۔ آگے چل کر یہ کیا کرنے والے ہیں۔ ملک اور قوم کی خدمت کے سلسلے میں ان سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔

یہ تو متوسط اور خوشحال ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہیں۔ غریب گھرانوں کا حال اس سے بدتر ہے۔ برسوں سے میں دیکھتی چلی آرہی ہوں کہ ملک کی غربت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر گھر کا تقریباً یہی حال ہے۔ تعلیم کی کمی، بچوں کی زیادتی، روپے پیسے کا غلط استعمال، پیشہ ور عاملوں پر خرچ، ایک دوسرے کا دشمن بنا ہوا اور حسد کی آگ میں جل کر خاندان ہی کے کسی فرد کو مسلسل نقصان پہنچا رہا ہے۔ تصور ہی تصور میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں جہاں سب خوشحال ہیں کوئی بھوکا نہیں۔ رہنے کے لئے ہر ایک کو مکان ہے تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی میسر ہے۔ میوے کی مارکٹ میں اور ٹھیلوں پر ہر کوئی خریداری کر رہا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں پھر اسی دنیا میں واپس آجاتی ہوں، غربت، افلاس، کوڑے دان سے چن کر کھانے والے بچے، دکانوں، ہوٹلوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے نظر آتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں خوشحال لوگ کم از کم اپنے نوکر اور ان کے بچوں ہی کی دیکھ ریکھ کریں انہیں اچھا کھانا کھلائیں، میوہ مٹھائی دیں تو ان غریبوں کو اتنا ترسنا نہیں پڑے گا۔ صرف میری سوچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس

کو تو ایک تحریک کے طور پر آگے بڑھانا اور عمل کرنا ہے۔ گجرات کے لوگوں کی تباہی بے بسی دیکھنے کے بعد کئی اداروں نے کام کیا۔ اس سلسلے میں جناب زاہد علی خان کی جتنی ستائش کروں کم ہے۔ مختصر سے عرصے میں ان کی ایک ہی آواز پر کروڑوں کی رقم جمع کی گئی اور ان بے گھر لوگوں کے لئے قابل قدر کام کئے گئے اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس کے بعد ان کے ایک مضمون ''نہ سمجھو گے تو'' کی اشاعت کے بعد لوگوں میں کافی شعور بیدار ہوا ہے۔ زاہد علی خان جیسے متحرک، فعال لوگ ہی ملت کو راہ راست پر لا سکتے ہیں۔ علمائے دین سے بھی التجا ہے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لیں۔

عورت سے نا انصافی کی خبریں اخبار میں پڑھتی ہوں۔ مختلف لوگوں سے ایسے واقعات آئے دن سننے میں آتے ہیں۔ روزانہ کئی عورتیں، کم عمر لڑکیاں سسرال والوں کے ظلم کا نشانہ بن رہی ہیں۔ عموماً یہ ظلم مزید جہیز کے مطالبہ کو پورا نہ کرنے پر کیا جا رہا ہے۔ اس میں ہندو مسلم سبھی گھرانے شامل ہیں۔ کیروسین چھڑک کر عورت کو آگ لگا دینا ایک عام بات ہو گئی ہے۔ بس اخبار میں خبر شائع ہو جاتی ہے۔ مجرم جیل بھیجا جاتا ہے کبھی الزام سے بری بھی ہو جاتا ہے ایسے افراد سے خاندان کے لوگ قطع تعلق کیوں نہیں کرتے، ان کا سماجی بائیکاٹ کیوں نہیں کیا جاتا انھیں سخت سزا کیوں نہیں دی جاتی، جواب بس ڈھونڈتی ہی رہتی ہوں۔ جسمانی اذیت سے ہٹ کر ذہنی اذیتیں بھی ہیں۔ ان کا تو شمار ہی نہیں۔ اکثر خواتین برسوں سے ایسی اذیتوں، تکالیف میں مبتلا ہیں۔ سارے لوگ تماشائی بنے رہتے ہیں۔ گویا یہ عورت کی قسمت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ ایک عورت کی حق تلفی کرتے ہوئے، اسے جسمانی تکالیف اور ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر کے دوسری سے شادی کر لینا یا تعلق قائم کر لینا ایک عام بات ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشرہ کا رخ کدھر ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں طلاق کے واقعات بہت بڑھ گئے ہیں۔ کبھی تو صرف ۱۵ دن بعد ہی لڑکی کو مائکہ بھیج دیا جاتا ہے کہ بس اب واپس نہ آنا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نافرمان ہے زبان دراز ہے۔ اصل وجہ کچھ اور ہوتی ہے روپیہ پیسہ کا لالچ

مزید رقم کی مانگ پوری نہ ہو تو بعض گھرانوں میں ایسے جھوٹے الزامات لگا کر دوسرے گھر کا رخ کیا جارہا ہے، ان سب برائیوں کو سماج سے مٹانا ہوگا۔

صبح اخبار ہاتھ میں لیتے ہی نظریں خود بہ خود غم وخوشی کی خبروں پر پڑتی ہیں انتقال اور شادی کی خبریں اطلاعات دیکھنے کے بعد جرائم کے عنوانات، ان کی نوعیت اخبار کے کسی نہ کسی حصے میں روزانہ ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو انسانیت کے لئے شرمناک ہیں وہ ہیں عصمت ریزی کے واقعات، مرد کی بربریت، ہوسناکی دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہے میں نے اخبار سیاست کے تراشے رکھنے شروع کئے تھے۔ ۵ ماہ کی بچی جب مرد کی ہوس کا نشانہ بنی تو کسی گوشے سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔ یہ سلسلہ برسوں سے چلا آرہا ہے۔ اب ہوس مٹانے والوں کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں رہی۔ یہ جھولے میں پڑی بچی کو بھی ہوس کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ ایسے وقت سماج کے ذمہ دار افراد، بڑے عہدوں پر فائز سیاسی و مذہبی رہنما کیوں خاموش رہتے ہیں اس کا جواب مجھے مل نہ سکا۔ کسی کارخانے کا کوئی مزدور اتفاقی حادثہ کا شکار ہوتا ہے تو یہ سیاسی رہنما وہاں پہنچ کر میوہ دیتے ہوئے تصویر کھنچوا لیتے ہیں۔ گھناؤنے جرم کرنے والوں کو کڑی سزا کیوں نہیں دلواتے۔

گجرات کے فسادات میں عورتوں اور بچوں سے جو سلوک کیا گیا وہ حکومت کے لئے ایک بدنما داغ ہے۔ عصمت ریزی کی دل دہلا دینے والی خبروں سے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ افرادِ خاندان کے سامنے خواتین کی عزت لوٹی گئی۔ حاملہ خاتون کا پیٹ چیر کر اس کے بچے کو نکالا گیا اور سب کی نظروں کے سامنے اُسے آگ میں ڈالا گیا۔ درندگی کی صرف یہ ایک مثال کافی ہے۔

ابھی میں زندہ ہوں:

مجھے ان لوگوں سے بھی کچھ کہنا ہے جو قابل، سمجھدار بیوی کو نوکری کرنے نہیں دیتے یہ

کہہ کر روکتے ہیں تمھیں کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی، ابھی میں زندہ ہوں۔ آجکل تو خواتین گھر کے حالات کوٹھیک کرنے، معیارزندگی کو بڑھانے اور بچوں کواچھی تعلیم دلوانے کے لئے شوہر کے ساتھ خود بھی ملازمت کررہی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورت تفریح یا وقت گزاری کے لئے نوکری کرتی ہے۔ایسا کہنے والے غلط کہتے ہیں۔ان کی بات میں نامعقولیت ہے۔موجودہ دور میں مہنگائی آسمان سے باتیں کررہی ہے۔اس کا مقابلہ کرنے اور بچوں کواعلیٰ تعلیم دلوانے، ان کے لئے اچھی غذا فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شوہر کے ساتھ بیوی بھی نوکری کرے۔ اکثر حضرات اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی بخوشی اجازت دے رہے ہیں کہ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو رائیگاں نہ جانے دیں یہ ملک اور قوم کی بھی بڑی خدمت ہے۔ میرے سامنے چند ایسی مثالیں موجود ہیں۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ دورانِ ملازمت لڑکی کی شادی ہوئی۔ ساس سسر اور شوہر نے حامی بھری کہ شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھیں گے۔لیکن جیسے ہی لڑکی گھر آئی فرمان جاری کردیا گیا کہ ملازمت کی ضرورت نہیں۔ ایک اور گھر کا حال قابل ذکر ہے۔ میں اس لئے بھی سنانا چاہتی ہوں کہ آج کا یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ خواتین و حضرات سبھی کے لئے لمحۂ فکر۔ ایک گھر میں چھ افراد تھے، میاں بیوی اور چار بچے۔میاں ڈرائیور تھے۔ بیوی گھریلو خاتون تھیں۔ ہندی میں مہارت تھی اور اسناد بھی رکھتی تھیں۔قریبی اسکول میں جگہ خالی تھی اور فوراً ملازمت مل سکتی تھی۔شوہر نے صاف منع کردیا کہ نوکری کی کیا ضرورت ہے ابھی میں زندہ ہوں۔ دو تین سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ انھیں جگر کے عارضے سے ملازمت سے رخصت لینی پڑی۔ بیماری پیچیدہ ہوتی گئی اور وہ اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔اُس خاتون کے لئے اچانک روزگار کا واحد ذریعہ ختم ہوگیا۔ چار بچوں کی پرورش اور تعلیم آسان بات نہ تھی اس کے لئے بڑا صبرآزما دور رہا۔ خاندان میں کوئی ایسا خوش حال فرد نہ تھا جو مالی مدد کرتا۔ خاتون ملازمت کرنا چاہتی تھی لیکن وقت گزر چکا تھا سوچئے تو، بچوں کی پرورش کس مشکل سے ہوئی ہوگی! بڑا لڑکا جو ابتدا ہی سے غیر ذمہ دار واقع

ہوا تھا اسے راستے پر آنے اور گھر کی ذمہ داری قبول کرنے کافی وقت لگا۔ اگر بیوی کی ملازمت ہوتی تو اتنی مشکلات کا سامنا کرنا نہ ہوتا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بڑھتی مہنگائی کے اس دور میں اگر شوہر کے ساتھ ساتھ بیوی بھی ملازمت کرے تو گھر میں خوشحالی رہ سکتی ہے۔ معیار زندگی کو بڑھانے اور بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کے لئے دونوں کی ملازمت ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورت بھی اگر ملازمت کرے تو گھر اور بچوں پر توجہ نہیں دے سکتی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بہت کم گھرانے ایسے ہیں جہاں بیوی ملازمت سے واپس گھر آکر صرف آرام کرتی ہے۔ آج کی عورت نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ گھر کے لئے، شوہر، ساس سسر کی خدمت کے لئے اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے۔ میں اس بات کو بالکل نہیں مانتی کہ عورتیں محض تفریح کے لئے نوکری کے بہانے گھر سے نکلتی ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں غلط کہتے ہیں، جھوٹ کہتے ہیں۔ میری ملازمت کے ۲۸ سالہ دور میں، میں نے دیکھا کہ اورینٹل کالج سے لے کر زنانہ کالج تک اور دوسرے تمام کالجوں میں لکچررس بالکل سادہ لباس میں ہوتیں۔ کسی قسم کے میک اپ یا زیور سے لدی نہیں ہوتیں۔ اسکول کے اساتذہ اور دیگر شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کا بھی یہی حال ہے۔ وہ صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرتی ہیں۔ شوہر، بچوں کے ساتھ اپنی بھی دو روٹیاں ٹفن میں رکھ کر نکل جاتی ہیں۔ میری طرح کئی خواتین ہیں جو وقت پر پہنچنے کے لئے بغیر ناشتہ کئے گھر سے چلی جاتی ہیں۔ اس لئے جو لوگ عورت کی ملازمت پر تنقید کرتے ہیں یا برائیاں ڈھونڈتے ہیں انھیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ عورت کی حوصلہ افزائی کریں، اسے شاباشی دیں کہ کس طرح اس نے گھر کی خوشحالی کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ آواز سے کسنے کی بجائے عزت کریں، سماج میں مقام دلانے میں اس کی مدد کریں۔

مجھے ان لوگوں سے بھی کچھ کہنا ہے جو عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ ذرا سے طاقتور ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس پر جبر کریں۔ ظلم و زیادتی کریں۔ کئی لوگوں کے بارے میں نے سنا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دم سے غصہ کر کے بیوی کو پیٹ دیتے ہیں۔ یہ

مردانگی نہیں بزدلی، کمینہ پن ہے۔ سماج میں بڑا نام رکھتے ہیں۔ دوست احباب میں بھی مقبول ہیں۔ زندہ دل، ہنس مکھ کیا کیا نہیں ہیں۔ بیوی سے جو برتاؤ ہے وہ چونکا دینے والا ہے رلا دینے والا ہے۔ میں نے کئی مہذب، پڑھے لکھے گھرانوں کے بارے میں سنا ہے دیکھا بھی ہے، تفصیلی معلومات حاصل کی ہیں کئی حضرات ساری زندگی بیوی سے برا سلوک کرتے ہیں گالی گلوج، بات بات پر جھڑکنا، آواز اتنی تیز کہ اطراف کے کئی گھروں میں لڑنے، گالیاں دینے اور اوٹ پٹانگ بکنے کی ساری کارروائی سنائی دے، کھڑکیاں کھلی ہوں تو نظارہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی بس ایسے ہی گزر جاتی ہے لیکن خدا کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں۔ ان لوگوں کا حشر بھی میں نے دیکھا ہے۔ بچے جو ماں پر ظلم ہوتا دیکھتے ہیں بچپن میں کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے ان کا شعور پختہ ہوتا جاتا ہے اور وہ ساری باتیں ان کے دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ باپ کی تیز مزاجی اور وہ مظالم جو ان کی ماں پر کئے گئے۔ نتیجہ یہ کہ بچے باغی ہو جاتے ہیں۔ اور باپ سے بدلہ لینے پر تُل جاتے ہیں۔ بدلہ مختلف نوعیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً وہ باپ کی عزت نہیں کرتے۔ اس میں بچوں کا قصور نہیں کیونکہ عزت مانگنے سے نہیں ملتی عمل سے ملتی ہے۔ سلوک سے ملتی ہے۔ بدلے کا جذبہ اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ بعض بچے باپ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اپنی آمدنی، کاروبار، مختلف اشیاء کی خرید و فروخت ان سب سے باپ کو دور رکھتے ہیں، ماں سے محبت بڑھ جاتی ہے۔ بعض ظالم افراد کا حشر میں نے دیکھا ہے۔ ضعیفی میں بیوی اور بچے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو میرا نیک مشورہ ہے کہ اپنے مزاج کو بدلیں، ایک عام انسان کی طرح جینا سیکھیں۔ ایسا انسان جو گھر کے سارے افراد سے محبت اور ہمدردی رکھتا ہو، شریک حیات کو سکون سے جینے دیں اس طرح اچھا عمل کر کے خاندان اور سماج میں اپنا مقام بنائیں۔ ورنہ اپنی طاقت اپنے مزاج کے بل بوتے پر من مانی کرنے والوں کا انجام عبرتناک ہی ہوگا۔ دنیا ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں خواتین سے بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں۔بعض گھرانوں میں، میں نے دیکھا ہے کہ شوہر انتہائی سادہ طبعیت، بیوی بچوں پر جان نثار کرنے والے ہیں۔ان کا استحصال بھی اچھا نہیں۔خواتین کو چاہیئے کہ ان کی چاہت کا جواب چاہت ہی سے دیں۔ ہمیشہ تیز مزاجی، خراب موڈ، چڑ چڑا پن، یہ شوہر کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے۔خصوصاً ایسے شوہر کے لئے جو ملازمت کے بعد پورا وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہے گھر کے ماحول کو خوشگوار، پرسکون بنائیں۔ گھر آتے ہی شوہر دن بھر کی تھکان بھول جائے یہ اسی وقت ممکن ہے جب بیوی سمجھدار، سلجھے مزاج کی ہو، میں نے کئی گھرانوں میں دیکھا ہے کہ عورتیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ مسائل لئے تیار رہتی ہیں۔جتنی بھی آمدنی ہو ان کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ایسی صورت میں باہر سے آنے والا شخص سوائے پریشان ہونے کے اور کچھ کر نہیں کرسکتا۔بعض حضرات رشوت لے کر یا کسی اور ناجائز آمدنی سے بیوی کی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔

بہر حال باتیں بہت ہیں، کہنا بھی بہت ہے۔مختصراً اتنا کہوں گی کہ ایک عورت پورے گھر کو خوشحال بنانے، پرسکون ماحول مہیا کرنے، شوہر اور بچوں کی مکمل دیکھ بھال کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔عورت ہی ہے جو خاندانوں میں میل بڑھاتی ہے اور عورت ہی ہے جو فساد پھیلا کر خاندانوں میں فاصلے بڑھاتی ہے۔ایسی خواتین سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔اللہ تعالٰی سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اپنے فضل سے' اپنے حکم سے انھیں راہ راست پر لائے۔دلوں کی کدورت دھو دے، خوف خدا کا احساس جگا دے تاکہ وہ اپنی عاقبت کو سنوارنے کی کوشش کریں۔خود بھی پُرسکون زندگی گزاریں اور دوسروں کو بھی سکون سے جینے دیں۔

اکیلے ہی اکیلے:

مجھے اُن مہذب بھائیوں سے بھی کچھ کہنا ہے جو روزانہ گھر سے باہر جاتے ہیں اور دن کا محنت کے بعد گھر لوٹتے ہیں۔اس وقت میں ان حضرات سے مخاطب ہوں جو گھر واپس
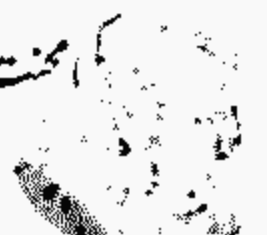
آتے ہوئے پیٹ پوجا کر لیتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک کسی بھی بیکری یا ہوٹل کو دیکھ لیجیے، یہ اکیلے ہی اکیلے حلیم، نہاری نان، اڈلی، دوسہ، بریانی، دم کا مرغ، برگر، پیزا ہضم کر لیتے ہیں۔ بیکری میں کھڑے، کھانے والوں کو جب میں دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ بیوی بچوں کو کھلائے بغیر یہ کری پف اتنی تیزی سے حلق سے کیسے اُتر جاتے ہیں۔ مٹھائی خریدنے جائیں وہاں چھوٹی کٹوریوں پر نظر پڑتی ہے جن میں دو دو گلاب جامن، چمچم یا رس ملائی ہوتی ہے۔ آڈر دینے پر اُن کے سامنے آتی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ کھا کر گھر کے لیے مزید خرید رہے ہیں جی نہیں! یہ تو اکیلے کھانے والے ہیں۔ کھاتے ہیں اور دستی سے منہ صاف کر کے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ موز کی بنڈی کے قریب دس منٹ ٹھہر کر دیکھئے، گھر لیجانے والے تو ہوں گے ہی، دو چار موز کھا کر چھلکا پھینک دینے والے زیادہ نظر آئیں گے۔ شہر میں جگہ جگہ مرچیاں، آلو بھجئے، وڑے، گرم پکوڑے، جلیبی کی دکانیں ملیں گی۔ دکان یا بنڈی کے سامنے کاغذ میں تلن لئے بے شمار لوگ نظر آئیں گے۔ ان کے کھانے کی رفتار پر بھی غور کیجئے۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے یا صرف نظریں نیچی کیے یہ اچھا خاصا کھا لیتے ہیں۔ سعودی عرب کی خاص ڈش شاورما حیدرآباد میں بعض دکانوں پر بننے لگی ہے، جس میں کافی مقدار میں گوشت کے ساتھ پنیر، ٹماٹر اور دیگر ترکاریاں ہوتی ہیں۔ لذیذ پکوان ہے، دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں غور کرتی ہوں کہ حضرات ہی حضرات ہیں۔ بے فکری سے بیٹھے ڈٹ کر کھا رہے ہیں اور خالی ہاتھ گھر جا رہے ہیں۔ بس! مجھے ان ہی مہذب حضرات اور بچوں سے کہنا ہے کہ خدارا! ایسا مت کیجئے۔ گھر میں ماں، بہن، بیوی اور بیٹیاں جو آپ کا انتظار کر رہی ہیں، ان کے لئے بھی لیتے جائیے۔ اس کے لئے خود پر جبر کرنا ہوگا۔ عادتیں بدلنی ہوں گی۔ کیوں کہ یہ عمل برسوں سے چل رہا ہے۔ صرف اتنا سوچ لیجئے کہ ایسی خواتین جو گھر سے باہر نہیں جاتیں یا یوں بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ انہیں نہیں لے جاتے، ان کا بھی حق ہے کہ آپ کی طرح وہ بھی کھائیں۔

مجھے قوی اُمید ہے کہ حضرات میری باتوں کا برا نہیں مانیں گے، سنجیدگی

فرمائیں گے، حضور اکرم ﷺ کا بھی ارشاد ہے کہ جب کوئی چیز لاؤ تو سب سے پہلے بچیوں کو دو۔ اس عبارت کو پڑھ کر جو میری بات مان لیں گے میں ان کی شکر گزار رہوں گی کہ واقعی آپ نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور پھر بات مان کر گھر والوں کا بھی خیال کیا۔ لیکن ارے! یہ کیا؟ غپ چُپ کے ٹھیلے کے پیچھے چھپ کر آپ نے اکیلے اکیلے کتنے گول گپے کھالئے کچھ تو سوچئے۔

پچاس سال کی بے بی:

میں اردو کی ایک ادنی طالب علم ہوں۔ تنقید، تحقیق کے علاوہ طنز و مزاح میں بھی کچھ لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا کی ہے تو اس کا شکر بجالاتی ہوں اور جب بھی موقع ملے طنز و مزاح کے پیرایے میں فرد اور سماج کی اصلاح کی کوشش کرتی ہوں اور بس۔ موضوعات عام زندگی ہی سے متعلق ہوتے ہیں اس لئے اگر میرے مضامین وقتی طور پر پژمردہ دلوں کی ہنسی کا سامان فراہم کرتے ہیں تو اسے خوش بختی تصور کرتی ہوں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ جلسوں میں، میں نے جو مضامین سنائے وہ بے حد پسند کئے گئے، بچہ باہر گیا ہے، تکیۂ کلام، بڑا ڈاکٹر، جلسے، بے بی، اور دوسرے چند مضامین ہیں جنھیں سن کر سامعین نے دل کھول کر داد دی۔ انھیں حوصلہ افزائیوں کے باعث لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اصل موضوع پر آتی ہوں، مضمون بے بی میں، میں نے ان عرف ناموں کی نشان دہی کی ہے جو پختہ عمر تک بھی باقی رہتے ہیں۔ جن حضرات نے میرا یہ مضمون پڑھا یا سنا بے حد محظوظ ہوئے۔ سوچئے تو! پچاس سال کی بے بی کیا آپ کو اچھی لگتی ہے؟۔ ہر خاندان میں ایک بے بی ہے بے بی آپا سے لے کر بے بی نانی تک۔ اگر برا لگتا ہو میرا کہنا تو ٹھیک ہے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ستر سال تک بے بی بنی رہیے، میں کون نام بدلنے والی۔ مگر خدارا! یہ نہ کہیئے کہ اس مضمون میں ہماری بے بی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ننھی، منی، گڑیا، گڈو، چھوٹو، گڈی، پنکی یہ بچپن تک ہی ٹھیک ہیں بلکہ ایسی مضحکہ خیزیت سے بچنا بہتر ہے۔ پچاس سال کی بے بی، ستر سال کی منی، اسی سال کی گڑیا، بس اس

سے آگے کچھ کہنا نہیں ہے، ماشاء اللہ میرے قاری سمجھدار ہیں۔

تیج مٹی میں جانا ہے:

جب تک میکے میں رہی، اپنے گھر کے ملازمین سے ہی سابقہ رہا۔ جیسا کہ میں ایک جگہ لکھ چکی ہوں وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ تقریباً ہر خوشحال گھرانے میں دو تین مستقل ملازمین ہوا کرتے۔ شادی کے بعد بالا نگر آئی ڈی پی ایل کالونی میں زندگی کے کئی برس گزارے۔ شریف پڑوسیوں نے ہمیشہ مجھے عزت دی۔ یہاں تک کہ جن خواتین کی دوسروں سے کبھی نہیں بنتی تھی، وہ بھی مجھ سے مرعوب تھیں۔ ۱۹۹۰ء میں اکبر ٹاورس، ملک پیٹ میں فلیٹ خریدا۔ یہاں ہر منزل پر چار چار فلیٹ تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ فلیٹ کی مالکن یا کبھی کوئی ملازمہ نے گھر جھاڑ کر کچرا باہر کردیا۔ اکثر میں انجان ہو جاتی لیکن رہا نہیں جاتا تھا۔ گھر کے سامنے کچرا ڈالنا مہذب خواتین کو زیب نہیں دیتا۔ میں نرمی سے ملازمہ یا مالکن کو اس بارے میں بتا دیتی تو وہ سمجھ جاتیں اور آئندہ خیال رکھا کرتیں۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی کہ سچ بات کو وہ مانتے ہوئے صفائی کا خیال رکھنے لگی ہیں۔ ایک دفعہ پڑوسی بدلے، ملازمہ بھی نئی آئی۔ وہ روزانہ اپنا فلیٹ جھاڑ کر گرد، جوتوں کی مٹی میرے دروازے کے پاس لگا کر اطمینان سے چلی جاتی۔ ایک دن وہ جھاڑو دے رہی تھی، آواز پر میں نے دروازہ کھولا۔ اس نے وہی عمل دہرایا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا یہ مٹی اٹھالو ہوا سے ہمارے گھر میں آجاتی ہے۔ ملازمہ کا جواب تھا کیا مٹی مٹی کرتے! تیج مٹی میں جانا ہے۔ شاید کسی کو یقین نہ آئے، میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ سیدھی اپنے گھر چلی آئی۔ ایسی خواتین کے منہ لگنا، اُن سے گفتگو کرنا میں مناسب نہیں سمجھتی۔

عموماً پڑوسیوں سے خوشگوار تعلقات رہے۔ عمر میں مجھ سے چھوٹی خواتین اور لڑکیاں خلوص سے ملتی ہیں۔ میں بڑوں کی عزت کرتی ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ پڑوسن بیمار ہیں ان کے پاس کوئی اور نہیں میرے بیٹے نے ڈاکٹر کو بلایا اور جتنی ہو سکے میں نے تیمارداری کی۔ میں جس طرح اپنی ملازمہ کا خیال رکھتی ہوں پڑوس میں کام کرنے والی ملازمہ کے بارے میں

غور کرتی ہوں۔ مالی حالت تو سبھی کی ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ عام دنوں کے علاوہ رمضان میں انہیں یاد رکھتی ہوں۔ زکواۃ، خیرات، صدقہ جو بھی ہو، میں نہ صرف خود دیتی ہوں بلکہ دوسرے اہل خیر رشتہ داروں سے بھی ان مستحق خواتین کا ذکر کرتی ہوں۔ کچھ دے کر، دلوا کر مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ ہمیشہ سے میرے پڑوسی مہذب رہے۔

جھوٹ ایک بیماری:

مجھے ان مہذب خواتین وحضرات سے بھی کچھ کہنا ہے جن کی ساری زندگی جھوٹ بولتے، دوسروں کا دل دکھاتے گزر جاتی ہے۔ قرآن وحدیث میں بار ہا جھوٹ سے منع کیا گیا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کی سماج میں کتنی عزت ہے، یہ سبھی جانتے ہیں۔ دین سے تو گیا ہی، دنیا میں بھی وہ عزت ونیک نامی گنوا بیٹھتا ہے۔ مذہب کی آڑ میں جھوٹ بولنے والوں کی بھی دنیا میں کمی نہیں۔ ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر مجید خاں کا کہنا ہے کہ جھوٹ ایک بیماری ہے اور آج تک اس بیماری کے خاتمے کے لئے کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔ انھوں نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ مذہبی تعلیمات جھوٹ کے انسداد میں کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔ دانستہ طور پر گمراہ کرنے کے لئے بولے جانے والے جھوٹ کو انتہائی نقصان دہ قرار دیا۔ ڈاکٹر مجید خاں نے اپنے لکچر میں نہایت کارآمد باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ جھوٹ کی ایک قسم پیتھالوجیکل جھوٹ ہے، جھوٹ بول کر انسان لطف اندوز ہوتا ہے۔ کوئی عار، کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ پکڑے جانے پر نادم بھی نہیں ہوتا۔ اس کا علاج انھوں نے یہ بتایا کہ مذہبی تعلیم حاصل کی جائے اور سچے راستے کو اپنایا جائے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم دنیا والوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جھوٹوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ بہت سی خواتین ایسا سفید جھوٹ بکتی ہیں جس پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ اگر کر بھی لیتا ہے تو بہت جلد سچائی سامنے آجاتی ہے اور جھوٹا انسان ذلیل وخوار ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں حسد، لالچ، خود غرضی، دل آزاری جیسی برائیوں کے ساتھ جھوٹ بھی وبا کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ مفاد کے لئے جھوٹ کہہ کر دو دلوں میں، دو خاندانوں میں رنجش بڑھانے کا چلن عام

ہو گیا ہے۔ میاں بیوی، ماں باپ اور اولاد، بہن، بھائی، پڑوسی جو لوگ ان رشتوں کی اہمیت نہیں جانتے، انہیں ہر حال میں خوش نہیں دیکھ سکتے۔ وہ جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک آپسی رشتوں اور دوستی کو ختم نہ کردیں وہ چین کی سانس نہیں لے سکتے۔ ان کے لئے میرا نیک مشورہ ہے کہ QTV پابندی سے دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ انہیں برائیوں سے بچائے۔

ہر بات اماں سے؟

موجودہ سماج کا ایک سلگتا مسئلہ ہے جس پر کسی مرد کو قلم اٹھانا چاہئیے تھا۔ جوڑے کی رقم جہیز کی مانگ کر کے لاکھوں روپے بٹورنا، لڑکیوں کو جلانا تو عام بات ہوگئی ہے۔ لیکن بعض گھرانوں میں شادی کے لئے نااہل لڑکوں نے شادی کر کے لڑکیوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ گذشتہ چند برسوں میں جو شرمناک واقعات سننے میں آئے انہیں سماج کے ذمہ دار افراد کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسے ہی ایک شریف زادے نے شادی کی، اپنی قریبی رشتے کی بہن سے، رشتہ طے کیا ماں باپ ہی نے۔ شادی سے دو تین سال قبل رسم ہوا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ فون پر باتیں بھی ہوئیں۔ بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ لڑکی کی ماں نے بے حساب خرچ کیا، سونے میں لدی لڑکی میکے سے سسرال چلی گئی۔ ادھر ماں باپ نے چین کی سانس لی کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ چند دنوں بعد لڑکی میکے آگئی، افراد خاندان خصوصاً ماں باپ، نیند اور چین گنوا بیٹھے۔ چند لوگوں نے جب لڑکے کی ماں سے لڑکے کی نااہلی کا ذکر کیا تو وہ آگ بگولہ ہوگئیں کہ ان کے لڑکے پر سراسر الزام لگایا جارہا ہے۔ لڑکی دوبارہ سسرال گئی تو لڑکے کی ماں نے اُسے آڑھے ہاتھوں لیا۔ اس کی کم عمری اور رشتہ داری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے لڑکی کو یہ کہہ کر ڈانٹ پلائی۔ ہر بات اماں سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ خاندان کی لڑکی ہے تو منہ نہ کھولے، شرافت سے سسرال میں رہ جائے۔ یہ لڑکی سے انصاف نہیں، اس کا استحصال ہے، سراسر اس پر ظلم ہے۔ ایسا گھناونا جرم ہے

سماج معاف نہیں کرے گا۔ مختصر یہ کہ پورے ثبوت مل جانے کے بعد لڑکی والوں نے خلع لے لیا۔ ذہنی تناؤ سے پریشان اس بچی نے خودکشی کی بھی کوشش کی لیکن حیات باقی تھی، مر نہ سکی۔ ذہنی تفکرات میں گھرے، اس خاندان کی پریشانی دور کرنے میں پڑوسن نے عمدہ رول نبھایا، جذبۂ ہمدردی نے جوش مارا۔ انہوں نے اپنے لڑکے کا رشتہ بھیجا۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ اس لڑکے کی چند سال پہلے شادی ہوچکی تھی۔ علحدگی کی وجہ ماں نے یہ بتائی کہ لڑکی کسی اور کو چاہتی تھی۔ (آج کل یہی کہا جارہا ہے) گہری دوستی کی وجہ سے ماں باپ نے چھان بین، دریافت وغیرہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہاں! پڑوسن نے ازراہِ ہمدردی یہ بھی کہا کہ غیر ضروری رسومات اور اخراجات سے بچنے کے لئے سادگی سے شادی کردیجئے خاندان والوں کو نہ بھی بلائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن بھلا ایسے بھی کوئی شادی ہوئی ہے؟ رقعے چھپے تقسیم ہوئے، سانچق مہندی کی تیاری شروع ہوئی۔ اُسی دن کسی گھرانے میں جب یہ رقعہ پہنچا تو وہ حیرت زدہ ہوگئے۔ بار بار لڑکے کا نام پڑھا۔ یقین کرلینے کے بعد انہوں نے انتباہ دیا کہ یہ شادی فوراً روک دیں، لڑکا شادی کے قابل نہیں ہے۔ ماں باپ کے ہوش اُڑ گئے۔ تقریب منسوخ کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے لڑکی پر رحم فرمایا، اُسے بچالیا۔ انتہائی حساس اور زندہ دل لڑکی سے جو سلوک ہوا وہ عرصہ تک بھلا نہ پائی۔ اسے مسلسل دوائیں دی جارہی ہیں۔

ایک اور لڑکی کے ساتھ جو حادثہ ہوا وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ امریکہ کے ایک تعلیم یافتہ، دولت مند ماں باپ کے دولت مند بیٹے نے ہندوستان آکر ایک خوبصورت، کمسن لڑکی سے شادی کی، لڑکی ساتھ چلی گئی۔ شادی کے آٹھ، نو سال بعد بھی وہ ماں نہ بن سکی۔ سنا کہ لڑکے کی ماں مسلسل لڑکی کا ہی چیک اپ کرواتی رہیں، اعلان کردیا کہ لڑکی بانجھ ہے۔ اتفاق سے دوسری بہن بھی امریکہ کے ہی ایک لڑکے سے بیاہی گئی۔ چند دنوں بعد اُسے اصلیت کا پتہ چلا کہ لڑکے میں خامی تھی۔ اس کی معصوم بہن سے کھلواڑ کیا گیا۔

سماج میں آئے دن ایسے گھناونے جرم ہورہے ہیں۔ ذمہ دار، بااثر اصحاب اس طرف

توجہ دیں تو انسانیت پر احسان عظیم ہوگا۔ شادی سے قبل ایڈز اور اسی قسم کی بیماریوں کی تشخیص کے لئے بعض گوشوں سے دبی زبان سے آواز اٹھائی گئی لیکن عمل نہیں ہوا۔ ویسے یہ کوئی ناگوار بات نہیں جس سے کسی کے جذبات مجروح ہوں۔ نیک نیتی سے یہ کام انجام دئے جائیں تو فریقین کے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔

شوہر کی ضرورت دوسری عورت، بیوی کے لئے روزہ!

جس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں، وہ رہنمایانِ ملت کے لئے لمحہ فکر ہے۔ ایک ایسی لڑکی کی دردبھری کہانی جو برسوں سے شوہر کی بے رخی اور مظالم سہتی چلی آ رہی ہے۔ ۲۵ سال قبل اس کی شادی ہوئی۔ تعلیم یافتہ گھرانہ ہے۔ لڑکے کے باپ بھی شہر کے معززین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شادی کے چند سال بعد ہی لڑکا ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک چلا گیا۔ اس وقت اس کی تین لڑکیاں تھیں۔ سال، ڈیڑھ سال میں ایک بار ہندوستان آتا۔ بیوی زیورات سے اور بچیاں کھلونوں سے بہلتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس نے آنا کم کر دیا۔ بیوی سے بدظن، بچیوں سے لاپروائی برتنی شروع کی۔ جس بیوی کو وہ سامنے بٹھا کر تکتا تھا، اب وہ چھپکلی نظر آنے لگی۔ بیوی اور بچیوں نے شروع ہی سے اُسے بے پناہ چاہت دی۔ جس مقام پر وہ رہتا تھا جنگ چھڑ گئی، لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ دوڑے دوڑے اپنے وطن واپس آئے، پر وہ نہ آیا۔ یہاں اس کی بیوی جائے نماز بچھائے اپنے مالک حقیقی سے اس کی صحت وسلامتی کی دعا مانگتی رہی۔ رو رو کر سدھ بدھ گنوا بیٹھی۔ بہت بعد پتہ چلا کہ ۱۵، ۱۶ سال قبل اس نے دوسری شادی رچالی ہے۔ تین بچوں کا باپ بھی ہے۔ اس صورت میں پہلی بیوی اور بچیوں کے مستقبل کا کون ضامن ہے۔

ایک دفعہ بچی نے فون ملایا۔ اس کی سالگرہ کا دن تھا، وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ باپ کی دعا اور مبارکباد لینا چاہتی تھی۔ اُدھر سے آواز آئی، کون؟ میں تمہیں نہیں جانتا! بچی نے سلسلۂ کلام کو منقطع کئے بغیر کہا ڈیڈی! آپ نے دوسری شادی کیوں کر لی؟ جواب ملا مجھے بیوی

ضرورت تھی۔ بچی کی معصومانہ تاویل تھی۔ امی کو بھی آپ کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے کہا میں نے تمہاری امی سے اُسی وقت کہا تھا کہ روزے رکھیں۔ کیوں ڈیڈی؟ روزے کیوں؟ باپ نے بے شرمی سے کہا، یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گی! بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ بیوی بچوں سے نفرت کا یہ عالم ہے کہ اُس نے بچی کی شادی کے وقت نہ صرف اپنی باعصمت، پاکباز بیوی کو بدنام کیا بلکہ لڑکی کی شادی کو روک دینے کی ممکنہ کوشش کی، لڑکے والے سمجھدار تھے، خاندان کے بارسوخ اصحاب کے سمجھانے پر انہوں نے رشتہ نہیں توڑا، میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں کہ انسانیت کہاں گم ہوگئی ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی اور معصوم بچوں سے اتنا گرا ہوا سلوک کر سکتا ہے، کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں۔ لیکن ایسا ہوا ہے، ہو رہا ہے۔

عورت سے ناانصافی، ظلم اور ناروا سلوک کی بے شمار مثالیں ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں، جو علانیہ اپنی پہلی بیوی سے کہتے ہیں کہ میں کچھ نہیں دے سکتا، مجھے تنخواہ ناکافی ہوتی ہے۔ جب کہ اسلام میں مساوی سلوک کی تلقین ہے۔ پیسہ تو بہت دور کی بات ہے۔ وقت کا بھی حساب دینا ہے۔ جن اصحاب نے عورت کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا ہے وہ روزِ آخرت کے بارے میں سوچیں، غیبی مار سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر توبہ کریں اور عورت کو وہ ساری مراعات دیں جن کی وہ حقدار ہے۔

○ ○ ○

میری کام والیاں

میں اپنے گھر کا کام خود کرتی ہوں۔ جھاڑو دینا، برتن دھونا بہت اچھا لگتا ہے۔ پکانا تو میرا پسندیدہ مشغلہ ٹھیرا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں قلم سے ناانصافی نہ ہوجائے، اوپری کام کے لئے ملازمہ رکھ لیتی ہوں۔ وہ دور تو کب کا گزر چکا' جب کئی اور گھرانوں کی طرح ہمارے پاس بھی دو تین ملازم ہوا کرتے۔ اب نہ ایسے وفادار ملازم رہے نہ انھیں رکھنے والے خوشحال مالک چند گھرانوں میں اب بھی ایماندار، جاں نثار نوکر مل جاتے ہیں۔ کہیں مکینوں سے زیادہ نوکروں کی تعداد ہے۔

مائکے سے سسرال آئی تو یہاں پچھی، سیو ماں، یادماں جیسی محنتی، ایماندار عورتیں اور بچیاں یکے بعد دیگرے جھاڑو برتن اور گھر کی صفائی کے لئے مامور رہیں۔ آئی۔ ڈی۔ پی۔ ایل۔ کالونی بالانگر کے پرسکون ماحول میں ستائیس سال رہنے کے بعد شہر کی گہما گہمی سے واسطہ پڑا۔ فلیٹ میں آتے ہی پشپا مل گئی۔ یہ گونگی اور بہری مشہور تھی۔ سنا کہ خواتین اس سے کام لینے کے لئے تیار نہ ہوتیں کیوں کہ یہ نہ بات سنتی ہے اور نہ ہی کچھ کہہ سکتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ کم سنتی تو ہے لیکن گونگی نہیں، صرف زبان صاف نہیں تھی۔ تلگو میں بات کرتی تھی۔ وہ اپنے مخصوص لہجے اور انداز میں اتنی زیادہ باتیں کرتی کہ اچھے اچھے زبان والے بھی مات کھا جائیں۔ میں اس کے سوالات سے کبھی نہیں گھبراتی۔ چند دنوں بعد میں نے پشپا کی ماں کو بلوایا اور اسے مشورہ دیا کہ تنخواہ میں سے ماہانہ سو روپیے کم لیا کرے تاکہ بنک میں روپیے جمع ہوسکیں۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی، میں نے پشپا کو ساتھ لیجا کر بنک میں کھاتہ کھلوادیا۔ اس طرح اس کی شادی کے وقت خاصی رقم ماں باپ کو مل گئی پشپا بظاہر گونگی تھی لیکن فلیٹس میں رہنے

والے کئی افراد اور ان کے خاندان والوں کے بارے میں بہت کچھ معلومات رکھتی تھی۔ کس گھر کی مالکن اپنی کام والی کو کتنا کھانا دیتی ہیں اور دیتی بھی ہیں یا تازہ باسی سب خود چٹ کر جاتی ہیں۔ چائے کا معیار کیا ہوتا ہے،نوکرانی سے ان کا سلوک کیسا ہے وغیرہ وغیرہ ایک دن کہنے لگی وہ موٹا منچی لے دو (اچھا نہیں ہے) پھر اپنی اشاروں کی زبان میں بتانے لگی لفٹ میں ایسے دھکا مارتا ہے۔!!!اس طرح بعض ''مہذب''لوگوں کا پول وہ آناً فاناً کھول دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ اُس گھر میں کام نہیں کروں گی۔ اس قسم کی معلومات کا اس کے پاس کافی ذخیرہ ہے، پتہ نہیں لوگ اُسے گونگی کیوں کہتے ہیں۔ پشپا کی شادی ہوگئی، میں دعا کرتی تھی کہ اسے سسرال اچھا ملے کیونکہ ایک تو غربت میں پلی ہوئی دوسرے زبان میں لکنت۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اپنے گھر میں وہ سکون سے رہتی ہے، کبھی کبھار ملنے آجاتی ہے۔

پشپا کے جانے کے بعد دس سالہ پرمیلا مل گئی۔ صبح میرے پاس کام کرتی دوپہر ۱۲ سے شام ۵ بجے تک اسکول جاتی۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ زیادہ دیر کام لے کر اس کا اسکول ناغہ کرواؤں۔ ویسے اس کی ماں اس پر سختی کیا کرتی کہ اور گھروں میں کام کر کے پیسے لائے۔ پرمیلا ایک دن جھاڑو دے رہی تھی، میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے سے کوئی چیز اٹھا کر اس نے منہ میں ڈال لی۔ ابلے ہوئے انڈے کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ زمین پر گری ہوئی چیز نہیں کھانی چاہیے۔ وہ اطمینان سے بولی، بی بی! ہم تو کچرے میں سے بھی نکال کر کھاتے ہیں۔ اس کی غربت کا حال سن کر میرا دل لرز اٹھا، اس کے گھریلو حالات معلوم کر کے مجھے بہت افسوس ہوا۔ دو بھائی، دو بہنیں ہیں، ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ باپ انہیں پلٹ کر بھی نہیں پوچھتا، کیونکہ وہ دوسری بیوی کے ساتھ مگن ہے۔ ماں حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکی۔ جب بھی مالی پریشانیاں اُسے گھیر لیتی ہیں وہ بچوں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیتی ہے۔ خاص بات یہ کہ وہ صرف لڑکیوں کو مارتی ہے، کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ لڑکا تو بڑا ہو کر سے پالے گا روپے لا کر دے گا، لڑکیوں کو وہ بوجھ سمجھتی ہے۔ بہر حال جس دن پرمیلا کی ماں
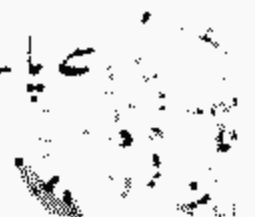
اُسے مارتی، اس دن وہ بہت خاموش، بجھی بجھی سی نظر آتی۔ میرے ایک ہی سوال پر وہ زار و قطار رونے لگتی۔ پیٹھ پر بلٹ کے نشان دیکھ کر اس کی تکلیف کا اندازہ ہوتا۔ میں اس کے زخموں پر دوا لگاتی، تسلی دیتی۔ طبیعت چاہتی کہ اس کی ماں کو پولیس کے حوالے کروادوں۔ کبھی یہ بھی انکشاف ہوا کہ ماں مارتی تو بھائی مار کھلوانے میں اس کی مدد بھی کرتے کئی دفعہ میں نے بلا کر سمجھایا کہ مارنے کے بجائے پیار، محبت سے پیش آئے ورنہ بچے باغی ہو جائیں گے۔

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار سے تنگ آکر بعض دفعہ وہ میرے سامنے دل کی بھڑاس نکالتی، کبھی پوچھ بیٹھتی بی بی! اگر میں لڑکی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے پیدا کرنے والی تو اماں ہے نا! کبھی سادگی سے پوچھتی ایسڈ پی لینے سے کیا میں مر سکتی ہوں۔ کم عمری میں ایسے سوالات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ میں اُسے اطمینان دلاتی کہ اس کی ماں کو بلا کر سمجھاؤں گی اور یہ بھی کہ آئندہ کبھی وہ خودکشی کا خیال دل میں نہ لائے۔ پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوگئی کیونکہ دو تین گھروں میں کام کرنے کی پابندی لگادی گئی۔ اس کے بعد خود اس کے اپنے گھر کا کام کر کے وہ اسکول نہیں جا سکتی تھی۔ میرے توسط سے بنک میں پندرہ ہزار جمع ہوئے۔ یہ رقم اس کی ماں شادی سے دو دن قبل لے گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ یہ پیسے کافی کام آسکیں گے۔ پرمیلا کی ماں وعدے کے مطابق جہیز میں پلنگ، الماری وغیرہ کچھ نہ دے سکی۔ داماد شریف ہے لیکن اتنا شریف بھی نہیں کہ دو تین سال تک خاموش رہے۔ ایک سال بعد اس نے الماری دی، دو سال بعد پلنگ، بغیر بستر والا۔ جوڑے کی رقم جو دس ہزار مقرر ہوئی، وہ بھی بیچارہ قسطوں میں وصول کر رہا ہے۔ سسرال والوں، خصوصاً ساس کے لعن طعن کا سلسلہ جاری ہے وہ بس یہی کہتی ہے، تیری اماں کیا دی؟ ساری زندگی وہ کہتی رہے گی، بہو سنتی رہے گی۔ یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔ کبھی ختم نہ ہونے والی کہانی۔ ایسی آگ جس میں جلنے والی بھی عورت ہے اور جلانے والی بھی عورت، مرد صرف تماشائی کا رول ادا کرتا ہے۔

بے جا رسومات اور دوسرے کاموں کے لئے آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنا ایک عام بات ہے اس میں مذہب یا کسی خاص فرقے اور طبقے کی قید نہیں۔ ہمارے سماج میں بے شمار ایسی مثالیں ملیں گی کہ گھر میں کھانے کے لئے پیسے نہیں ہیں لیکن قرض لے کر شادی بیاہ، رسومات، ٹونے ٹوٹکے اور منت مرادوں پر خواتین بے دریغ خرچ کرتی ہیں۔ پرمیلا کی شادی ہوئے بمشکل ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ اس کی ماں اور ساس اس فکر میں گھلنے لگیں کہ اس کی گود اب تک کیوں ہری نہیں ہوئی، ماں بکرے کی نیاز مان بیٹھی۔ کاش اس کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ اپنی حیثیت کے مطابق بکرے کی بجائے مرغ بھی پکوا سکتی ہے۔ دو سال ہی میں پرمیلا ماں بن گئی، لیکن لڑکے کی نہیں، لڑکی کی ماں۔ یہاں ایک نئی آفت کا سامنا کرنا پڑا، سسرال والے ناراض کہ لڑکا کیوں پیدا نہیں کیا، ساس تو ایک دم خفا۔ بہت ہی پیاری بچی ہے۔ ۸ ماہ کی ہوگئی لیکن دادا دادی نے اس کی صورت نہیں دیکھی صرف اس لئے کہ وہ لڑکی ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ اس کا ذمہ دار مرد ہے، صرف مرد، اُن کا اپنا بیٹا۔

اب میرے پاس رادھیکا کام کرتی ہے، پرمیلا کی چھوٹی بہن۔ یہ جب آئی، آٹھ نو سال کی تھی، معصوم سی بھولی بھالی، غربت کی وجہ سے یہ کام کرنے پر مجبور تھی۔ میں اس سے کبھی سختی سے پیش نہیں آتی۔ کام کرتے ہوئے کبھی کہتی، دیکھیں گے آپ روٹی پہلے پکاتی ہیں یا میں برتن پہلے دھوتی ہوں۔ یہ اب دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ اس میں اتنی خود اعتمادی آگئی ہے کہ وہ بنک جا کر ماہانہ قسط دے آتی ہے۔ پانچ سال سے اس کے پیسے بنک میں جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی ماں کو ذرا برابر پڑھائی کی فکر نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے سالانہ امتحان کے بعد اس کی کامیابی پر بھی وہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔ میں حتی الامکان اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں ہر سال اس کی کامیابی پر گل پوشی کر کے کوئی تحفہ اور مٹھائی دیتی ہوں۔ وہ پھولے نہیں سماتی، یاد رکھتی ہے کہ کس امتحان میں کامیابی پر میں نے کیا تحفہ دیا تھا۔ ان بچیوں سے مجھے ہمدردی ہے، میں جو کھاتی ہوں انہیں کھانے کے لئے دیتی ہوں، خدا کا شکر ادا کرتی

ہوں کہ اس نے مجھے اتنی استطاعت دی اتنا شعور دیا کہ میں غریبوں کا خیال رکھ سکوں بسکٹ، میوہ مٹھائی جو بھی گھر میں آئے میں پہلے ان بچیوں کے لئے رکھ دیتی ہوں۔ انھیں کھاتا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اس خاندان کے سبھی افراد انتہائی محنتی اور ایماندار ہیں۔ انہیں میں نے سکھایا ہے کہ جھوٹ نہ بولیں، چوری نہ کریں، صاف ستھرے رہا کریں اور سب سے اہم یہ کہ ایک گھر کی بات دوسرے گھر میں نہ کریں، اپنے کام سے کام رکھیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس پر عمل کرتے ہیں۔

یہاں مختصراً اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ میں جہاں رہتی ہوں، اُن فلیٹس کے برابر کچی بستی ہے، زیادہ تر مسلم آباد ہیں۔ اکثر عورتیں کسی گھر میں کام کرتی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ مرد سیکل رکشہ یا آٹو چلا کر رات، نشے میں دھت بے تکان لڑتے اور گالیاں دیتے ہیں۔ عورتوں کی لڑائیاں اور گالیاں ان سے مختلف ہیں۔ اس بستی میں رہنے والے بیشتر بچے اسکول نہیں جاتے۔ اپنی ماؤں کے پیچھے پیچھے یا پھر محلے میں گالی گلوچ کرتے پھرتے ہیں۔ اس صراحت کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اکثر مسلم غریب گھرانوں کی یہی صورتِ حال ہے، بچے زیادہ، جہالت اور غربت انتہا کو پہنچی ہوئی۔ کمانے والا ایک اور کھانے والے آٹھ دس۔ بیشتر عورتیں کام چور اور لاپروا، فرضی بیماریوں کا بہانہ کر کے کام سے غفلت برتتی ہیں۔ کاش! یہ زمانے کو دیکھ کر کچھ سیکھیں، زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔ بے جا رسومات اور فضول خرچی سے دور رہ کر بچت کرنے کی عادت ڈالیں۔ اور اپنے مستقبل کو سنواریں۔ اس طبقے کا سدھار کیسے ہو؟ ہوسکتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ہماری، آپ سب کی توجہ کا محتاج......

ooo

میرا وطن۔ شہر حیدرآباد

حیدرآباد میرا وطن ہے، مجھے اپنے وطن سے والہانہ محبت ہے۔ اس شہر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ باہر سے آنے والے یہاں کی گنگا جمنی تہذیب اور عوام کے خلوص کو سراہتے ہیں۔ چار سو سال کی تکمیل کے بعد یہ شہر سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سعودی عرب اور دیگر ممالک میں شایان شان پیانے پر جشن حیدرآباد منایا گیا اور حیدرآباد میں بھی مختلف اداروں کی جانب سے اس کے جشن کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ اس کے لئے شہریان حیدرآباد قابل مبارکباد ہیں۔ ایک قسم کی الجھن کو میں بانٹنا چاہتی ہوں اس امید پر کہ میرے ذہن میں جو مسائل ہیں ان کا حل ڈھونڈا جائے گا اور جو خامیاں یا خرابیاں ہیں انہیں دور کرنے کی مکمل سعی کی جائے گی۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ کہ سڑکوں کی تعمیر کا کام مسلسل چل تو رہا ہے لیکن ہر فرد اس بات کا شاکی ہے کہ بے شمار سڑکیں انتہائی ناقص ہیں۔ دوسری اہم بات سڑکوں کی صفائی ہے ہر شہری خواہ وہ دکاندار ہو کہ مکان دار، اپنے گھر سے کچرا سڑک پر منتقل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب، گھروں اور دکانوں کے سامنے مستقل کچرا پڑا رہتا ہے یعنی حیدرآبادی کچرے میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محکمہ بلدیہ کی ذراسی توجہ سے شہر صاف اور خوشنما بن سکتا ہے۔ چند سال سے شہر کے اہم مقامات پر کچرے کی نیلی گاڑیاں رکھی گئی ہیں لیکن انہیں خالی کرنے کا مناسب انتظام نہیں۔ کچرا جب اٹھایا جاتا ہے تو اطراف واکناف میں بدبو پھیل جاتی ہے۔ یہ بلدیہ کے ملازمین اور دوسرے شہریوں کی صحت کے لئے مضر ہے۔ بالانگر، صنعت نگر، پنجہ گٹہ، خیریت آباد، کوٹھی، معظم جاہی مارکٹ، چار مینار کہ تمام محلہ جات کا یہی حال ہے۔ اکثر مقامات پر کچرے کی کنڈیاں اور میوے کی

بنڈیاں قریب نظر آئیں گی۔ کوٹھی جیسے آباد محلے میں یعنی آندھرا بنک کے روبرو میوے کی بہت بڑی مارکٹ ہے۔ یہاں پر ہر قسم کا کچرا ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ ویمنس کالج سے میڈیکل کالج جانے والی سڑک بہت ہی آباد سڑک ہے۔ یہاں بے شمار بس اسٹاپ ہیں۔ اس سڑک پر کچرے سے لدی بنڈیاں عجب منظر پیش کرتی ہیں۔ ان بنڈیوں کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان ہی کے آس پاس کنگھے وغیرہ بنانے والی عورتیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہوتے ہیں۔ کچرے کی کنڈی سے کبھی کھانے کی کوئی چیز مل جائے تو ان کے لئے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ یہاں چھوٹے موٹے کاروبار کرنے والے روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ بس کا انتظار کرنے والے مسافر حسب ضرورت اور حسب خواہش مختلف چیزیں خرید کر کھاتے ہیں۔ اس مقام کی صفائی کی طرف توجہ دی جائے تو بہتر ہے۔ سارے شہر کی کچرے کی کنڈیوں کو روزانہ خالی کروایا جائے تو شہر صاف اور بارونق بن سکتا ہے۔ گھر اور دوکان کا کچرا سڑک پر ڈالنے والوں پر کڑا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے۔ اس گندگی کے بعد میں حیدرآبادیوں کی اس گندگی کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں جو ان کے دلوں میں گھر کر گئی ہے۔ گذشتہ دس پندرہ برسوں میں اس نے شدت اختیار کرلی ہے۔ ہمارے حیدرآبادی بھائی عورت کا احترام بھول گئے ہیں۔ شہر کی مختلف سڑکوں، گلی کوچوں، مختلف بس اسٹاپ، اسکول، کالج کے پاس روح فرسا نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسکول جانے والی لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ، ناشائستہ فقرے بازی، بسوں میں دھکے بازی، ایسے لگتا ہے کہ ان حضرات کا جینے اور سفر کرنے کا مقصد ہی یہی ہے۔ روزانہ ہزاروں لڑکیاں ان کا نشانہ بنتی ہیں میں یہ محسوس کررہی ہوں کہ اس رویہ میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر تقاریب کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ حیدرآباد کے ذمہ دار سربرآوردہ احباب سے میری درخواست ہے کہ وہ ان امور پر بھی خصوصی توجہ دیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کا جہاں بھی استحصال (Exploitation) کیا جارہا ہے اسے ختم کرنے کی سعی کریں اور جو افراد ان

جرائم اور خرابیوں میں ملوث ہیں وہ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں۔ بس اسٹاپس، سڑکوں اور بسوں میں لڑکیوں کے ساتھ جو بھی سلوک کیا جار ہا ہے وہ حیدر آبادی تہذیب کے لئے ایک بدنما داغ ہے۔ ہمارے بھائی اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں؟ بہت ممکن ہے کہ یہی برتاو کسی دوسری بس میں یا کسی دوسری سڑک پر ان کی بہن، بیوی یا بیٹی کے ساتھ کیا جار ہا ہو۔ اللہ تعالی سے میں دعا کرتی ہوں کہ وہ حیدر آبادیوں کے دلوں کو گندگی سے پاک کر دے۔ محمد قلی قطب شاہ۔ نے اپنی حمد کا ایک مصرعہ یوں لکھا تو اچھا ہوتا ''مرا شہر شریفاں سوں معمور کر،، شہر کی اہم شاہراہ (عابد سرکل) پر کئی ماہ سے ایک عورت ٹاٹ کے ٹکڑے اوڑھے بیٹھی رہتی ہے۔ کبھی مختلف چیزیں کھاتی نظر آئے گی اور کبھی شدید دھوپ میں گرم پتھروں پر سوتی ہوئی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس قسم کے ذہنی طور پر معذور افراد کو مناسب ٹھکانہ دے دیا جائے؟ اگر ایسا ہو سکے تو یہ انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی۔ کوٹھی جیسی اہم شاہراہ پر کبھی ایک نیم برہنہ عورت دکھائی دیتی ہے۔ کتنی شرمناک بات ہے اور افسوس کا مقام ہے کہ حیدر آباد کے معزز حضرات اسے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ آنکھیں سینکتے ہیں اسی شاہراہ پر اسی مقام پر کبھی ایک برہنہ شخص دکھائی دیتا ہے تو یہی بھائی ''سالا'' کہہ کہ نظریں نیچی کر لیتے ہیں جیسے انہیں پہلی مرتبہ اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا ہو۔ شہر میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت سے کسی کو انکار نہیں یہ بھیک خالی ہاتھ پھیلا کر مانگی جاتی ہے یا پھر ہاتھ میں دو چار کنگھے لے کر یا اسکوٹروں کے ہیڈلیمس پینٹ کر کے۔ پرانا شہر، چار مینار، گلزار حوض کے پاس عورتیں بچی کی شادی کے نام سے بھیک مانگتی ہیں۔ وہ زندگی بھر اپنی ایک فرضی بچی کی شادی رچاتی ہیں۔ اس بھیک کے ذکر کے ساتھ دولت مندوں اور پڑھے لکھے لالچی لوگوں کی بھیک کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جار ہا ہے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر رہا ہے۔ قارئین سے میری التجا ہے، انہیں اللہ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ وہ عہد کر لیں کہ جوڑے کی رقم نہیں مانگیں گے اور نہ جہیز کی فہرست کا ...یں گے۔ میری یہ التجا تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے ہے۔ جہیز کا مسئلہ ایک

ایسا مسئلہ ہے جو کہ حکومت کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ساری انسانیت کا مسئلہ ہے حیدرآبادیوں کا شعور جاگ جائے تو وہ خود بخود سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ فعل غلط ہے۔ جوڑے کی رقم اور جہیز مانگنے والوں سے میری گذارش ہے کہ وہ بھکاریوں کی فہرست سے خود کو نکال دیں اپنے لڑکوں کو فروخت نہ کریں شہر حیدرآباد کی تزئین نو کی جارہی ہے۔ بہت سے بڑے اور اہم پروگرام ہونے والے ہیں۔ ایک بار پھر اس شہر کے ذمہ دار اصحاب سے درخواست کرتی ہوں کہ شہر کی آراستگی کے ساتھ باطنی صفائی پر بھی زور دیں۔ چند تجاویز جو میرے ذہن میں آئی ہیں انہیں پیش کر رہی ہوں۔ اس امید پر کہ مختلف محکموں، اداروں اور مختلف مکاتیب خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں گے اور ان پر عمل آوری کے لئے احکامات جاری کریں گے سماج کے مختلف طبقوں میں بھی ان تجاویز کو قبولیت بخشی جائے گی اور خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

۱۔ سڑک پر کچرا پھینکنے والوں پر جرمانہ کا اعلان۔

۲۔ لڑکیوں اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو کڑی سزا۔

۳۔ دھواں خارج کرنے والی گاڑیوں پر جرمانہ۔

۴۔ عبادت گاہوں، اسکول، کالج اور دفاتر کے قریب عورت کے احترام اور جہیز کی لعنت کے خاتمے کے لئے مختلف زبانوں میں نعرے۔

۵۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور۔

۶۔ ٹی وی، ریڈیو اور اخبار سے مقصدی خاکے ڈرامے اور مضامین پیش کئے جائیں۔

(نوٹ: یہ مضمون حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے موقع پر محفل خواتین کے ایک جلسے میں پڑھا گیا، اخبار سیاست میں شائع ہوا اور اس کی ایک نقل گورنر جناب کرشن کانت کو دی گئی۔

○○○

حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب

(اسکول کالج اور گھر کے آئینہ میں)

میں ان خواتین وحضرات میں سے نہیں ہوں جو علانیہ اپنی عمر چھپاتے ہیں۔ زمانہ گزشتہ کے کسی واقعہ کا ذکر چل رہا ہو تو اس کے چشم دید گواہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہہ کر انجان ہو جاتے ہیں ہم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے میری تاریخِ پیدائش یکم نومبر ۱۹۳۵ء ہے۔ میں نے بنڈی، ٹانگہ، شکرام اور بگھی کا زمانہ دیکھا ہے۔ بگھی میں بھی بیٹھنے کا موقع ملا اس لئے کہ ہمارے پاس موجود تھی۔ ابتدائی تعلیم بیدر کے ایک مدرسے میں ہوئی۔ اسکول جانے کے لئے بنڈی گھر پر آتی ابتدائی تعلیم کے بعد گرلز ہائی اسکول نامپلی سے دسویں جماعت کی تکمیل کی۔ نامپلی اسکول میں طالبات کو لیجانے کے لئے شکرام کا انتظام تھا۔ سفید ساڑی میں ملبوس ایک آیا بھی شکرام میں ہوتی جو گھر پر آ کر آواز دیتی گاڑی آئی بی۔ شکرام کو چلمن لگی ہوتی۔ یہاں ایک بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی ہماری شکرام میں ایک گوری سی سولہ سترہ سالہ لڑکی بھی آیا کرتی۔ وہ اپنا ہاتھ چلمن سے تھوڑا باہر کئے ہوتی۔ اسی طرف ایک ہیٹ پہنا آدمی سیکل پر ساتھ ساتھ چلتا۔ بہت بعد میں نے نتیجہ نکالا کہ ہو نہ ہو، یہ عشق پردہ نشیں ہے!

شکرام کے بعد سیکل رکشہ میں کالج جایا کرتی۔ رکشے کو پردہ لگا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر خواتین پردہ لگے رکشے ہی میں جایا کرتیں۔ رکشہ کا پردہ پھٹا ہوتا تو رکشہ والے کو صلواتیں سنائی جاتیں۔ رفتہ رفتہ ایک دور آیا کہ سیکل رکشہ کے پردے غائب ہونے لگے۔ خواتین رکشہ والے سے پوچھ لیتیں پردہ ہے؟ نہیں ہوتا تو اپنے گھر سے ایک چادر لے کر رکشے کے بدون

میں اٹکا دیتیں۔

یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک میں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ شاید یہ جان کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس وقت طالبات کے لئے ایک علٰحدہ بس ویمنس کالج کوٹھی سے یونیورسٹی تک جاتی تھی۔ اس وقت یونیورسٹی میں لڑکیاں، لڑکوں سے آزادانہ طور پر گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ چند ایک لڑکیاں اگر کسی ہال یا کسی کمرۂ جماعت میں کچھ دیر بیٹھی باتیں کرتیں تو بہت عجیب لگتا، چہ مگوئیاں ہونے لگتیں۔ اس طالبہ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ لیکن اب تو ماحول ہی کچھ اور ہے۔ بعض طالبات نہ صرف سبزہ زاروں پر بیٹھی گپ شپ کرتی ہیں بلکہ گھنٹوں ادھر ادھر لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں اور کینٹین وغیرہ میں وقت گزارتی ہیں۔ اب یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے، سماجی اقدار بھی بدل گئی ہیں۔

اس زمانے میں گھر کے بزرگ بہت سی چھوٹی باتوں میں بھی دخیل تھے۔ میں نے اپنے نانا جناب عبدالمجید خاں صاحب کو نہیں دیکھا لیکن نانا ابا کے بھائی جناب عبدالحمید خاں صاحب اور خالہ محترمہ بدرالنساء، بیگم ڈاکٹر محمد یوسف مرزا فرسٹ آر۔ ایم او ردواخانۂ عثمانیہ کے پاس کئی دن رہا کرتی۔ خالہ صاحبہ نے بتایا کہ اس وقت میری عمر ڈھائی سال تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نانا ابا میرے لئے چاکلیٹ، پیپرمنٹ وغیرہ رکھا کرتے تھے۔ مرتبان اتنے بڑے ہوتے کہ اب دکانوں کے مرتبان بھی چھوٹے نظر آتے ہیں ایک دن میں نانا ابا کے گھر پہنچی۔ میرے ماموں کی نظر میری مانگ پر پڑی جو اتفاق سے تھوڑی سی تیڑھی نکالی گئی تھی۔ نانا ابا کی نظر بچا کر انھوں نے مجھے وہاں سے ہٹا دیا۔ سیدھی مانگ نکال کر پٹے گھوٹے اور تنگ چوٹی گوندھ کر موباف باندھ دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ نانا ابا کے ڈر سے کیا گیا۔ وہ تیڑھی مانگ پر سخت برہم ہوتے تھے۔ بات تو بالکل معمولی ہے لیکن موجودہ دور سے مقابلہ کیجئے تب اور اب میں کتنا فرق آ گیا ہے، تہذیب کتنی بدل گئی ہے۔ بیشتر خواتین اور لڑکیاں

پارلرس میں بال ترتیب دلواتی ہیں' ترشواتی ہیں۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں زمانے کا تقاضا ہے کوڑلے اور موباف کا دور کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔

اس وقت کے آداب ہی کچھ اور تھے۔ میرے پرنانا نواب سخاوت یار جنگ کی قیام گاہ سخی منزل تھی جسکا رقبہ بہت وسیع تھا۔ اس وقت چھوٹوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ صبح کے سلام کے لئے بڑوں کے پاس جائیں۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ پرنانا کو سلام کرنے جاتی تھی میرے سر پر اوڑھنی ڈال دی جاتی۔ پرنانا کی صورت یاد نہیں۔ لیکن ان کا رعب دار ہاتھ یاد ہے جس کے سر پر رکھے جانے سے پہلے ہی میں خوف سے کانپ اٹھتی۔ ایک اور سلام دلہن کا سلام تھا۔ دلہن گھونگھٹ میں ہوتی، گھر کی کوئی معتبر خاتون اس کا ہاتھ تھامے گھر کے تمام افراد کے پاس اسے لیجاتی وہ جھک کر انہیں صبح وشام سلام کرتی، یہ اس دور کی تہذیب کا لازمی جز تھا ۔دلہن کا گھونگھٹ اتنا بڑا ہوتا کہ خواتین اسے ستانے کے لئے دولھا کے سامنے لاکھڑا کر دیتیں اور وہ اسی انداز میں جھک کر اپنے شوہر کو بھی سلام کرلیتی، پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ گھونگھٹ میں لپٹی دلہن کو اگر صرف دیواروں کو بھی سلام کروایا جاتا تو اس کے فرشتوں کو خبر نہ ہوتی۔ وہ جھک جھک کر شرما کر کمرے کی دیوار کو سلام کر کے اپنے کمرے میں آ بیٹھتی یا یوں کہیئے کہ لاکر بٹھادی جاتی۔ نانا ابا بے پردگی کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے کئی گز کپڑے پر مشتمل ایک بہت بڑا، لامبا چوڑا پردہ بطور خاص سلوایا تھا۔ جس کا ایک سرا ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کو لگایا جاتا اور دوسرے سرے سے بگھی یا تانگے کو پوری طرح ڈھانک دیا جاتا۔ بگھی بان یا تانگے والے سے کہا جاتا ''ذرا منہ پھیرلو''۔ گھر میں کوئی مہمان خاتون آتیں تو انھیں بھی، اس بڑے پردے میں سے گزر کر آنا پڑتا تھا۔

گھر کی چھت پر مرمت یا کسی اور کام کے سلسلے میں کسی کو چڑھنا ہوتا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ تین مرتبہ اس طرح آواز دے ''مکان پہ چڑھتے گوشہ گوشہ ہو''۔ اب ایسا کوئی نہیں۔ ایک گھر میں بیٹھ کر اطراف کے کئی گھروں کی چہل پہل اور رونق سے دل بہلایا

جاسکتا ہے،نظروں پر کوئی روک ٹوک نہیں۔کوئی آڑ نہیں۔

اب چھت سے اتر کر صحن میں آیئے۔اس وقت تقریباً ہر گھر میں صحن ہوا کرتا۔کہیں چھوٹا کہیں بڑا۔اس کی مناسبت سے گھر کے مکیں اپنے ذوق کی تسکین اور تکمیل کر سکتے تھے۔ہم نے مختلف میووں کے درخت لگائے تھے آم، جام، جامن، انار، انجیر، فالسہ، سپوٹا، ناریل، موسمی، بیر، پپئی وغیرہ نہ صرف خود کھاتے بلکہ دوست احباب اور رشتہ داروں کو بھی تحفتاً بھیجا کرتے۔گلاب، موتیا، چنبلی اور جوہی کی خوشبو سے گھر معطر رہتا۔بہ یک وقت گلاب کے تین چارسو پھول کھلتے۔صحن میں اتنی گنجائش تھی کہ پالتو جانوروں کا شوق بھی پورا ہو سکتا تھا۔طوطا، مرغی، بھینس، بکری اور قاز ہم نے پالے تھے۔ہم گھر میں مسکہ بھی بنا لیتے تھے اور بغیر ملاوٹ کی چیزیں گھر بیٹھے کھاتے تھے اب تو خلوص میں بھی ملاوٹ ہے اس زمانے میں مہنگائی کا تصور نہیں تھا۔آمدنی کم ہوتے ہوئے بھی لوگ بے فکری سے زندگی گزارتے تھے۔اکثر گھروں میں تین چار ملازم ہوا کرتے۔ہمارے پاس بھی چار نوکر تھے۔ایک ملازم باہر کا کام کرنے والا، پکانے والی اور اوپری کام کرنے والی دو خواتین اور ایک آیا جو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔بعض گھروں میں مستقل رہنے والے نوکر اب بھی مل جاتے ہیں ان کی ناز برداری برداشت کر لیجئے نوکروں کے ساتھ ان کے دوست احباب کا بھی خرچہ اٹھانے کا ظرف رکھیئے تو آرام سے دن بھر بستر پر پڑی رہ سکتی ہیں۔

یہ تو تھا قدیم حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کا جائزہ۔اب میں زمانۂ قدیم سے مقابلہ کر کے چند اہم باتیں بتانا چاہتی ہوں۔گزشتہ زمانے میں لڑکیوں کو تعلیم دینا، اسکول یا کالج بھیجنا اکثر گھروں میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن اللہ کے فضل سے خواتین نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی ہے۔بیشتر خواتین تعلیم حاصل کر کے ملازمت کو ترجیح دے رہی ہیں۔ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی ہو وہ دوسرے مختلف فنون جیسے سلائی وغیرہ کر کے یا ادارہ قائم کر کے ذریعہ روزگار بڑھا رہی ہیں اس طرح گھر کے معیار کو بلند کرنے میں وہ مردوں

دوش بہ دوش چل رہی ہیں۔ زمانہ گزشتہ میں اپنے فرائض کو پورا کرنا ہی زندگی کا مقصد تصور کرتی تھیں۔ اب فرائض کے ساتھ اپنے حق کو پہچان کر مانگنا اور ضرورت پڑے تو چھین کر لینا بھی وہ جان گئی ہیں۔ لڑکیوں کو شروع ہی سے یہ تعلیم دی جاتی کہ ماں باپ کے گھر سے سسرال جائیں تو بس مرتے دم تک وہاں سے نہ نکلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے گئے۔ ان سے ناانصافیاں کی گئیں۔ انھوں نے اف تک نہ کی۔ خاموشی اور گھٹن میں انھوں نے زندگی گزار دی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا خواتین باشعور ہوتی گئیں۔ ساس سسر کی خدمت وہ کرتی ہیں لیکن جہاں ناانصافی اور ظلم شروع ہوتا ہے اسے کچلنا وہ جان گئی ہیں ہونا بھی یہی چاہئے۔ کیروسین کا جواب کیروسین سے دیا جائے تو کوئی بہو نہیں جلے گی۔ کوئی گھر تباہ نہ ہوگا اور کوئی خاندان نہیں بکھرے گا۔

خواتین ثابت قدم ہوکر زندگی کی لڑائی میں جیت حاصل کرسکتی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کی خواہشوں اور صلاحیتوں کو نہیں کچل سکتی۔ عورت پورے گھر اور خاندان کو سنبھالنے کی ذمہ داری لئے اس دنیا میں آئی ہے۔ اس کو ستانا، حقوق کی پائمالی کرنا اور ظلم ڈھانا سراسر ناانصافی ہے۔ عورت کے حقوق کے لئے میرا قلم انشاءاللہ زندگی بھر چلے گا۔ آپ بھی اس قافلے میں ہیں۔ عورت کبھی نہیں ہارے گی۔

○ ○ ○

چل کے تو دیکھو

میرے والد کا خیال تھا کہ ہندوستان میں لڑکوں کو ملازمت ملنی مشکل ہے۔ بس یہیں سے خاندان بکھر گیا۔ پپا نے سب سے پہلے میرے بڑے بھائی مرزا شمس الدین بیگ کو کراچی بھیج دیا۔ اس کے بعد میری بہن زہرہ ضیاء کی شامت آئی۔ ان لوگوں نے گھر، گھر والوں سے الگ رہ کر جو زندگی گزاری اس کی تفصیل میں جاؤں تو ایک طویل مضمون درکار ہے۔ دوسرے بھائی بھی اسی طرح بھیجے گئے۔ اب میری باری تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل کرنے کی۔ پتہ نہیں کیوں پاکستان کا نام آتے ہی میرا خون کھولنے لگتا۔ مجھے سمجھایا گیا، اُکسایا گیا، خوشامد کی گئی۔ امی نے آخری وار یوں کیا ایک دفعہ کہا چل کے تو دیکھو، میں بپھر گئی۔ امی سے کہہ دیا میرے مرنے کے بعد میری ہڈیاں لے جانا بہر حال میں ملک چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں میری شادی توفیق صاحب سے ہو گئی، بعض نادانوں نے یہ سمجھا کہ میری محبت کی شادی ہے اور اسی خاطر میں ہندوستان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی تفصیل میں نے کہیں بتادی ہے۔ یوں بھی نا سمجھ، ناداں، کم فہم لوگوں کے منہ لگنا صراحت کرنا، تاویل پیش کرنا یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ وقت کی خرابی کے سوا اور کچھ نہیں، بات تھی پاکستان کی، سب بچوں کو منتقل کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں میرے والدین بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ سات بھائی اور دو بہنیں پاکستان میں اور میں یہیں رہی۔ سبھوں نے اللہ کے فضل سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر کراچی سے روزگار کی تلاش میں جو نکلے تو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ مرزا اظہر الدین بیگ کناڈا، مرزا مجید الدین بیگ، مرزا رفیع الدین بیگ امریکہ، مرزا رضی الدین

دوبئی، مرزا شمس الدین بیگ، مرزا بدر الدین بیگ، مرزا صلاح الدین بیگ اور دو بہنیں زہرہ ضیاء اور نور جہاں ضیاء کراچی میں ہیں۔

اعظم پورہ والا مکان (موجودہ عروسہ فنکشن ہال) تو پہلے فروخت ہو چکا تھا۔ پاکستان منتقل ہوتے وقت سعید آباد کا رہائشی مکان بھی فروخت کیا گیا صرف ۱۸ ہزار میں۔ امی کو اس مکان کے بیچنے کا بہت افسوس تھا۔ جب بھی حیدرآباد آتیں اس کا ذکر کر کے رنجیدہ ہو جاتیں۔ افسوس تو وطن چھوڑنے کا بھی تھا لیکن گزری باتیں دہرانے سے کیا حاصل ہوتا۔ آخری عمر تک انہیں یہی احساس تھا کہ انہیں وہاں مہاجر کا نام دیا گیا اس کی تلافی میرے بھائیوں اور بہنوں نے کر دی۔ سبھی اعلیٰ عہدوں پر رہ کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

سب کے منتقل ہو جانے کے بعد دوسرے ہی سال مجھے پہلی مرتبہ کراچی جانے کا موقع ملا ۱۹۶۴ء میں پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد میں، توفیق صاحب اور دونوں بچے کئی بار کراچی گئے۔ عموماً گرما کی تعطیلات میں ہم جایا کرتے۔ امی پپا کے علاوہ میرے سبھی بھائی بہن ہم سب سے انتہائی خلوص، پیار و محبت سے ملتے۔ ہر طرح ہمارا خیال رکھتے۔ گھومنے پھرنے اور کتابوں سے لے کر مختلف اشیاء کی خریداری، میزبانی سب انھیں کی ہوتی عموماً ایک ماہ کا قیام ہوتا۔ ۱۹۶۴ء کے بعد ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۵ء اور آخری بار ۱۹۸۹ء میں پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے کراچی جانا ہوا۔ یہاں صرف ۱۹۸۵ء کے سفر پاکستان کے چند تاثرات اور واقعات قلمبند کر رہی ہوں۔

۱۵ رمئی کو ہم کراچی پہنچے۔ ایرپورٹ پر بھائی اور بہنیں ہمیں لینے آ گئے تھے۔ والدہ سے میں چند ماہ قبل مل چکی تھی۔ میری لڑکی عفت کی شادی میں شرکت کے لئے وہ ہندوستان آئی تھیں۔ لیکن والد کو دیکھے تقریباً ۵ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں سیدھے ان کے کمرے میں گئی۔ وہ بہت کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ آٹھ دن دواخانہ میں شریک تھے، ایک دن قبل ہی گھر آئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر، ان سے مل کر بے اختیار آنسو نکل پڑے، یہی کیفیت پپا

کی بھی تھی۔ بڑی بہن زہرہ دس سال ملیشیا میں رہ کر کراچی آئیں۔ سترہ سال بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑے بھائی ریاض سے کراچی آئے ہوئے تھے۔انیس سال بعد ان سے ملنے کا موقع ملا۔خونی رشتے اور برسوں بعد ملاقات، سب کی آنکھیں ترسی ہوئی تھیں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے دل بے قرار تھے۔

دو تین دن بعد سے ہمارا معمول تھا کہ روزانہ گھومنے پھرنے اور خریداری کرنے گھر سے نکل جاتے۔ کراچی میں رات دیر گئے تک چہل پہل رہتی ہے، رمضان کے مبارک مہینے میں تو بازاروں کی رونق دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کراچی نہایت صاف ستھرا، خوبصورت شہر ہے۔لوگوں کے دل جتنے بڑے ہیں ویسے ہی ان کے گھر اور سڑکیں بھی ہیں۔ جس طرف نظر دوڑائیں ہمہ منزلہ شاندار عمارتیں ملیں گی۔ بازاروں کی رونق کے کیا کہنے، دنیا جہاں کا سامان بھرا پڑا ہے۔ ہر وقت، ہر موسم میں لوگ خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ عید، بکرعید کی تخصیص نہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے حکومت نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے وہ یہ کہ ہر محلے میں جمعہ بازار لگتے ہیں۔ یہ اتنے پرکشش اور فائدہ مند ہوتے ہیں کہ اکثر لوگ خریداری سے واپس گھر پہنچنے کے بعد دوسرے جمعہ کا انتظار کرتے ہیں۔ اسے منی نمائش بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے مختلف بازاروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ایک جگہ گوشت، مرغی، انڈے، مچھلی وغیرہ کے اسٹال تھے۔ بہنوں نے کہا کہ پورا بازار گھومنے کے بعد واپسی میں مرغی لے لیں گے۔ ایک گھنٹہ گھوم کر آئے تو دکانیں اور دکان دار دونوں غائب تھے۔ چند جگہوں پر مرغی کی گردنیں رکھی دکھائی دیں، آن کی آن میں وہ بھی ہاتھوں ہاتھ خرید لی گئیں۔

گوشت ترکاری کے بعد سلسلہ وار میوے، مٹھائی، بسکٹ اور پکوان کی اشیاء کے اسٹال تھے۔ اسٹیل اور کانچ کے برتن، تھرماس، واٹر کولر، جوتے، چپل، چوڑیاں، پرس، کھلونے، غرض ہر قسم کا سامان تھا۔ جگہ جگہ یہ عبارت پڑھنے کو ملی، پاکٹ ماروں سے ہوشیار رہئیے، اپنی پاکٹ کی آپ حفاظت کیجئے۔ کچھ دیر بعد ایک ایرانی جوڑے پر نظر پڑی جو اپنے گمشدہ پاکٹ کی تلاش میں

پریشان پھر رہا تھا۔ جمعہ بازار تو مشہور تھے ہی، بعد میں اتوار بازار اور منگل بازار بھی لگنے لگے۔

لوگ کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں، بے شمار ڈائجسٹ اور رسالے ہیں۔ قومی ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، خواتین ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، پاکیزہ وغیرہ اخبار جہاں، اخبار خواتین ہفتہ وار اخبار ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی، ادبی، فلمی مضامین کے علاوہ عورتوں اور بچوں سے متعلق دلچسپ، معلوماتی مضامین شامل رہتے ہیں۔ میووں سے بازار بھرے پڑے ہیں۔ سرما میں کینو، مالٹہ، خشک میوہ کثرت سے بکتا ہے۔ آلو چہ ۱۶ روپیہ کیلو، سیب ۱۶ روپیہ کیلو، کچی قوبانی ۱۰ روپیہ کیلو، خربوزہ ۷ روپیہ کیلو، اور کیلا ۶ روپیہ درجن ہے۔ اس کے علاوہ فالسہ، جام، چیکو، تربوز بھی میوے ہیں، اناس البتہ نایاب ہے۔ ۴۰ روپیہ میں ایک، جب کہ ہندوستان میں تین چار روپیہ میں مل جاتا ہے۔ (یہ قیمتیں ۱۹۸۵ء کی ہیں۔ یقیناً اب تبدیلیاں آگئی ہیں)۔

آم کئی قسم کے ہیں۔ سندھڑی، لنگڑا، الماس، دسہری، سرولی اور دوسری بہت سی قسمیں ہیں۔ اس وقت سب سے اچھا آم انور رٹول تھا جو ۱۶ روپیہ کیلو فروخت ہو رہا تھا۔ یہاں کے بے نشان، چنا رسال، پدا رسال بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے وہ لوگ جو یہاں سے منتقل ہو گئے ہیں اپنے وطن کی طرح ان آموں کو بھی یاد کرتے ہیں۔ کراچی ایرپورٹ پر چکنگ کے وقت میں نے صاف صاف بتا دیا تھا، سوٹ کیس میں چند ہینڈلوم اور دھرماورم کی ساڑیاں ہیں۔ بڑے کارٹن میں ۲۵ کیلو پدا رسال اور چنا رسال، چار آم کے جھاڑ اور ۵۰۰ پان ہیں۔ میری صاف گوئی پر اُس نے مناسب جانا کہ چکنگ نہ کی جائے۔ کراچی میں پان بہت مہنگا ہے۔ تیز قسم کا پان ہوتا ہے اس لئے چھوٹا سا ٹکڑا کھایا جاتا ہے۔ کئی گھروں میں پان کی بیلیں لگائی گئی ہیں۔ ہندوستان کا پان ۱۲ روپیہ چھٹانک کہیں کہیں مل جاتا ہے۔

ایک مرتبہ دائرہ ادب اور میڈیکل اسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ہند پاک مشاعرے میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اسٹیج انتہائی خوبصورت، میدان میں چاندنی کا

فرش اور گاؤ تکیے، جگہ جگہ مٹی کے ایش ٹرے رکھے گئے تھے۔ اسی دن کسی اور مقام پر بھی مشاعرہ تھا۔ ہندوستان کے مشہور شاعروں کو آنے میں دیر ہوگئی۔ سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک اٹھا۔ مشاعرے کے آغاز کا اعلان ہوا، مقامی شعرا یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ لوگ کسی کو سننے تیار نہیں تھے، بڑے دلچسپ ریمارک سننے میں آئے۔ ایک شاعر کالا شرٹ پہنے اسٹیج پر آئے۔ کالر، جیب اور آستین پر سفید پٹیاں تھیں۔ ان کے آتے ہی ایک منچلے نے پکارا، عید کا شرٹ ہے کیا؟ ابھی سے کیوں پہن کر آگئے، اتار دو! اس کے بعد جو بھی شاعر آتا خواہ اس کا کلام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، دل کھول کر ہوٹ کر رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے، پھر ایک آواز آئی اب شاعروں کو بلاؤ اس طرح مہمان شاعروں کے آنے تک بعض سامعین نے اپنا اپنا رول نبھایا ایسے سامعین حیدرآباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جگہ جگہ ملیں گے، کہیں مہذب شرارت تو کہیں غیر معیاری لفظی حملے......

سامعین کے ذکر کے ساتھ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے ایک بڑے جلسے کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایوارڈ دیئے جا رہے تھے، ہال اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا تھا۔ کنویز نے کہا فلاں صاحب کو ان کی کتاب پر ایوارڈ دیا جا رہا ہے، وہ نہیں آسکے اُن کے پوتے ایوارڈ حاصل کریں گے۔ ہال میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایوارڈ لینے جو صاحب اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنے لگے سر پورا سفید تھا۔ ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک منچلے نے سوالیہ انداز میں پکارا، یہ پوتا ہے؟ یقین مانئے کچھ سکنڈ تک ہال قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ پوتا درمیان میں آگیا بات ہی کچھ ایسی تھی کہ لکھے بغیر نہ رہا گیا۔ بذلہ سنجی اور برجستگی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

والدین کے ساتھ بھائی بہنوں، بھابیوں اور بہنویوں کا رویہ قابل تعریف ہے۔ کراچی سے باہر رہنے والے بھائی بھی بہت خیال رکھتے ہیں اور جو ساتھ ہیں انہیں دیکھ کر دعا کرتی ہوں کہ اللہ نظر بد سے بچائے، جزائے خیر دے اور ہر کسی کی اولاد کو یہی ہدایت دے کہ ضعیف والدین کا اسی طرح خیال رکھیں، رہنے سہنے، کھانے پینے، دوا، لباس غرض کہ تمام

ضروریات زندگی میں کوئی کمی نہیں۔ ایک دفعہ ہمارے کراچی کے قیام کے دوران میرے بھائی ڈاکٹر مرزا بدرالدین بیگ کا دوسرا گھر زیر تعمیر تھا۔ اس زیر تعمیر عمارت میں انہوں نے والدین کے کمروں کی نشان دہی کی۔ ورنہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ تین چار بچے ہوں تو ماں باپ کی ضعیفی کے وقت انہیں فٹ بال بنا دیتے ہیں۔ ایک بچہ دوسرے کے پاس بھیجتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے پاس، تیسرا کہتا ہے تم خود ہی دیکھ لو ان کے رہنے کے لیے میرے پاس جگہ کہاں ہے۔ خود ہمارے بچوں کے لئے کمرے ناکافی ہیں۔ یہی وہ والدین ہوتے ہیں جنہوں نے ان بچوں کی دکھ بیماری میں رات اور دن کی گردش کا بھی خیال نہیں رکھا۔ جنہیں پالنے پوسنے اور تعلیم دینے میں ساری زندگی وقف کردی، اسی خیال میں مگن رہے کہ بچوں کو پھلتا پھولتا دیکھیں۔

بہرحال سبھی بہن بھائیوں نے امی پپا کا ہر طرح خیال رکھا۔ میرے بھائی ڈاکٹر بدرالدین دواخانے کی بے پناہ مصروفیات کے بعد جب رات گھر لوٹتے تو سیدھے امی کے پاس آتے۔ ان کی دواؤں کی جانچ کر لیتے کہ کوئی دوا ختم تو نہیں ہوگئی۔ ایک دفعہ رات دیر گئے کسی دوا کی ضرورت تھی۔ وہ خود گئے اور مطلوبہ دوا لے کر لوٹے۔

جناب خواجہ حمیدالدین شاہد سے ہندو پاک کے سبھی دانشور واقف ہیں۔ وہ جب حیدرآباد میں تھے، اُس وقت سے مجھے جانتے تھے۔ دکنی زبان کی قواعد کے کام سے وہ واقف تھے۔ پاکستان چلے گئے تو ایوان اردو اور سب رس وہاں بھی حیدرآباد کی یاد دلانے لگے۔ پابندی سے وہ ماہنامہ سب رس پاکستان سے نکالا کرتے۔ میرے والد بہادر یار جنگ اکیڈیمی سے وابستہ رہے۔ شاہد صاحب کی ان سے گہری دوستی تھی۔ دونوں انتہائی خلوص ومحبت سے ملتے، ایک دوسرے کے گھر جاتے، ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ پپا کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں شاہد صاحب ہمیشہ تعاون کرتے۔ میں جب بھی پاکستان گئی شاہد صاحب سے ضرور ملاقات ہوتی۔ میں اور توفیق صاحب ان کے گھر جاتے۔ ڈاکٹر فراست صاحبہ بہت ہی اہتمام سے کھانے پر مدعو کرتیں۔ پہلی پاک و ہند کانفرنس کے دوران جشن شاہد بھی جوش وخروش سے

منایا گیا جس میں، میں نے شاہد صاحب کی شخصیت پر خاکہ سنایا تھا۔ شاہد صاحب سراپا خلوص تھے۔ ان کی ڈکشنری میں تلاش کے باوجود ''نہیں'' کا لفظ کبھی نظر نہ آیا۔ وہ اپنی گونا گوں مصروفیات اور خرابی صحت کے باوجود کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ میں حیدرآباد سے جب بھی پاکستان جاتی وہاں کے کسی نہ کسی ادیب کی کتاب کے سلسلہ میں کچھ مواد درکار ہوتا۔ میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور شاہد صاحب کے سامنے مسئلہ رکھ دیتی۔ دونوں حضرات رہنمائی کرتے۔ شاہد صاحب مطلوبہ مواد کی فراہمی سے لے کر اس کی فوٹو کاپی کروا کر دینے تک کا کام اپنے ذمہ لے لیتے۔ انہیں زحمت دے کر شرمندگی ہوتی، وہ مشکل آسان کر کے خوش ہوتے۔

جشنِ شاہد کے موقع پر میں نے شاہد صاحب کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہوئے یہ دعا بھی مانگی تھی کہ دودن سے پاک و ہند کے لوگ جس طرح ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں ہر سال ایسی محفلیں ہوا کریں، کتابوں اور خیالات کا تبادلہ ہو، مل بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹ لینے کے بہانے آسانی سے میسر آسکیں۔ پاکستان کے بارسوخ، معزز حضرات سے میں نے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنے اثرات و اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے کچھ ایسا کریں جس سے پاک و ہند کے شاعر اور ادیب ایک دوسرے کی کتابوں کے لئے نہ ترسیں، بہ آسانی ہر کتاب خرید سکیں۔ ایسا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اردو زبان و ادب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام پا گئی۔

وائس چانسلر اور سادگی:

وائس چانسلر کا عہدہ بہت بڑا عہدہ ہے۔ یہاں پہنچنے تک کسی بھی فرد کی مصروفیات بہت بڑھ جاتی ہیں۔ کرسی کا رعب خود بہ خود چھا جاتا ہے۔ عموماً وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ عام آدمی کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا، یا یوں کہیئے کہ وہ اپنی شان کے خلاف تصور کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایسے وائس چانسلر نہیں۔ ان کی ادب دوستی اور طبیعت کی سادگی نے انہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ ان سے مل کر، ان سے گفتگو کر کے انسان خود پر فخر کرنے لگتا

ہے۔ حیدر آباد تشریف آوری کے موقع پر ڈاکٹر جمیل جالبی کو دو تین مرتبہ جلسوں میں دیکھا اور سنا تھا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت، ادب کی ہر صنف پر کامل عبور نے انھیں ہندو پاک کے علاوہ دوسرے بیرونی ممالک میں بھی مقبول بنا دیا ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے گھر سے میں نے انھیں فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، کل ہی میں اپنی کتابیں جما رہا تھا۔ آپ کی کتاب گویم مشکل دیکھ کر آپ کا خیال آیا۔ میں نے ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ انہوں نے کہا اگر آپ شاہد صاحب کے گھر سے بات کر رہی ہیں تو ابھی پندرہ منٹ میں آجایئے۔ میں اور توفیق صاحب خوشی خوشی ان کے گھر پہنچے۔ بیگم ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت ہی خلوص سے ہمیں بٹھایا۔ گرمی کا موسم تھا، خوبصورت، وسیع لان پر ایک طرف میز کرسیاں تھیں، دوسری جانب فرش کا اہتمام تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لائے، چائے اور اس کے سارے لوازمات کے ساتھ ہماری خاطر داری کی گئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی چند کتابوں کا ذکر کیا جو نہیں مل رہی تھیں، انہوں نے ایک دکان کی نشان دہی کی۔ پھر سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے، آپ تو یہاں مہمان ہیں۔ آپ کے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے، کتابیں میں دے دوں گا۔ میرے پاس ان کی کئی کتابیں ہیں، دستخط شدہ، تحفۃً دی ہوئی۔

دوسری بار جب ہم ڈاکٹر جمیل جالبی کے گھر گئے، عید کا دوسرا دن تھا۔ بہت بڑا، شاندار دیوان خانہ، وہاں سے گھر کے دوسرے گوشے پر نظر پڑی، ہر طرف کتابیں ہی کتابیں، الماریوں میں جمی ہوئی۔ تاریخ ادب اردو پر انہوں نے جس انداز سے کام کیا ہے، شاید ہی کوئی دوسرا محقق اس طریقۂ کار کو اپنا سکے۔ انہوں نے بتایا کہ بیرون ملک سے انہوں نے بے شمار قلمی کتابوں اور رسالوں کی فوٹو کاپی، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے منگوائی ہیں۔ بیگم ڈاکٹر جمیل جالبی کہہ رہی تھیں کہ رات دن اس تاریخ ادب اردو کے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لکھی اس تاریخ کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ ادب کے کسی پہلو کو انہوں نے تشنہ نہیں چھوڑا اور ایک محقق اور نقاد کے فرائض کو ملحوظ رکھتے ہوئے سچی لگن اور

ایمانداری سے اپنے فرض کو نبھایا ہے۔

ہم جس وقت وہاں پہنچے ڈاکٹر صاحب کسی بزرگ ہستی سے محوِ گفتگو تھے۔ دیوان خانہ ہی میں ایک طرف کھانے کی میز تھی۔ جس پر کیک، بسکٹ، کھارا، کچوری، میوے، مٹھائیاں اور دوسری بہت سی چیزیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی اور مہمان سے نبٹ رہے تھے۔ مگر ہم سے غافل بھی نہیں تھے۔ ہم سے مخاطب ہو کر کہا آپ لوگ کچھ کھائیں، ہمیں بڑی جھجک محسوس ہو رہی تھی، ایک احساس تھا کہ ایک بلند پایہ، نامور ہستی سے ملاقات کے لئے ان کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ پھر ان کی بیگم صاحبہ نے خود ہماری پلیٹ میں ڈالنا شروع کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ہم سے ہم کلام ہوئے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بہت سے قیمتی مشورے دیئے۔ ادبی مصروفیات کا حال پوچھا۔ ہم لوگوں نے جانے کی اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ گھر کی دوسری منزل سے اترتے ہوئے گیٹ تک ہمارے ساتھ آئے۔ ان کے اخلاق دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ وائس چانسلر کا بارعب عہدہ اور ان کی سادگی اور خلوص کی انتہا کہ کار تک آ کر ہمیں خدا حافظ کہا۔ اس عزت افزائی کو میں خدا کی دین سمجھتی ہوں۔

۱۹۸۹ء کا سفر پاکستان بھی یادگار سفر ہے۔ اس سال کراچی میں پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے طنز و مزاح نگار مدعو تھے۔ حیدر آباد سے میرے علاوہ ڈاکٹر رشید موسوی، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ اور طالب خوندمیری نے شرکت کی تھی۔ مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، فیاض احمد فیضی اور شفیقہ فرحت بھی اس کانفرنس میں مدعو تھے۔ ڈاکٹر رشید موسوی اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے طنزیہ مزاحیہ ادب کا مختلف پہلوؤں سے مبسوط جائزہ پیش کیا۔ بھی شاعروں اور ادیبوں کو سراہا گیا۔ سارے کراچی میں دھوم مچی ہوئی تھی، مشاعرہ بھی یادگار رہے گا۔ ۱۷ ر مئی ۱۹۸۹ء کراچی کے نیپا آڈیٹوریم میں تقریباً ایک ہزار سامعین کی موجودگی میں، میں نے اپنا مزاحیہ مضمون ''بچہ باہر گیا ہے'' سنایا۔ بلا مبالغہ کہہ رہی ہوں کہ حیدر آباد سے دس گنا زیادہ داد ملی۔ ہر ہر جملے

لوگ محظوظ ہو رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اس کے بعد بہادر یار جنگ اکیڈیمی کے ایک شاندار جلسے میں مجھے مدعو کیا گیا۔ اخبارات اور رسائل میں ان جلسوں کی رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ سبھی مزاح نگاروں کے انٹرویوز شائع ہوئے۔ دوسری کئی انجمنوں کے علاوہ نامور ادیبوں نے بھی اپنے گھر پر طنز و مزاح کی محفل سجائی۔ مشفق خواجہ کے گھر پر بھی ہمیں مدعو کیا گیا یہ ایک یادگار محفل تھی۔

کراچی کا یہ میرا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد جانے کا موقع نہ مل سکا۔ آج کل تو دوستانہ تعلقات میں کچھ اضافہ ہوا ہے، حالات سازگار ہیں۔ انشاءاللہ کراچی پھر جاؤں گی۔ وہاں رہنے والے بھائی بہن منتظر ہیں۔

عرصہ گزر گیا ایک فلم چل رہی تھی گرم ہوا، کہانی ملک کی تقسیم سے متعلق تھی۔ آخری سین یہ تھا کہ دستر خوان چھوٹا سا بچھا ہوا تھا۔ خاندان بکھر گئے تھے۔ مجھے اپنے ماں باپ، بھائی بہن یاد آ گئے۔ دالان میں بڑا دستر خوان بچھتا اور دس بارہ لوگ ہوتے۔ پکچر ختم ہوا، اٹھنے لگی تو میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

○ ○ ○

جدہ، فضلیت اور روشنی کا شہر

عرصۂ دراز سے آرزو تھی کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جائیں، عمرہ کی سعادت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی زیارت نصیب ہو۔ ماہ ستمبر ۱۹۹۵ء میں ہم نے مصمم ارادہ کرلیا۔ 11 / اکٹوبر کو جدہ پہنچ چکے تھے۔ بفضل تعالیٰ 12 / اکٹوبر کو ہم نے پہلا عمرہ کیا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ایک اور عمرہ کیا۔ پھر مزید دو مرتبہ کعبہ شریف کا طواف کرنے اور کعبہ شریف کے صحن میں کچھ گھنٹے بیٹھ کر عبادت کرنے کی سعادت ملی۔ یہاں پہنچ کر قلب کی جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ اس شہر کے رہنے والے خوش نصیب ہیں کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جانے اور عمرہ اور زیارت کے زرین مواقع ان کے لئے ہیں۔ رات کے نو بجے بھی روانہ ہوں تو عمرہ کر کے دو بجے تک گھر واپس آسکتے ہیں۔ عمرہ ویزا پر جانے والوں کے لئے چند قوانین کی پابندی ضروری ہے۔ ویزا صرف پندرہ دن کے لئے ملتا ہے۔ اسی مدت میں مکہ شریف اور مدینہ منورہ جا کر واپس آجانا لازمی ہے۔ جدہ پہنچنے کے آٹھ دن بعد ہی ہم جمعرات کو مدینہ منورہ گئے۔ جمعرات کی شب وہاں قیام کیا، جمعہ کی نماز ادا کی اور اسی رات جدہ واپس آئے۔

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد دل کو سکون اور اطمینان ہوا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ روضہ مبارک کے اتنے قریب ہیں۔ خواتین کے لئے علحدہ حصہ ہوتا ہے۔ سینکڑوں خواتین کے ساتھ ہم نے بھی نماز ادا کی۔ جدہ میں ہمارا قیام صرف بیس دن کا تھا۔ اس لئے عمرہ وزیارت کے بعد تقریباً روزانہ شام میں گھر سے باہر نکلتے۔ جدہ بہت ہی بارونق اور خوبصورت شہر ہے۔ پورا شہر بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ سڑک کی دونوں جانب شاندار عمارتیں ہیں۔ بعض ہمہ منزل عمارتیں ایسی ہیں جو گلاس سے بنی ہوئی ہیں۔ اینٹ پتھر کا استعمال صرف بنیاد میں ہوا ہے۔ جدہ کی سڑکیں انتہائی کشادہ اور صاف ہیں۔ ہر سڑک پر کئی Tracks ہیں، گاڑی کی رفتار کی مناسبت

Track کا استعمال ہوتا ہے۔ یونیورسٹی روڈ پر اٹھارہ Tracks ہیں۔ سڑکوں پر کہیں کاغذ یا کچرا نظر نہیں آتا۔ ضرورت پڑنے پر لوگ اپنی موٹر میں رکھی پلاسٹک کی تھیلیوں میں کاغذ وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ روزانہ صبح سڑکوں کی صفائی ہوتی ہے، کچرے کی گاڑیاں آتی ہیں اور جگہ جگہ رکھی کنڈیوں سے کچرا لے جاتی ہیں۔ ان گاڑیوں کے آنے اور کچرا اٹھانے کے دوران کسی قسم کی ناگوار بو کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کچرا پلاسٹک کے تھیلوں میں بند ہوتا ہے اور روزانہ اٹھالیا جاتا ہے۔ لاری کے ذریعہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو ریتی منتقل کرنی ہو تو ریتی کو مکمل طور پر دبیز پلاسٹک سے ڈھانک دیا جاتا ہے۔ مکہ روڈ پر دنیا کا سب سے بڑا پٹرول پمپ ہے۔ پٹرول پمپ کے قریب جا کر ہم نے وہاں نصب شدہ پمپس کی تعداد پوچھی، ڈیوٹی پر متعینہ شخص نے گن کر بتایا کہ پہلے ۱۹۲ تھے اب ۱۴۲ ہیں۔ میں نے جدہ کو روشنی کا شہر کہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سارا شہر روشنی سے جگ مگ کرتا ہے۔

پٹرول پمپس اور دکانوں میں لاتعداد ٹیوب لائٹس لگی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جگہ جگہ بہت ہی شاندار شادی خانے آباد ہیں۔ دکانیں اور ہوٹلیں رات دیر گئے تک کھلی رہتی ہیں۔ ہوٹلوں میں ہر قسم کا کھانا دستیاب ہے۔ روٹی کی ۲۷ اقسام ہیں۔ جدہ کے شاپنگ سنٹر بہت شاندار ہیں۔ لاکھوں، کروڑوں روپیوں کا سامان سجا ہوا رکھا ہوتا ہے۔ الکٹرانک اشیاء کے علاوہ کپڑے، چائنا کے برتن، ڈنر سیٹ، ٹی سیٹ، چھوٹے بڑے گلدان، خوبصورت ٹیبل لیمپ اور سجاوٹ کی مختلف چیزیں، بس دیکھتے ہی رہ جایئے۔ اس قسم کی اشیاء کی بے شمار مارکٹیں ہیں، بعض صرف کروڑ پتی لوگوں کے لئے ہی مختص ہیں۔ دوسرے لوگ خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ شوکیس کے پاس ٹھہر کر ان اشیاء کو دیکھ لیتے ہیں۔ Gold Market بھی بے نظیر ہے۔ ایک مارکٹ میں زیورات کی کئی دکانیں ہیں۔ ہر قسم کے زیورات کا ہم نے بغور مشاہدہ کیا اور دکانداروں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ سونے کے تاج خصوصیت سے توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ ان میں سونے ہی کی خوبصورت

لڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ دلہنوں کا زیور ہے۔ تاج پہنا کر لڑیوں کو پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔ سونے کے وزنی کمر پٹے، قیمتی ہار، نکلس، ہر قسم کے کڑے، چوڑیاں، انگوٹھیاں، ایرنگ، بالیاں غرض کہ کئی اقسام کے زیوروں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ ہر محلے میں ترکاری کی چھوٹی بڑی دکانیں ہیں۔ بڑی مارکٹوں میں ہمہ اقسام کی ترکاریاں دیکھنے کو ملیں، بعض بھاجیاں ایسی ہیں جو ہندوستان میں نایاب ہیں۔ صاف ستھرے خانوں میں جمی ہوئی ترکاریاں دکانداروں کے ذوق جمال کی گواہی دیتی ہیں۔ شملہ مرچ پانچ رنگوں میں دستیاب ہے۔ ہری، سفید، زرد، آرنج اور سرخ۔ سعودی عرب سے آیا ہوا کوئی فرد اگر وہاں کے تربوز یا کسی اور میوے کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تازگی، سائز یا وزن کا ذکر کرتا تو حیدرآبادی اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ''کیا اس میں کچھ کمی نہیں ہوسکتی''؟ ہم نے جدہ کی ترکاری اور میوے کی مارکٹ کا جائزہ لیا تو انکشاف ہوا کہ واقعی وہاں کی ترکاریوں اور پھلوں وغیرہ کے سائز کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ پھلوں کی مارکٹس بھی قابل دید ہیں۔ دکانوں میں کئی اقسام کے خوش نما، خوشبودار اور رس بھرے میوے دستیاب ہیں۔ موز، انگور، پلم، جام، سیب، انار، بومالی، افندی، کیوی، کاکوا، سردا، تربوز، فرجل، اناس، چلی، خوبانی، ابوسرا جیسے پھل ہر بڑی مارکٹ میں ملتے ہیں۔ فصل پر آم اور **Peeches** بھی مل جاتے ہیں۔ سیب کی کئی اقسام ہیں۔ واشنگٹن کا سیب کالا ہوتا ہے۔ ایران سے آیا ہوا چھوٹا، ہرا سیب بھی انتہائی لذیز ہوتا ہے۔ چپل، سینڈ جیسے کانٹوں بھرا ایک پھل ہم نے دیکھا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ اس کانٹے دار پھل کو دستانے پہن کر چھیلا جاتا ہے ورنہ ذراسی لاپروائی سے ہاتھ متاثر ہوسکتے ہیں۔ اس کی شکل جام جیسی تھی۔

جدہ میں ہم نے وسیع وعریض **Nursaries** دیکھیں۔ خوش پوشاک اور باغبانی سے واقف افراد ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اکثر پودے چونکہ بہت نازک ہوتے ہیں اور گرمی برداشت نہیں کرسکتے، اس لئے نرسری ایرکنڈیشنڈ ہوتی ہے۔ دس ریال سے لے کر

پچاس ریال اور اس سے زیادہ قیمت کے پودے دستیاب ہیں۔ دکانوں میں ہمیشہ چہل پہل نظر آتی ہے۔ لیکن خاص بات یہ کہ اذاں ہوتے ہی آن کی آن میں تمام دکانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ شاپنگ سنٹرس کے شیٹرس گرانے کی ایک ساتھ آوازیں آتی ہیں۔ بعض دکانوں پر صرف پردے لگا دیئے جاتے ہیں۔ دکاندار، خریدار سبھی مسجد کا رخ کرتے ہیں۔ تقریباً ہر بڑے شاپنگ سنٹر میں ایک مسجد ہے۔ خواتین کے لئے علحدہ انتظام ہوتا ہے۔ وہ دکانوں سے تیزی سے نکل کر جائے نمازوں کے پاس آجاتی ہیں۔ دو تین ماہ سے لے کر تین چار سال کی عمر کے بھی بچے ساتھ ہوں تو انہیں جائے نماز پر لٹا لیتی ہیں یا بٹھا دیتی ہیں۔ چھوٹے بچے چونکہ اکثر ان کے ساتھ ہوتے ہیں اس لیے انہیں خاموش رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ کبھی ان کے رونے کی مسلسل آوازیں بھی آتی ہیں لیکن نماز میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ جوں ہی نماز ختم ہوتی ہے خواتین و حضرات دکانوں کی طرف چل پڑتے ہیں۔ پھر وہی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔

سعودی عرب میں ہونے والے جرائم اور ان کی سزا کی نوعیت کی تفصیل اخبار سے وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی۔ سر قلم ہوتے، صرف پڑھا اور سنا تھا ایک دن میرے داماد افتخار آئے اور کہا ممان جلدی چلئے آپ قِصاص ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں نا؟ بس پانچ منٹ میں چلئے ورنہ جگہ نہیں ملتی۔ ٹریفک بھی بڑھ جاتی ہے، اپنے شوہر اور بیٹی کو اطلاع دیئے بغیر گھر سے چل پڑے، چھ سات منٹ میں وہاں پہنچ گئے، لوگ جوق در جوق آرہے تھے، بہت بڑا امیدان تھا۔ اطراف لوہے کی جالیاں لگی تھیں۔ پھاٹک پر پہرہ دار متعین تھے۔ قریب ہی جگہ مل گئی، دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار لوگ جمع ہوگئے۔ کچھ دیر بعد قریب سے ایک آواز آئی، السلام علیکم، افتخار نے سلام کا جواب دیا۔ ایک صاحب مخاطب ہو کر کچھ اس طرح کی باتیں کرنے لگے جیسے ہمیں مرنے کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ ہمارے دل سے موت کا خوف نکال رہے ہوں۔ موت کا تو ایک وقت متعین ہے ہمت سے کام لینا چاہیئے، دنیا فانی ہے سب کو خدا کے پاس جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دنیا کی ناپائیداری کے سلسلے میں انہوں نے آیات قرآنی کا حوالہ بھی دیا۔ بہر حال

تھوڑی دیر بعد چہل پہل کچھ اور بڑھ گئی۔ بند گاڑیاں میدان میں آگئیں۔ ایک طرف پولیس والوں کے ساتھ جج بھی بیٹھے تھے۔ بیچوں بیچ ایک بڑا چبوترہ تھا اس کے قریب گاڑیاں روک دی گئیں۔ جائے نمازیں، بچھنی شروع ہوئیں، ایک دو تین چار پانچ جی ہاں، پانچ جائے نمازیں، معلوم ہوا کہ پانچ لوگوں کو سزائے موت دی جانے والی ہے۔ گاڑیوں کے دروازے یکے بعد دیگرے کھولے گئے۔ ملزم چبوترے پر لائے گئے۔ ایک عورت اور چار مرد تھے۔ آنکھوں پر پٹی، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے، بالکل بے حس لگ رہے تھے۔ ہم نے پوچھا، یہ لوگ کچھ گڑبڑ نہیں کرتے؟ جواب ملا نہیں شائد غنودگی طاری کرنے کچھ دوا دے دی جاتی ہے، سہارا دے کر جائے نمازوں پر بٹھا دیا گیا۔ گردن کے پاس سے ان کے شرٹس کو نیچے کر دیا گیا۔ ان کے نام معہ ولدیت لاوڈ اسپیکر پر سنائے گئے۔ اب جلاد بھی چبوترے پر آ چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک گردن پر تلوار چلی، سر جسم سے علحٰدہ ہو کر تقریباً ایک گز فاصلے پر جا گرا، ہماری زبان سے نکلا، انا للہ وان الیہ راجعون، پھر دوسرا سر، تیسرا سر اور چوتھا سر۔ ہاں! ایک سر ایسا تھا جو ایک وار میں علحٰدہ نہیں ہوا، اسے بعد میں دوسرے وار میں علحٰدہ کیا گیا۔ عورت کو سزائے موت دینے کی نوعیت مختلف تھی اسے گولی ماری گئی۔ رنج و تاسف اور عبرت کے ملے جلے تاثرات لئے ہم گھر واپس آئے۔ بعد میں افتخار نے کہا خاندان اور جان پہچان والوں میں آپ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا۔

جدہ پہنچنے کے دو دن بعد ہی جناب ایوب علی خاں مینیجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ نے ہمارے پہنچنے کی اطلاع سعودی گزٹ میں شائع کروادی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے جناب مصلح الدین سعدی کی صدارت میں ایک شاندار محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں جناب بیکس نواز، اعتماد صدیقی کے علاوہ دوسرے کئی ممتاز شاعروں نے اپنے بلند پایہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اُردو نیوز میں بھی ہمارے جدہ پہنچنے اور مختلف انجمنوں کی جانب سے خیر مقدم کی خبر شائع ہوئی۔ شاگرد رشید عارف قریشی نے بزم عثمانیہ جدہ کے زیر اہتمام نثر و نظم کی ایک شاندار

محفل سجائی ۔ یہ محفل جدہ کی منفرد لب و لہجے کی شاعرہ منور النسا منور کے گھر پر منعقد ہوئی تھی ۔ پر تکلف عشائیہ کا بھی اہتمام تھا۔

جدہ میں ہمارا قیام صرف تین ہفتوں کا تھا۔اس مختصر سے عرصہ میں ہمارے بیٹی داماد عفت اور افتخار، نواسیوں سارہ اور حمیرا، بہن بھائیوں، دوست احباب اور مختلف انجمنوں سے وابستہ شاعروں، ادیبوں اور شاگرد عارف قریشی نے بے پناہ خلوص ومحبت کا اظہار کیا۔ہم نے سب کو صحت وسلامتی کی دعا دی۔ ڈھیر سارے تحفے اور کبھی نہ بھلائی جانے والی یادیں لیے ہم اپنے شوہر سید رحیم الدین توفیق کے ہمراہ حیدر آباد واپس ہوئے۔

○ ○ ○

شیشے کا شہر دوبئی

۹/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو Emirates کے ذریعہ میں اپنے بیٹے سید فہیم الدین کے پاس دوبئی پہنچی۔ حیدرآباد سے فلائٹ دس بج کر بیس منٹ پر تھی۔ تین گھنٹے کا سفر تھا۔ دوبئی پہنچنے پر گھڑی کو دیڑھ گھنٹہ پیچھے کرنا ہوتا ہے۔ دوبئی ایرپورٹ کا رقبہ بہت وسیع ہے وہاں پہنچنے کے بعد ضروری کاغذات کی تکمیل کے لیے مجھے سہولت پہنچانے کی خاطر فہیم نے مرحبا نامی ایجنسی سے ربط پیدا کیا۔ اس سے بڑی سہولت ہوئی۔ قطار میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زرد کوٹ پہنے ایک خاتون میرے نام کی تختی لیے ایرپورٹ پر منتظر تھی۔ وہ مجھے ساتھ لیے تیز قدمی سے آگے بڑھنے لگی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد چار نشستی گاڑی سے استفادہ کیا اور وہاں پہنچ گئے جہاں فہیم کے علاوہ میری بہو آمنہ اور پوتی صدیعہ میرے منتظر تھے۔ تینوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اطمینان قلب میسر ہوا۔ خصوصاً صدیعہ سے ملنے میں بے چین تھی اور مجھ سے زیادہ وہ ایک ایک دن گن رہی تھی۔

دوبئی کا یہ پہلا سفر تھا۔ کار میں بیٹھے ہوئے میں نے دونوں جانب نظر دوڑائی۔ شیشے سے بنی ہمہ منزلہ عمارتیں بڑی دلکش ہیں۔ ہرے بھرے درخت، خوشنما پھولوں کی کیاریاں دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔ پودوں کو باقاعدگی سے پانی دیا جاتا ہے۔ 21st Century Tower بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ اس کی اونچائی (۲۶۹) میٹر ہے۔ ۵۵ منزلہ یہ ٹاور دنیا کا سب سے اونچا رہائشی ٹاور ہے۔ ۲۰۰۳ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔ موٹروں کی پارکنگ کے لیے اس سے متصل کئی منزلہ عمارت ہے۔ متحدہ امارات میں ایسی کئی عمارتیں ہیں۔ اوپری منزل تک موٹر کی پارکنگ کی جاسکتی ہے اور گاڑی رکھنے کے بعد نیچے آنے کے لیے لفٹ کی سہولت ہے۔ مسابقت کی دوڑ میں دوبئی کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے پیچھے نہیں۔ یہاں کی شاندار عمارتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال ۲۰۰۶ء تک مکمل ہو جائے گا۔ اس میں ۱۶

ہزار موٹریں انڈر گراونڈ ٹھہرائی جاسکیں گی۔ مال کا جملہ رقبہ ۹ ملین مربع فٹ ہے۔ اس میں دنیا کی سب سے بڑی سونے کی مارکٹ ہوگی۔ اس کے برابر دنیا کا سب سے بڑا ٹاور بنے گا جو برج دوبئی کے نام سے موسوم ہوگا۔

بچوں کی دلچسپی کے لئے بے شمار تفریحی مقامات ہیں۔ Discovery Centre جائیں تو اندر ایک الگ ہی طلسماتی دنیا ہے۔ بس کھو کر رہ جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی اپنی تفریح کے مواقع ڈھونڈ لیتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بچوں کی خوشی دیکھ کر ماں باپ پھولے نہیں سماتے، کچھ دیر کے لیے وہ بھی سکون محسوس کرتے ہیں۔ Discovery Centre جاتے ہوئے راستے میں امریکن یونیورسٹی آف شارجہ کے شاندار بورڈ پر نظر پڑی۔ چھٹی کا دن تھا۔ واچ مین کے علاوہ پولیس کے جوان متعین تھے۔ ان سے اجازت لے کر ہم اندر گئے۔ وسیع رقبے پر مختلف شعبوں کے لیے علٰحدہ علٰحدہ عمارتیں ہیں۔ عمدہ نقش و نگار قیمتی پتھر، ساری عمارتیں فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں ڈھونڈنے پر بھی کاغذ کا ایک پرزہ نظر نہ آیا۔

سڑکوں پر جدھر نظر دوڑائیں موٹریں ہی موٹریں ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک شاندار۔ تقریباً ہر فرد کے پاس موٹر ہے، ذاتی ہو یا کمپنی کی، اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ٹیکسی اور بسیں بھی چلتی ہیں۔ ایک ہی شہر میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جانا ہو تو ۵ درہم دینے ہوتے ہیں۔ استعمال شدہ موٹروں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ دکان کے سامنے صرف چند گاڑیاں رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ باقی سامنے سڑکوں پر ٹھیری ہوتی ہیں۔ دولت مند لوگ اچھی خاصی موٹر فروخت کرکے نیا ماڈل خرید لیتے ہیں۔ نتیجتاً بے شمار، بہت اچھی حالت والی موٹریں used car کا لیبل لیے سڑک پر آجاتی ہیں۔ ان کے خریدار بھی بہت ہیں۔

UAE (United Arab Emirates) کے سات اسٹیٹ ہیں۔ ابوظہبی، دوبئی، شارجہ، اجمان، راس الخیمہ، فجیرہ اور ام القوین۔ ابوظہبی دارالحکومت ہے، یہاں تیل

کے کنویں ہیں۔ دوبئی بزنس کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ ایک اسٹیٹ میں رہتے ہوئے کئی لوگ ملازمت کے لیے روزانہ دوسری اسٹیٹ کو جاتے ہیں۔ ٹریفک کا مسئلہ بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ مخصوص اوقات میں آدھے گھنٹے کا فاصلہ طے کرنے کے لیے کبھی دو گھنٹے بھی لگ جاتے ہیں۔ عوام اس کے عادی ہیں۔ لوگ عموماً فلیٹس میں رہتے ہیں۔ ان کا مالک یہیں کا شہری ہے۔ عمارت کی صفائی اور دیگر اُمور کی نگرانی کے لیے ایک شخص مقرر ہے، جس کی رہائش کا انتظام اسی عمارت میں ہے۔ خودکار لفٹ ہیں اس لیے لفٹ مین کی ضرورت نہیں۔ فلیٹس میں کچرے کی نکاسی کا معقول انتظام ہے۔ ہر منزل پر ایک مخصوص جگہ ہے۔ بٹن دباتے ہی باکس کھل جاتا ہے اور اس میں ڈالا ہوا کچرا عمارت کی نچلی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

U.A.E کی آبادی کا صرف بیس فیصد حصہ مقامی افراد پر مشتمل ہے، باقی ۸۰ فیصد دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ہندوستان' پاکستان کے علاوہ امریکہ، کناڈا، جاپان، جارڈن، فلسطین، بنگلہ دیش، فلپائن اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے لوگ ملازمتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی آبادی حکومت کے لیے دردسر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ جاہلوں اور کاہلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا حل تو کسی کے پاس نہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے لیے ترغیب دی جاتی ہے کہ آپریشن کے فوری بعد ایک مقررہ رقم اس خاندان کو دی جائے گی۔ متحدہ عرب امارات میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں تو آبادی کو بڑھانا ہے۔ اس لیے بچے کی پیدائش کے بعد ہی تین سو درہم وظیفہ جاری کیا جاتا ہے۔ دیگر سہولتیں الگ ہیں۔ اسی ترغیب سے متاثر ہوکر یہاں کے ایک بہادر مرد نے مختلف بیویوں سے (۶۰) بچے پیدا کر کے ریکارڈ قائم کیا اسے گراں قدر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ہندوستان میں اگر یہ سہولت دی گئی تو بیشتر لوگ سب کام چھوڑ کر اسی میں لگ جائیں گے۔ ہر نیا آنے والا مہمان حکومت سے وظیفہ لے کر باپ کو بے فکر کردے گا۔ عیاشی کے مزید مواقع فراہم کرے گا۔

دوبئی، شارجہ، اجمان میں مختلف جگہوں کی سیر کی، ہمہ منزلہ عمارتیں قابل دید ہیں۔ ہر عمارت میں نیچے دکانیں اور اوپری منزلوں میں دفاتر ہیں۔ ساری عمارتیں شیشے سے بنی ہیں۔ مختلف ڈیزائن والی یہ اونچی عمارتیں باہر سے آنے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ دوبئی کی سب سے اونچی عمارت (۷۵) منزلہ ہے۔ جہاز نما ایک ہوٹل ہے، اندر جا کر صرف دیکھنے کے لیے دوسو درہم دینے ہوتے ہیں۔ شاپنگ سنٹرس بہت شاندار ہیں، ہر قسم کے سامان کی دکانیں ہیں۔ سوپر مارکٹ ہر محلے میں ہے۔ ہائپر مارکٹس میں ایک ہی چھت تلے دنیا بھر کا سامان مل جاتا ہے۔ اتنی بڑی مارکٹس ہیں کہ وقت واحد میں پوری مارکٹ صرف دیکھنے کے لیے وقت ناکافی ہوتا ہے۔ میوے اور ترکاریاں بڑی نفاست سے خانوں میں جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض ہائی بریڈ ترکاریاں سائز میں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ سننے والے یقین نہیں کرتے۔ ہر میوے پر مقام کی مناسبت سے اسٹکر لگا ہوتا ہے۔ موز، انگور، جام، چیکو، انار، اناس، موسمی، سنترہ، گریپ فروٹ، خربوزہ، تربوز، سیب، کچی خوبانی کثرت سے بازار میں دستیاب ہیں۔ سیتا پھل کہیں کہیں نظر آئے لیکن لذیذ نہیں تھے۔ تقریباً تمام میوے تول کر فروخت کئے جاتے ہیں۔ ترکاریاں اور میوے چونکہ دنیا کے مختلف مقامات سے آتے ہیں۔ اس لیے سال بھر ہر چیز دستیاب رہتی ہے۔ افریقہ، آسٹریلیا، ایران، چائنا، کوریا، ہندوستان غرض کہ مختلف مقامات سے میوے اور ترکاریاں منگوائی جاتی ہیں۔ حیدرآباد میں جتنی ترکاریاں دستیاب ہیں ان کے علاوہ کچھ نئی قسم کی بھاجیاں اور ترکاریاں نظر آئیں۔ بیگنی رنگ کا پتا گوبھی ایران سے آتا ہے۔ ہالینڈ سے آنے والی سفید پیاز بہت بڑی، ایک پیاز کا وزن تین پاؤ بھی ہوتا ہے۔

بعض لڑکیوں کی عرفیت بے بی، بڑھاپے تک چلتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بے بی نانی کہلانے لگتی ہیں۔ لیکن دوبئی میں ہم نے بعض میوے اور ترکاریاں دیکھیں جو واقعی بے بی کہلائے جاتے ہیں۔ Baby onion، Baby Potato، Baby tomato اور Baby pine apple وغیرہ بڑوں سے بالکل الگ تھلگ، چھوٹے، معصوم سی کے لینے میں

نہ دینے میں ابڑے دلکش لگتے ہیں یہ!

تقریباً ہر بڑے شاپنگ سنٹر میں خواتین کے لیے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا معقول انتظام ہے۔ صاف ستھرے ٹائلٹ، نماز کے لیے بڑا ہال جس میں کارپٹ بچھے ہوئے، ایک جانب اوڑھنیاں اور چند کرسیاں رکھی ہوتی ہیں۔ قرآن مجید بھی رکھے ہوتے ہیں۔ ایک شاپنگ سنٹر کے کمرۂ نماز سے نکل کر ہم نے دیکھا کہ بازو والے آئینہ لگے کمرے میں ایک خاتون اپنے بال درست کر رہی تھیں۔ تازہ دم ہونا چاہتی تھیں۔ خاصی فیشن زدہ تھیں۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ ایسی ماڈرن عورتیں نمازی بھی ہوسکتی ہیں۔ پتہ چلا کہ وہ نماز پڑھنے نہیں، میک اپ کرنے آگئی تھیں۔ وہاں صفائی کے لئے متعین خاتون نے جو اردو، انگریزی اور عربی جانتی تھی۔ اسے سمجھایا کہ یہ جگہ صرف نمازیوں کے لیے ہے۔ سیاحوں کے لیے دوسرا کمرہ ہے۔ انتظامیہ والے دیکھیں گے تو سرزنش کریں گے۔ اس نے معافی مانگی کہنے لگی میں ابوظہبی سے آئی ہوں مجھے پتہ نہ تھا۔

شارجہ میں ایک درہم دو درہم والی بڑی دکانیں دیکھیں۔ ان میں مقررہ قیمتوں پر کئی چیزیں دستیاب ہیں۔ اسی طرح بعض دکانیں پانچ، دس اور بیس درہم والی ہیں۔ بچوں کے کپڑے، کھلونے، کانچ، پلاسٹک کے برتن، مصنوعی پھل، پھول، ترکاریاں، اسٹیشنری، دیگر آرائشی سامان دستیاب ہے۔ ان دکانوں میں ہمیشہ لوگ خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے مختلف قسم کی اشیاء مل جاتی ہیں۔

ماہ رمضان میں مسجدوں کی رونق قابل دید ہوتی ہے۔ بڑی مسجدوں میں افطار کے خاص اہتمام کی وجہ سے چہل پہل کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ مقامی باشندوں کی جانب سے افطار اور کھانے کا بہترین انتظام کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشقابوں میں دم کی مچھلی، بریانی اور ہمہ اقسام کے لذیذ کھانے، روزہ داروں کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ کھجور، میوے اور طرح طرح کے مشروب بھی ہوتے ہیں۔ یہاں روزہ کھولنے کے فوائد جاننے والے ہی جانتے ہیں،

شارجہ میں کئی لوگ روزانہ اپنے اراکین خاندان کے ساتھ سمندر کے کنارے تفریح کے لیے آتے ہیں۔ کھانے پینے کی مختلف اشیاء اور کسی کے ساتھ فولڈنگ میز اور کرسیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کو دیکھا، میاں تیرنے میں مصروف تھے' سمندر کے کنارے جہاں پانی کم تھا، بیوی کرسی ڈالے بیٹھ گئیں۔ دو بچے ساتھ تھے۔ ایک دو سال کا دوسرا بہ مشکل دس ماہ کا۔ اس خاتون نے تھوڑی دیر کے لیے دونوں بچوں کو پانی میں بٹھا دیا۔ دیکھنے والوں کو خوف لگ رہا تھا کہ اتنے کم عمر بچوں کو علحدہ چھوڑ دیا گیا۔ اس نے دونوں پر خوب پانی ڈالا۔ پھر ایک کو کنارے چھوڑ کر دوسرے کو ساتھ لے آئی۔ بدن صاف کر کے کپڑے پہنا کر بڑے بچے کو لانے کے لیے اُسے وہیں بٹھا دیا۔ معصوم بچہ بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ ایسے لگتا تھا کہ اسے عادت سی ہوگئی ہے۔ سمندر کے کنارے بہت ہی دلچسپ نظارے دیکھنے کو ملے۔ ایک خاتون تیز تیز چہل قدمی کر رہی تھی۔ بالکل نئے فیشن کا لباس، جینس، ٹی شرٹ پہنی، نوجوان لگتی تھی۔ قریب آئی تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ستر اور پچھتر کے درمیان تھی۔ چیونگم چباتی ہوئی سامنے سے گزر گئی۔ اپنی اور دوسروں کی صحت بنائے رکھنے اور تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے ایسی کئی خواتین مختلف قسم کے دیدہ زیب لباس پہنے روزانہ ٹہلنے آتی ہیں۔

دوبئی میں الکٹرانک اشیاء سستی ہیں۔ کھانے پینے کی اعلیٰ معیاری اشیاء کثرت سے دستیاب ہیں۔ البتہ گھر، بچوں کی تعلیم اور ڈاکٹر مہنگے ہیں۔ بعض لالچی مائیں درہم کو روپے میں بدل کر حساب لگا لیتی ہیں کہ ۵ ہزار درہم کا مطلب یہ کہ ان کا بیٹا ۷۵ ہزار روپے کما رہا ہے۔ خود مکتفی ہونے کے باوجود وہ امید لگائے بیٹھتی ہیں کہ کم از کم پانچ، دس ہزار روپے تو انہیں جیب خرچ کے لئے بھیج سکتا ہے۔ وہ نہیں سوچتیں کہ ان کا لختِ جگر بیرون ملک میں رہ کر وہیں کی کرنسی میں کرایہ مکان، علاج، بچوں کی تعلیم اور دیگر اخراجات کی تکمیل کر رہا ہے۔ مستقبل کے لیے بچت بھی کرنی ہے۔ ذاتی گھر بچوں کی شادی، سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کوئی پنشن ملنے والی نہیں ہوتی۔ جس کے بھروسے وہ ضعیفی میں بے فکری سے جی سکیں گے۔ وہاں رہتے ہوئے

انھیں مستقبل کے بارے میں تمام منصوبے بنا لینے ہوتے ہیں۔

دوبئی میں تین ماہ قیام کے دوران بہو، بیٹے اور پوتی نے ہر طرح میرا خیال رکھا۔ ۷؍ ڈسمبر کو میرے پوتے فیصل نے اس دنیا میں آ کر خوشیوں کو دوبالا کیا۔ ان سب کے لیے دعا ہے کہ خوش رہیں، آباد رہیں۔

○ ○ ○

حوصلہ افزائیاں

(تصانیف پر آرا، تبصرے)

دکنی زبان کی قواعد:

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد:

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اب تک کسی نے اس اہم اور مشکل موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کا یہ تحقیقی کارنامہ ساری اردو دنیا کے شکریہ کا مستحق ہے۔

میر حسن:

دکنی زبان کی صرفی اور نحوی خصوصیات اور اردو سے دکنی کے اختلافات پر ڈاکٹر حبیب ضیاء نے پہلی بار علمی اور ماہرانہ انداز میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، انھوں نے دکنی زبان کی قواعد مرتب کر کے زبان کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

اس وقت تک جتنا اس کتاب کو پڑھا ہے اس سے بڑا جی خوش ہوا، ہر جگہ حوالے اور مثالیں ہیں۔ انداز اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ ان کے مطالب کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ اس میدان میں آپ کی حیثیت پیش روکی ہے۔ پیش رو کے یہاں خامیاں بھی ہو سکتی ہیں، مگر مجھے ایسی کوئی بات نہیں ملی جو پایہ اعتبار سے ساقط ہو۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن:

نہایت عمدہ تحقیق ہے ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، اس موضوع پر یہ پہلی مکمل کتاب ہے۔

پروفیسر نور الحسن ہاشمی:

اس کی ترتیب میں یقیناً مصنفہ نے بڑی محنت صرف کی ہے اور ہر لحاظ سے اسے دکنی زبان کی جامع قواعد بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ مصنفہ کی یہ کتاب ضرور قابل قدر سمجھی جائے گی۔

بدر شکیب:

دکھنیات پر جامعہ عثمانیہ میں جو کام ہوا ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ زیر نظر کتاب نہ صرف دکنی زبان کی قواعد، اس کی ساخت اور لسانی نزاکتوں کے سمجھنے ہی میں مدد دے گی بلکہ اس کے مفاہیم اور مطالب بھی اس سے آسانی سے معلوم ہو سکیں گے۔ مصنفہ کی محنت قابلِ قدر ہے۔

سید اکرم حسین ترمذی:

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی اہم تالیف دکنی زبان کی صرف ونحو اور اصول قواعد کا اولین سرمایہ ہے۔ اس کے بعد اب تک بھی کسی ماہر دکنیات نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے۔ اس لئے اس تالیف کی اہمیت، انفرادیت اور افادیت ہنوز مسلم ہے۔ اور آئندہ بھی اولیت کی بنا پر اس کا مقام باقی رہے گا۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد، حیات اور ادبی خدمات

پروفیسر نورالحسن ہاشمی:

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مقالہ آپ نے بڑی محنت سے تحریر کیا ہے اور حشو و زوائد کو نظر انداز کر کے صرف کام کی باتوں سے کام رکھا ہے اور مہاراجہ کی تصانیف کو مختلف جگہوں سے حاصل کر کے ان پر بے لاگ تبصرہ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مہاراجہ کے متعلق ایسی جامع کتاب اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

طنز و مزاح:

یوسف ناظم:

آپ کی تازہ تصنیف جو مژگاں اٹھایئے موصول ہوئی۔ میں نے حسب عنوان اس پر عمل کیا۔ لیکن میں کیا اور میری مژگاں کیا۔ بہر حال آپ کی کتاب کے مطالعہ نے مجھے گھر بیٹھے حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی سیر کرادی۔ آپ کی کراچی والی عظیم الشان دعوت کا بھی بزور حافظ آموختہ ہوگیا۔ حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب نے آپ کے مشاہدے کی داد دینے پر اُکسایا، دعوت میزبان اور ہم پتہ نہیں کتنوں کے لئے آئینہ ہے۔ آپ کی دیرینہ شائستگی ہر ورق پر بکھری ہوئی ہے۔ آپ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جن کے رفیقِ حیات نے آپ کے نقش قلم پر لبیک کہہ کر آپ کا ساتھ دیا ہے۔ میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ طویل مضامین سے مزاح متاثر ہو جاتا ہے۔ آپ نے اختصار کو پر مزاح بنانے اور مزاح کو معقول حد میں رکھنے اور اسے سلیقے سے برتنے کا حق ادا کر دیا۔ ظرافت کے یہ دو لقمے پورے دسترخوان کی جان ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین:

آپ کی کتاب جو مڑ گاں اٹھائیے کا نسخہ ملا۔ آپ کے علمی و ادبی کارناموں کا پہلے سے معترف ہوں۔ نہ صرف آپ کی پچھلی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھ چکا ہوں بلکہ آپ کی تحقیقی کتابوں، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد اور شاد و نیاز کو بھی اسی ذوق سے پڑھا ہے۔ بہت عرصہ پہلے جب آپ نے زندہ دلان حیدرآباد کے ایک ادبی اجلاس میں اپنا مضمون ''بچہ باہر گیا ہے'' سنایا تھا تو تب بھی میں ادبی اجلاس میں موجود تھا اور آپ کے مضمون سے بے حد لطف اندوز ہوا تھا۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح اُردو طنز و مزاح کو مالا مال کرتی رہیں۔ اب تو رحیم الدین توفیق صاحب بھی اس سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔

سلیمان اطہر جاوید:

پرسوں (واقعی پرسوں) آپ نے اپنی کتاب جو مڑ گاں اٹھائیے عنایت کی اور کچھ ایسا ہوا کہ کل اس کے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ خوشی ہوئی کہ اب آپ کی تحریروں میں حقیقت پسندی در آرہی ہے۔ کس کس مضمون کا ذکر کروں۔ کئی مضامین میں یہ کیفیت ہے۔ اس حقیقت پسندی نے مزاح کو نکھار دیا اور طنز کو کاری بنا دیا ہے۔

برق آشیانوی:

مصنفہ کی تحریروں کی اہم خصوصیت بے ساختگی ہے۔ وہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتیں بلکہ جملے ان کے ذہن سے سکوں کی طرح ڈھل کر نکلتے ہیں لیکن ایک سکہ بھی کھوٹا نہیں ہوتا۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ:

مزاح نگاری کے لئے چیتے کے جگر اور شاہین کے تجسس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح دراصل دودھاری تلوار ہے جو مسرت بھی بخشتا ہے اور بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ کہیں زخم جگر کے ٹانکے ہنسی ہنسی میں ٹوٹتے ہیں۔ مزاح نگار سماج کی ناہمواریوں، بنی نوعِ انسان

کی کمزوریوں کو جس لطیف انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ ناصح، مشفق یا رہنمائے قوم کے بس کا روگ نہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء تلوار کی اس کاٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے بڑے لطیف پیرائے میں سماج اور فرد دونوں کی فروگذاشتوں کا احاطہ کیا ہے۔

پروفیسر بدیع حسینی:

ڈاکٹر حبیب ضیاء بظاہر خاموش اور غیر ضروری طور پر سنجیدہ نظر آتی ہیں، لیکن ان کی کم گوئی اور کم سخنی خیالات کی کم مائیگی نہیں بلکہ یہ نظر احتیاط ہے اور یہ احتیاط ان کے مضامین میں بھی ملتی ہے۔ اس لئے نہ تو ان کے مزاح میں پھلجھڑیوں کی سی کیفیت ہے نہ طنز میں وہ کاٹ کہ آدمی تلملا اُٹھے۔ بس ایک تبسم زیرِ لب، اک ہلکی سی کسک اور یہی اچھے طنز و مزاح کی خصوصیت ہے۔ سلیقۂ اظہار، شائستگیٔ اسلوب اور لہجہ کی شگفتگی یہ رہیں دوسری خصوصیات۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال:

ڈاکٹر حبیب ضیاء چور دروازے سے مزاح کے میدان میں آئیں۔ حبیب توفیق کے نام کا برقع اوڑھے۔ جیسے انھیں خوف ہو کہ کسی محقق کا مزاح لکھنا اس کے مرتبے کے منافی ہے۔ لیکن جب پردہ ترک کیا اور زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریب میں برسرِ عام مضمون پڑھا تو داد و تحسین کی بارش نے ان کے دل سے اس خیال کو دھو دیا اور آج وہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنے نام کی طرح مردانہ وار آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ رواں، شستہ، تیکھی زبان، گدگداتے مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر، موضوعات میں تنوع، ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر کے خاص وصف ہیں۔

صلاح الدین نیر:

پروفیسر حبیب ضیاء طنز و مزاح کی صفِ اول کی ادیبہ ہیں۔ ان کی شگفتہ و شستہ مزاحیہ تحریریں اور ان کا طنز آمیز لب و لہجہ قاری و سامع کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ ان کی

زبان، اندازِ بیان اور ان کا اسلوب مستند و نامور طنز و مزاح نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔

شاغل ادیب:

ڈاکٹر حبیب ضیاء ایک شریف النفس، نیک سیرت اور بلند کردار مثالی خاتون ہیں۔ مشرقی ادب آداب کی بچی ''حبیب'' ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کی جگمگاتی ''ضیا'' ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء دنیائے ادب میں طنز و مزاح کے لئے اپنے نام کی مناسبت سے نہ صرف عشق حبیبانہ لئے ہوئے رواں دواں ہیں بلکہ اپنے کمال و ہنر کی ضیاء سے اُردو زبان و ادب کو خوب روشنا بھی رہی ہیں۔

فاطمہ عالم علی:

اب تو حبیب ضیاء کی مزاح نگاری کو شہرت کے پر نکل آئے ہیں۔ خواتین ان پر فخر کرتی ہیں۔ حبیب ضیاء لکھنے کا سامان معاشرے سے فراہم کرتی ہیں۔ جب معاشرے کی بے راہ روی سے ان کا خون کھولتا ہے تو قلم کا سہارا لیتی ہیں اور دل کا غبار ایسے نکالتی ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے .... حبیب ضیاء کی نئی کتاب کا نام'' جو مژگاں اٹھائیے'' بظاہر بہت گاڑھا ہے لیکن کتاب کے اندر کا مواد کافی سیال ہے۔ آنکھوں کے ذریعہ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے اور اتنا لطف آتا ہے کہ کئی بار پڑھا جاسکتا ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع:

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے مضامین عموماً عورتوں کے روزمرہ کے مسائل، تلخ حقیقتوں اور نفسیاتی کمزوریوں سے متعلق ہیں۔ وہ کہیں کھل کر ہنسنے دیتی ہیں نہ طنز کے نشتر چبھوتی ہیں کہ قاری تڑپ اُٹھے۔ نہایت سنجیدگی سے ظرافت کا وار کرجاتی ہیں اور بہت ہی نرم لہجے میں کمزوریوں، خامیوں اور غلطیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور یہ ایک اچھے مزاح نگار کی علامت ہے۔

مصطفیٰ شروانی:

آج کے مادی اور سائنسی دور میں اُردو نثر و ادب میں طنز و مزاح کا عنصر نہ ہونے کے

برابر ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، پطرس بخاری جیسے ظرافت نگار اب چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی بمشکل نظر آئیں گے۔ اس لئے آپ کی دلچسپ تصنیف ''گویم مشکل'' بڑی حد تک اس خلاء کو پُر کرنے میں معاون ہے۔ اُمید بندھتی ہے کہ آپ ایسی ہی تخلیقات کے ذریعہ اُردو زبان کے ایک اہم لیکن فی الحال تاریک گوشہ کو منور کرتی رہیں گی۔

فاطمہ تاج:

محفل خواتین کی سرگرم عمل رہنے والی یہ معزز خاتون محفل خواتین کی صدر بھی ہیں۔ اس کے باوجود ہنستی زیادہ کہتی کم ہیں لیکن جب اپنا مزاحیہ مضمون پڑھتی ہیں تو خود تو مقام کلام سے ہٹتی نہیں ستون کی طرح جمی رہتی ہیں اور اہل محفل فرش یا کرسیوں پر قہقہے لگاتے، پہلو بدلتے' جگہ سے بے جگہ ہوتے ہوئے ان کے مضامین سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید:

صاحبِ طنز و مزاح کا خیر مقدم کیجئے!!
آج کے ماحول میں لب خند بھی
کس قدر مشکل سے ہوتا ہے نصیب!
کشمکش، بے چینیاں، بے کیفیاں
زندگی کے ساتھ ہیں ہر ہر قدم
آج کے انسان کے ماتھے پہ بل ہیں کس قدر!
مسکرانا، دل لبھانا تلخیوں کی بھیڑ میں
خدمتِ انسانیت ہے اور ضیاء کا شاہکار!!
دل نشیں انشائیے ان کے ہیں کیا باغ و بہار!!

ان میں ہے ذہنی تھکاوٹ کا علاج
دل لگی، تنقید اور دل کی لگی کا امتزاج
ان کی تحریروں میں ہے گویا طلسماتی اثر!!
صاحبِ طنز و مزاح کا خیر مقدم کیجئے!
(ادارہ سوغات نظر کے زیر اہتمام منعقدہ تہنیتی جلسے میں پڑھی گئی)

ڈاکٹر صبیحہ نسرین:

خاتونِ شہر بزم سخن کی ضیاء ہے یہ
باغ دکن کی بُلبل شیریں نوا ہے یہ
تحریر میں ہیں طنز و مزاح کی لطافتیں
تقریر میں خطیبۂ سیمیں صدا ہے یہ
اہلِ قلم میں نام حبیب النساء رہے
کیوں کہ پسندِ خاطر اہلِ ولا ہے یہ
نسرینؔ خوش نصیب کا ایسا خیال ہے
سرو چمن کی قمریٔ نغمہ سرا ہے یہ

(ویمنس کالج میں منعقدہ وداعی جلسے میں پڑھی گئی)

○ ○ ○

محمد شہاب الدین ثاقبؔ:

ضیائے دانش کدہ

ڈاکٹر حبیب ضیاء

روشنی کا ایک پر تمکنت ہیولیٰ
جو قریب و دور دونوں زاویوں سے یکساں طور پر
مجسم علم و دانش ہے
جو ایک شفیق اُستاد اور سُلجھی ہوئی دانشور ہیں
جن کی تحریروں کا لفظ لفظ
اپنے تیکھے پن کے باعث سسکتی ہوئی اِنسانیت کا نبض شناس
بگڑتے ہوئے سماج کی نشتر قلم سے
جراحت کا مقدس فرض انجام دیتا ہے
خوش نصیب ہے وہ ماضی جس سے یہ وابستہ رہیں
مبارک ہے وہ حال جس سے یہ وابستہ ہو گئیں
سلام اس عظمت کو
سلام اس شفقت کو
سلام اس علمیت کو
جس کا نام ہے حبیب ضیاء

(اورینٹل اردو کالج میں منعقدہ وداعی جلسے میں پڑھی گئی)

○○○

پروفیسر مجید بیدار:

پروفیسر حبیب ضیاء نے مضمون نگاری نہیں کی بلکہ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کی نشتر زنی کی ہے۔ ان کی تمام تخلیقات میں معاشرے کی بے اعتدالیوں اور بے ضابطگیوں پر سلجھے ہوئے انداز میں طعنہ زنی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک طنز نگار یا تخلیق کار ہی نہیں بلکہ سماج و معاشرہ کی نباض بھی ہیں۔

سیّدہ مہر:

ڈاکٹر حبیب ضیاء ایک باوقار شخصیت کی مالکہ ہیں۔ متین، کم گو اور مخلص خاتون ہیں۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مزاحیہ مضمون پڑھتے وقت دلچسپ جملے، سلیس زبان میں اس طرح کہہ جاتی ہیں کہ گویا موتی پرو رہی ہوں۔ لفظوں کے ایسے پیکر تراشتی ہیں کہ سامعین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ ادھر یہ سنجیدہ چہرہ لئے کھڑی رہتی ہیں ایک ہلکے سے توقف کے بعد پھر وہی گل افشانیٔ گفتار شروع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح محفل کو قہقہہ زار بنا دینا ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر حمیرا جلیلی:

حبیب آپا ظاہراً جس طرح سیدھی سادی نظر آتی ہیں۔ ان کا باطن بھی اسی طرح پاک و شفاف ہے۔ تصنع اور بناوٹ انہیں بالکل پسند نہیں۔ میں جب بھی اپنی کلاس میں مختلف اشعار کی تشریح کرتے ہوئے اسی شعر پر پہنچتی ہوں۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے   وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے

ایک لحظہ کے لئے رک جاتی ہوں، حبیب آپا کی ساری شخصیت اُبھر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنے شاگردوں سے کہوں، اگر اس شعر کی بہترین تشریح چاہتے ہو تو جاؤ، پروفیسر حبیب ضیاء کو دیکھ آؤ۔

اطہری فضاء:

ادیب طنز وظرافت کی ہیں حبیب ضیاء
زبان رکھتی لطافت کی ہیں حبیب ضیاء
خاموش آنکھوں سے کہہ جاتی ہیں سبھی کچھ وہ
مثال علم ولیاقت کی ہیں حبیب ضیاء
سماج کے جواندھیروں کودور کرتی ہیں
خوشادہ شمع ہدایت ہیں حبیب ضیاء
بھلاسالگتا ہے طرزِ بیاں فضا ان کا
امین حسنِ شرافت کی ہیں حبیب ضیاء

یہ نظم ''جو مژگاں اٹھایئے'' کوایوارڈ ملنے کی مسرت میں محفلِ خواتین کے تہنیتی جلسے میں پڑھی گئی۔

(''حیدرآباد کی طنز ومزاح نگار خواتین'' پر نامور ناقدین کے تبصرے انشاءاللہ آئندہ کسی کتاب میں شائع کروں گی)

○○○

قارئین محترم!

تو یہ تھی ایک مزاح نگار کی داستانِ حیات، ایک خوددار اور حساس خاتون کی زندگی کی روئیداد۔ ماں باپ کی لاڈلی۔ بھائی بہنوں کی چہیتی، شوہر اور بچوں کو دل و جان سے چاہنے والی، ایسی خاتون جس نے گھر کو بکھرنے سے بچانے کے لئے اپنی زندگی کا بڑا حصہ داؤ پر لگا دیا۔ مائکے اور سسرال کے نازک رشتوں کو بخوبی نبھایا۔ ہر کسی کا اچھا ہی چاہا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس نے دین اور دنیا کی نعمتیں عطا کیں۔ امید سے زیادہ ہی نوازا۔ ہاتھ میں قلم تھما کر دنیا کے بکھیڑوں سے بے نیاز کر دیا۔ واقعی قلم میں بڑی طاقت ہے۔ میں عہد کرتی ہوں کہ ہمیشہ کی طرح اس کا صحیح استعمال کروں گی۔ فرد اور سماج کی برائیوں کو جڑ سے نکال پھینکنے میں آخری سانس تک لگی رہوں گی۔

○ ○ ○ ○

شجرۂ نسب مرزا ضیاء الدین بیگ (مادری)
حضرت سید شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی قدس سرہ
سید شاہ خلیل اللہ بت شکن
میر ضیاء الدین شاہ نور اللہ
سید شاہ بہا الدین محمد الحسینی
سید شاہ اسمٰعیل محمد الحسینی
سید شاہ نعمت اللہ محمد الحسینی
سید شاہ جعفری محمد الحسینی
سید شاہ ندیم اللہ حسینی
سید شاہ علی محمد الحسینی
سید شاہ عبداللہ محمد الحسینی
سید شاہ مرتضیٰ محمد الحسینی
سید شاہ ابراہیم محمد الحسینی
سید شاہ علی میر جانی حسینی
سید شاہ علی محب اللہ حسینی
سید شاہ علی میر جانی حسینی
سید شاہ محب اللہ حسینی
سید شاہ خلیل اللہ حسینی
سیدہ فاطمہ بیگم
(مرزا سرفراز بیگ)
سیدہ حسینی بیگم
(سید امجد حسین)
سیدہ زہرہ بیگم
(سید سجاد حسین)
سید عابد حسین
سیدہ کریم النساء بیگم
(حافظ محمد منیر الدین قادری)
محمد شمس الدین قادری
مرزا ضیا الدین بیگ
(فخر النساء بیگم)
مرزا اسد اللہ بیگ
سید زین العابدین
(عزیز النساء بیگم)
انور فاطمہ
(سید ہدایت اللہ)
لیاقت النساء
(محمد محسن احمد صدیقی)
معین فاطمہ
(محمد عبدالخالق)
شمس فاطمہ
(زاہد علی خاں)
مرزا شمس الدین بیگ
مرزا بدر الدین بیگ
مرزا ظہیر الدین بیگ
مرزا اصلاح الدین بیگ
مرزا رضی الدین بیگ
مرزا مجید الدین بیگ
مرزا رفیع الدین بیگ
زہرہ بیگم
حبیب ضیا
نور جہاں

شجرۂ نسب مرزا ضیاالدین بیگ
(پدری)

شجرۂ خاندان فخر النساء بیگم صاحبہ (مادری)
سردار غلام محی الدین خاں بارکزئی (وزیر افغانستان)
۱۔ سردار غلام یحییٰ خاں عرف سردار خاں
وفات ۲ ر رجب ۱۲۹۴ھ
۲۔ سردار غلام مصطفےٰ خاں
فوت قبل زمانۂ غدر (لاولد)
۳۔ سردار غلام مرتضیٰ خاں
زمانۂ غدر میں شہید ہوئے
الف۔ بہو بیگم عرف بہو جی
(یحییٰ خاں کی ماموں زاد بہن)
ب۔ ولائتی بیگم عرف نواب بیگم
(لکھنو)
ج۔ سلطان بیگم
نواب عنائت حسین خاں
(وزیر بھوپال)
الف۔ بدری بیگم عرف دلہن جان
ب۔ مصاحب بیگم عرف امیر دلہن
ج۔ عاشق بیگم
سخاوت حسین خان (نواب سخاوت یار جنگ)
اکبری بیگم
نور جہاں بیگم
عبدالمجید خاں
اقبال النساء بیگم
سید اشتیاق حسین
لڑکا
(فوت ۱۲ دن)
فخر النساء بیگم
مرزا ضیاالدین بیگ

شجرۂ خاندان فخر النساء بیگم صاحبہ (پدری)
سردار غلام محی الدین خاں بارکزئی (وزیر افغانستان)
۱۔ سردار غلام یحییٰ خاں عرف سردار خاں
وفات ۲ رجب ۱۲۹۴ھ
۲۔ سردار غلام مصطفےٰ خاں
فوت قبل زمانۂ غدر (لاولد)
۳۔ سردار غلام مرتضیٰ خاں
زمانۂ غدر میں شہید ہوئے
الف۔ بہو بیگم عرف بہوجی
(یحییٰ خاں کی ماموں زاد بہن)
ب۔ ولائتی بیگم عرف نواب بیگم
(لکھنو)
ج۔ سلطان بیگم
عبدالقادر خاں (وکیل حیدرآباد دکن)
فاخرہ بیگم
عبدالمجید خاں (نور جہاں بیگم)
عبدالحمید خاں (امۃ الحفیظ بیگم)
عزیز جہاں بیگم (فوت نابالغ)
امیر فاطمہ بیگم (سید برہان احمد)
اقبال النساء بیگم (سید اشتیاق حسین)
لڑکا (فوت ۱۲ دن)
فخر النساء بیگم (مرزا ضیاء الدین بیگ)
لڑکا
فوت شیرخوار
مرزا شمس الدین بیگ
صالحہ
مرزا بدر الدین بیگ
شاہدہ
مرزا فصیح الدین بیگ
زہرہ بیگم
سید وزیر علی
حبیب ضیاء
سید رحیم الدین توفیق
مرزا ظہیر الدین بیگ
صفیہ سلطانہ
مرزا اصلاح الدین بیگ
رخسانہ
مرزا ضیاء الدین بیگ ط
نور جہاں
غلام دستگیر
مرزا رضی الدین بیگ
ڈاکٹر نسرین
مرزا مجید الدین بیگ
قدسیہ سلطانہ
ابرار بیگ
مرزا رفیع الدین بیگ
ڈاکٹر افشاں نوری
ناصرہ شاہین
ذکی احمد
زید احمد
طاہرہ جبین
سائرہ بانو
ڈاکٹر مرزا نصیر الدین بیگ
مرزا نصیر الدین بیگ (سائرہ بانو)
مرزا بصیر بیگ آسکو (جاپانی)
مرزا کبیر بیگ
عائشہ بیگ
یوسف الدین بیگ
عظمیٰ
ڈاکٹر امجد علی
سلمیٰ
محمد عبدالقیوم خاں
ہما
شبیہ اکرام
فاروق
ثنا بیگ
کرن بیگ
محمود علی
بابا
اریبہ
علینا
ریان
عبدالواسع خان
مریم فاطمہ
حفصہ
عفت النساء
سید افتخار الدین
سید فہیم الدین
آمنہ کوثر
سارہ افتخار
حمیرا افتخار
صاحبزادہ میر عظمت علی خاں
عائشہ افتخار
صدیعہ فہیم
سید فیصل فہیم
شہلا بیگ
عقیل احمد علی
مرزا واجد بیگ
سامیہ
زینب
مریم
یوسف احمد علی

حبیب ضیاء، والدہ کے ساتھ (فائیل فوٹو)

حبیب ضیاء (فائیل فوٹو ۱۹۵۱ء)

حبیب ضیاء کے والدین فخر النساء بیگم اور مرزا ضیاء الدین بیگ

نواب عنائت حسین خاں (وزیر بھوپال)

بیگم نواب عنائت حسین خاں

حبیب ضیاء کا آبائی مکان (فائیل فوٹو)

حبیب ضیاء (فائیل فوٹو ۱۹۵۶ء)

حبیب ضیاء اور سید رحیم الدین توفیق (فائیل فوٹو، ۱۱/ اکٹوبر ۱۹۶۳ء)

عفت افتخار، بچیوں کے ساتھ
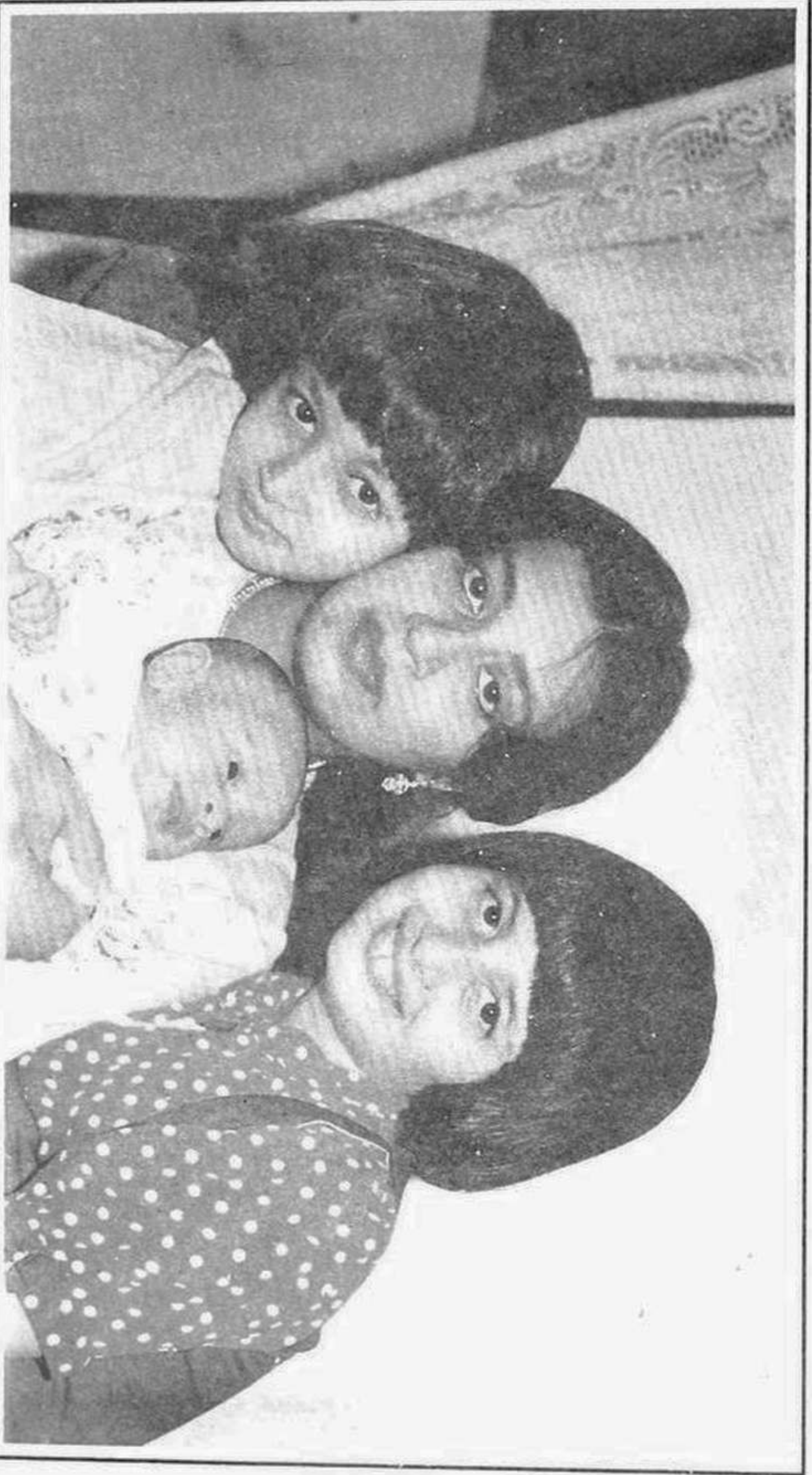
عفت ، بچیوں کے ساتھ (فائیل فوٹو)

حمیرا اپنے شوہر میر عظمت علی خاں کے ساتھ (۸؍جولائی ۲۰۰۶ء)

حبیب ضیا، اپنے فرزند فہیم الدین اور پوتا پوتی کے ساتھ

دائیں سے بائیں حبیب ضیا، زہرہ ضیا، شمس الدین، بدرالدین، ظہیرالدین (فائیل فوٹو)

مرزا شمس الدین بیگ (فائیل فوٹو)

مرزا بدر الدین بیگ (فائیل فوٹو)

زہرہ ضیاء (فائیل فوٹو)

مرزا اصلاح الدین بیگ (فائیل فوٹو)

مرزا ظہیر الدین بیگ (فائیل فوٹو)
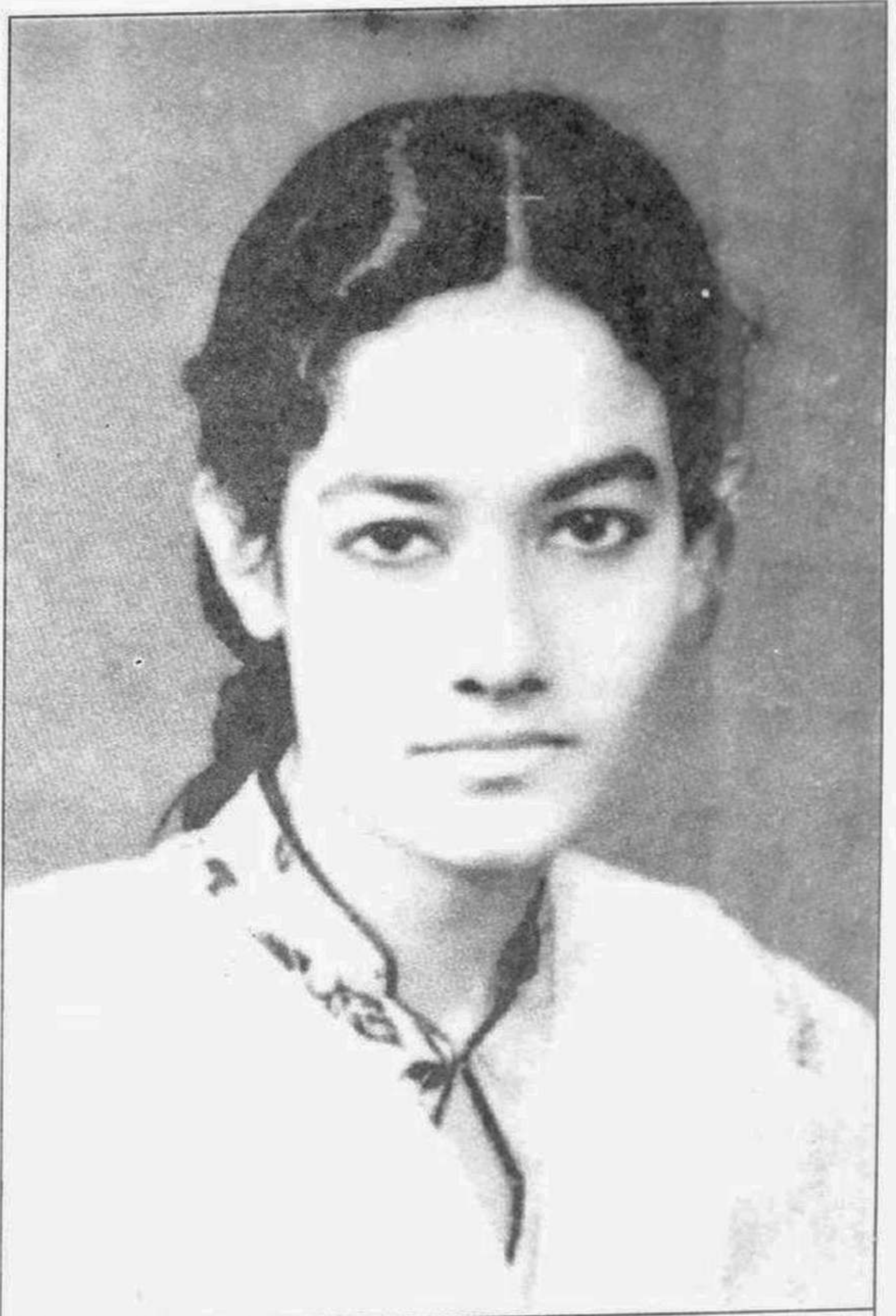
نور جہاں ضیاء (فائیل فوٹو)
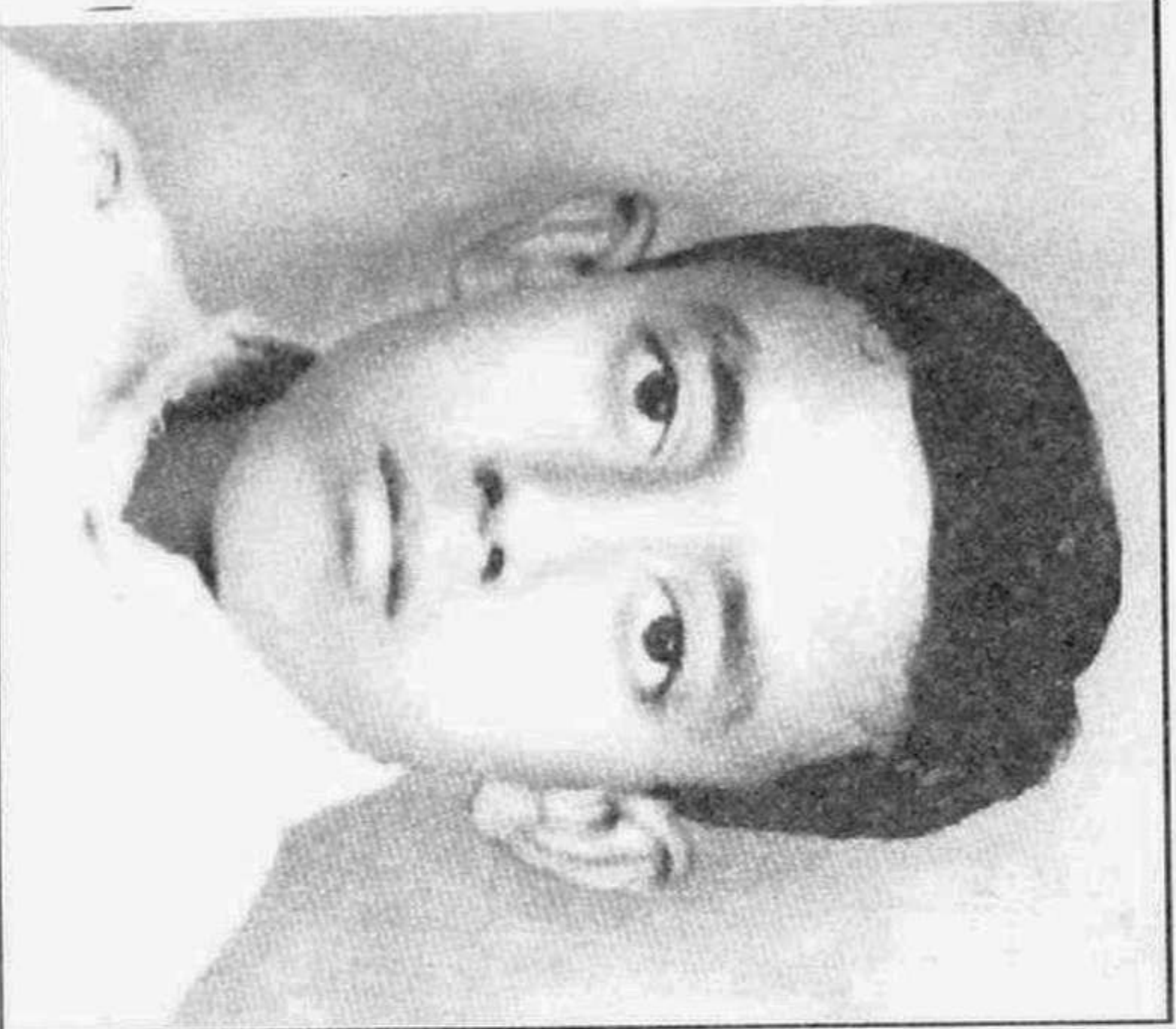
مرزا رضی الدین بیگ (فائیل فوٹو)

مرزا مجید الدین بیگ (فائیل فوٹو)
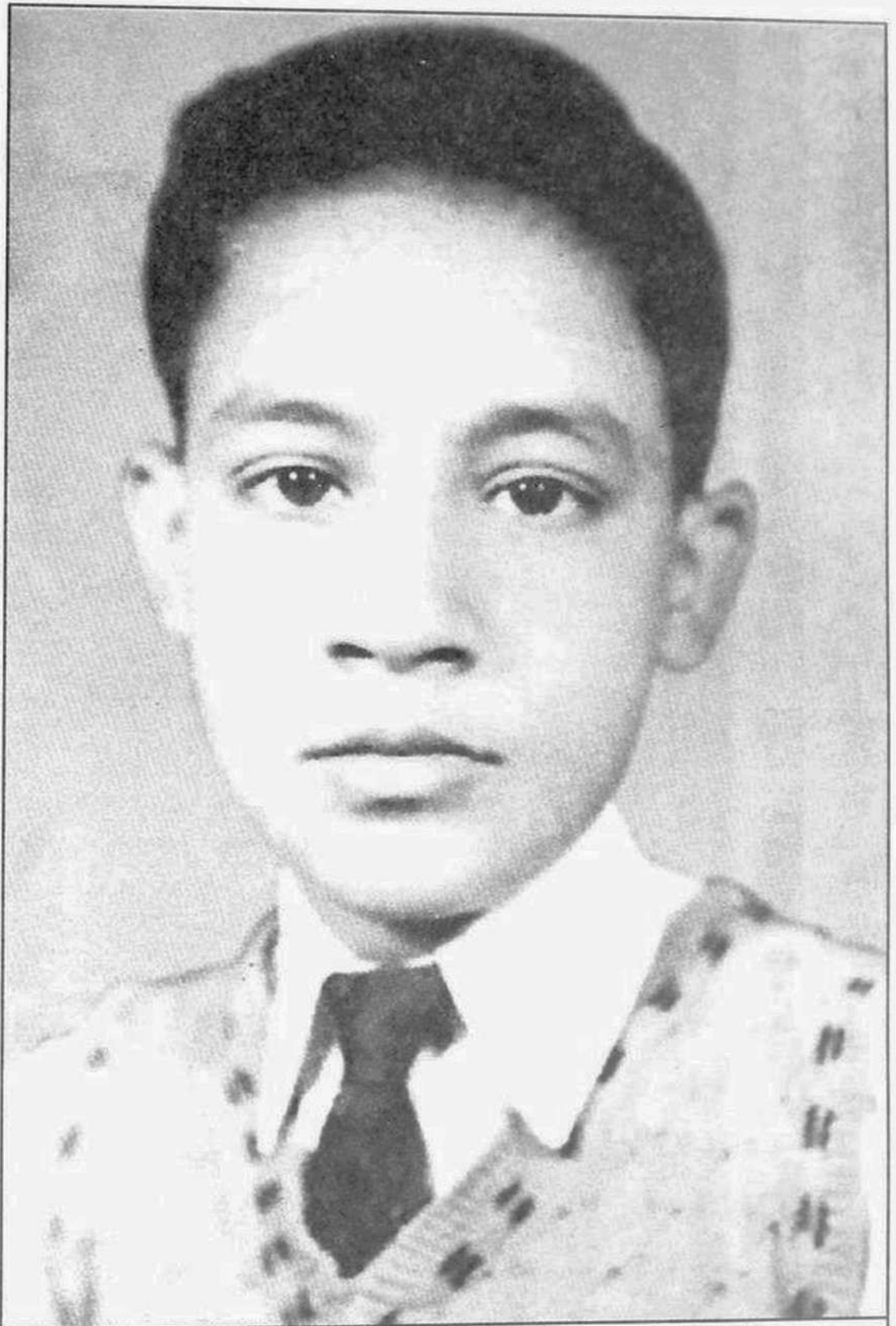
مرزا رفیع الدین بیگ (فائیل فوٹو)
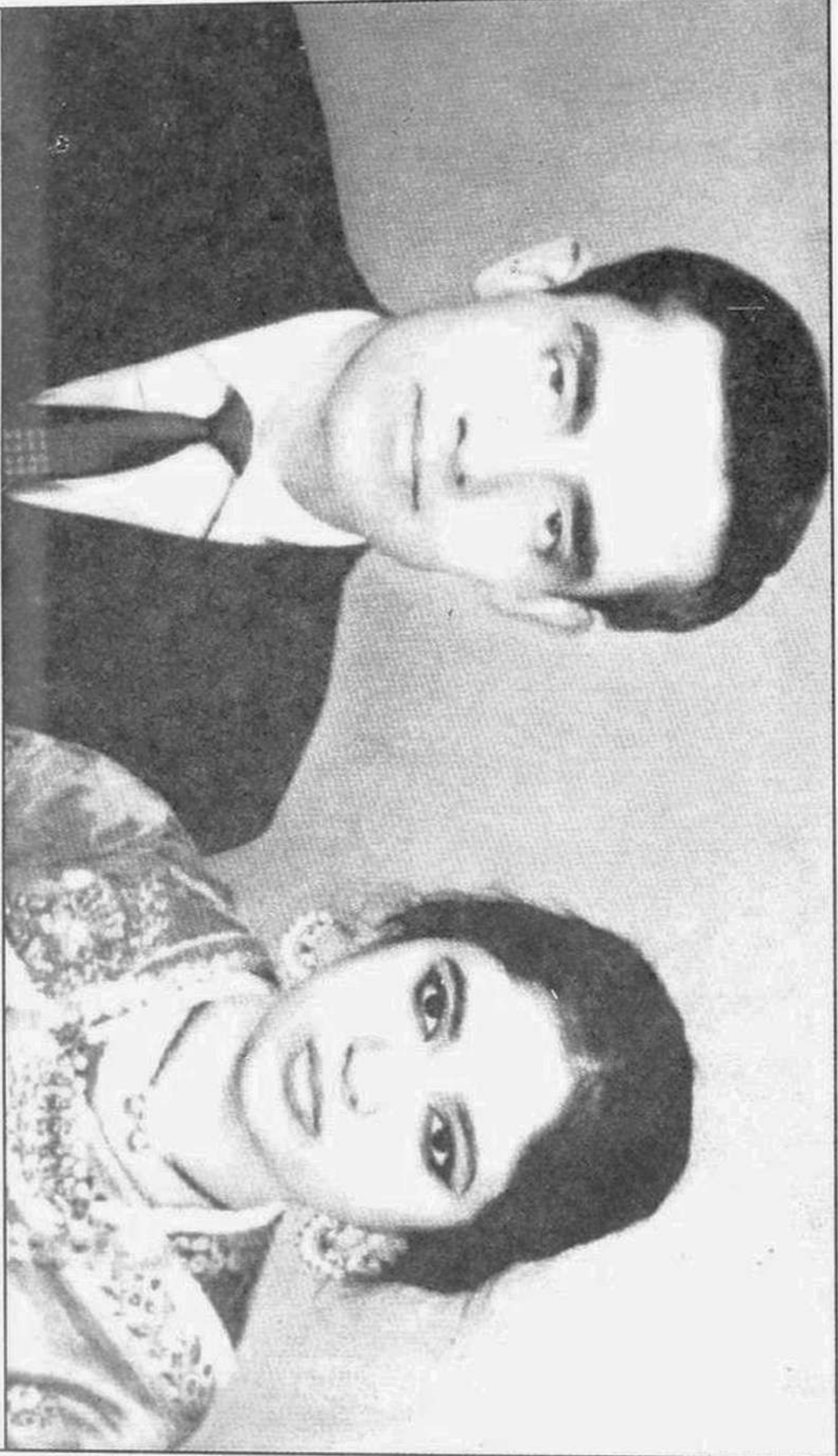
مرزا شمس الدین بیگ اہلیہ کے ساتھ

ڈاکٹر مرزا بدرالدین بیگ، ارکان خاندان کے ساتھ
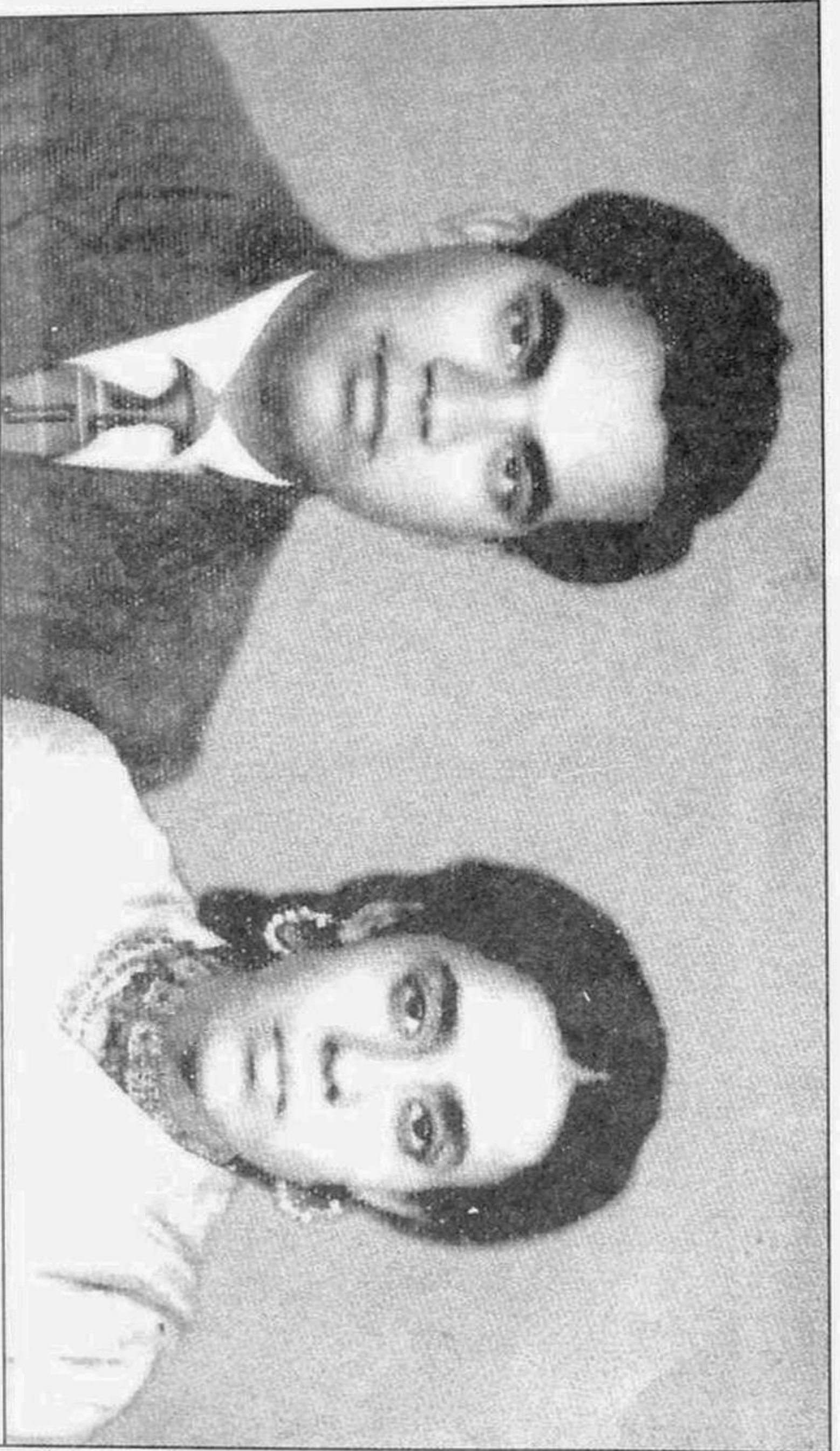
زہرہ ضیاء اور ان کے شوہر سید وزیر علی

مرزا ظہیر الدین بیگ، ارکان خاندان کے ساتھ

نور جہاں دستگیر
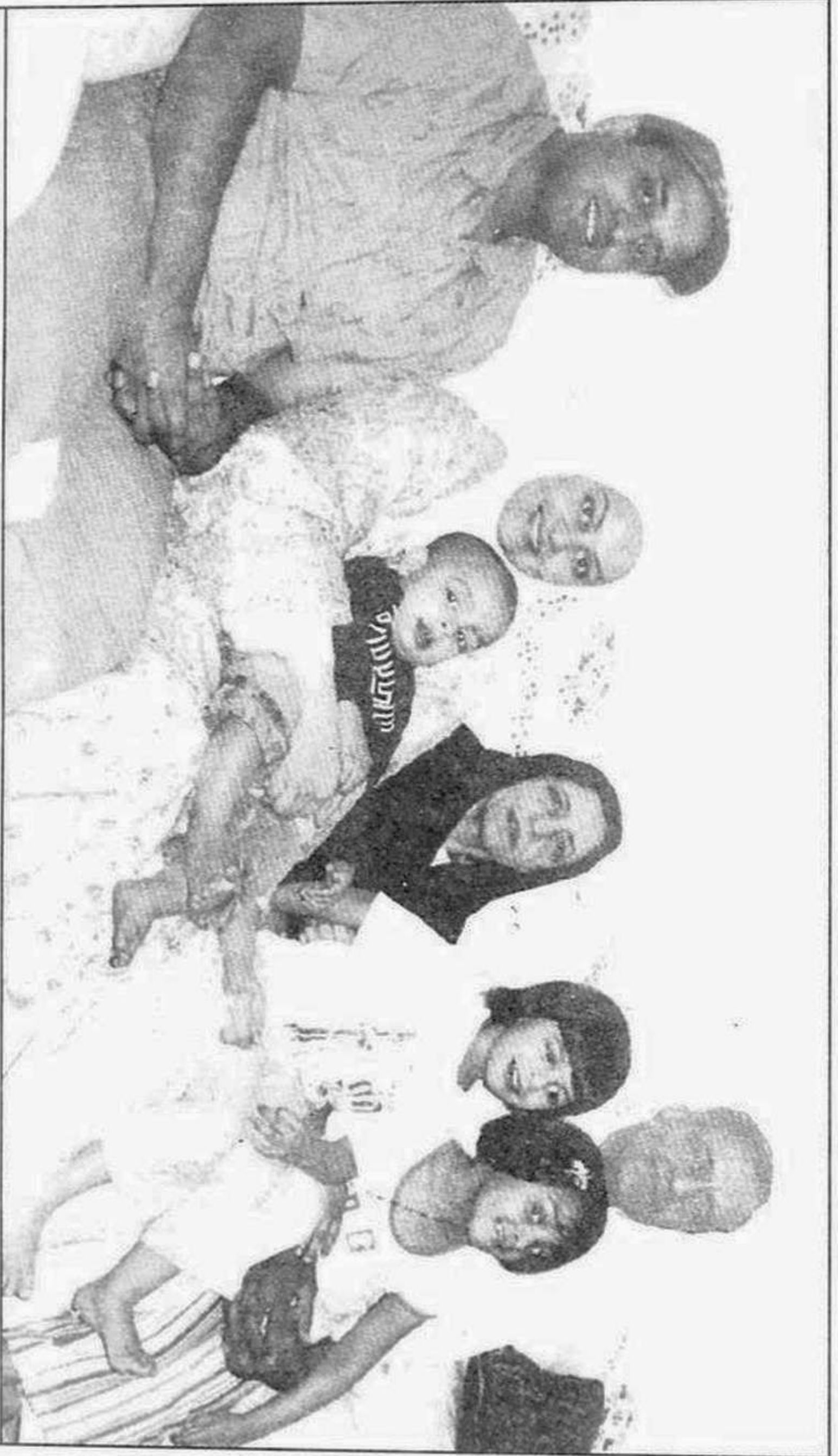
مرزا رضی الدین بیگ، ڈاکٹر نسرین، ارکان خاندان کے ساتھ

واجد اور سامیہ
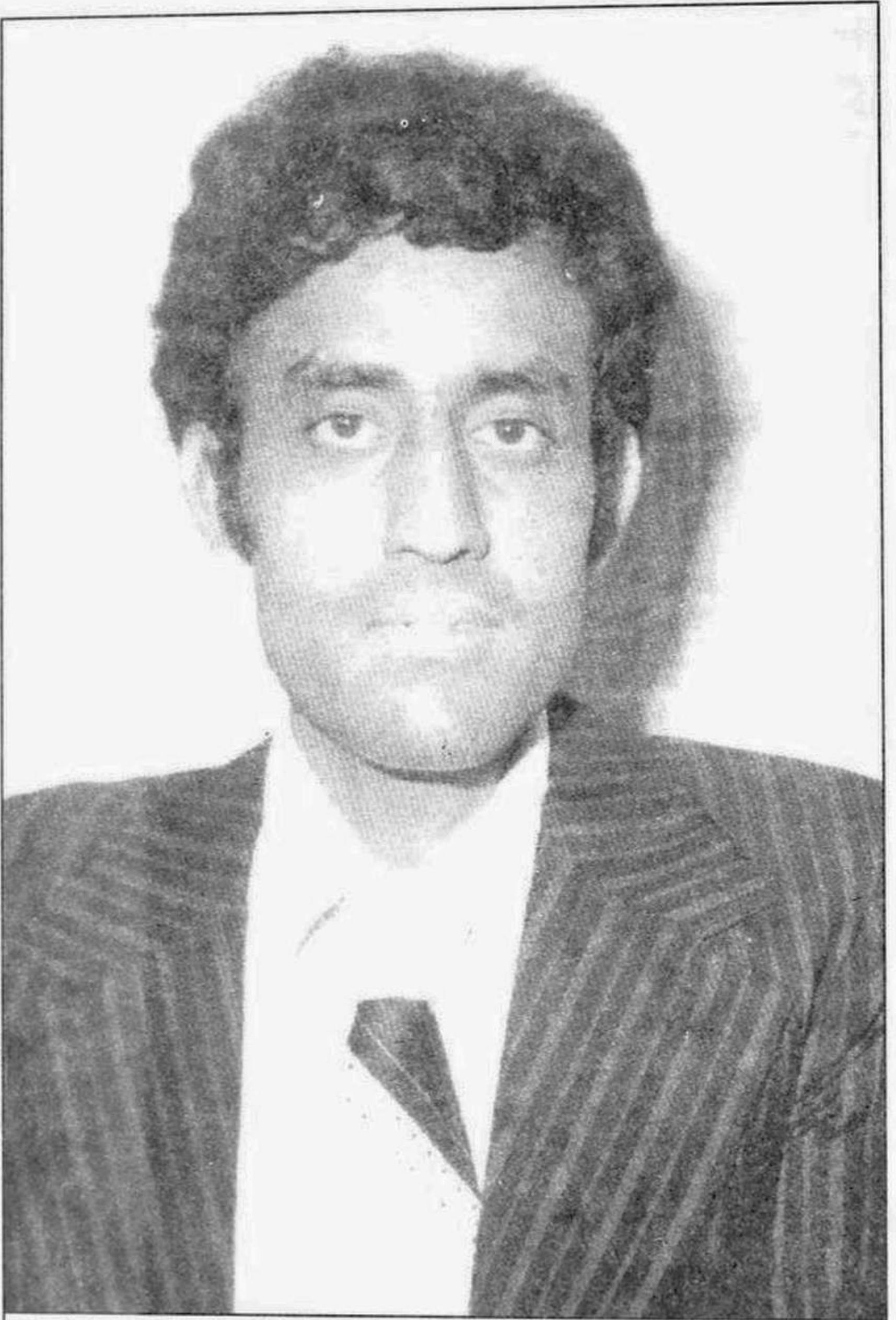
مرزا مجید الدین بیگ
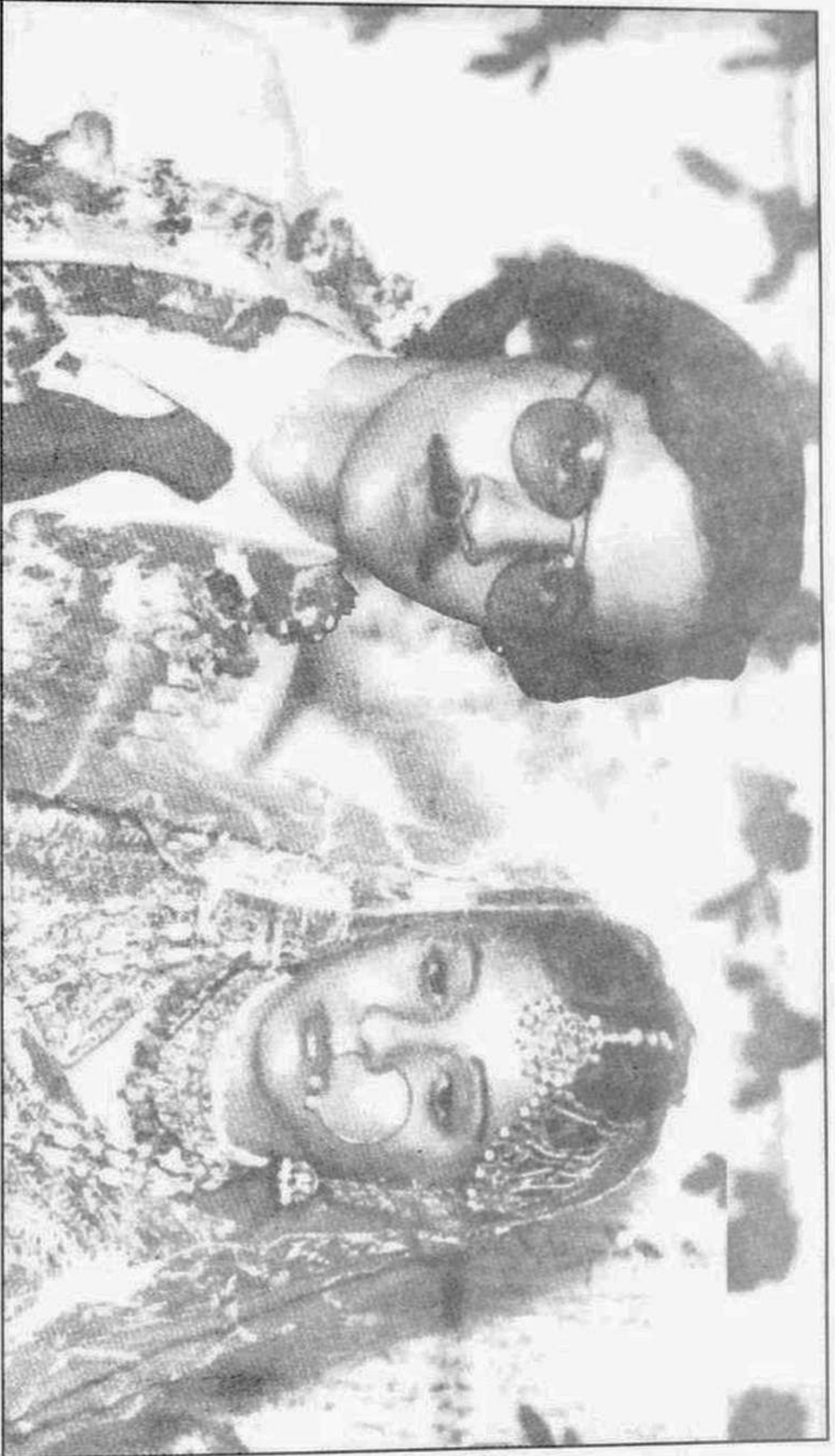
ڈاکٹر مرزا رفیع الدین بیگ اور ڈاکٹر افشاں نوری
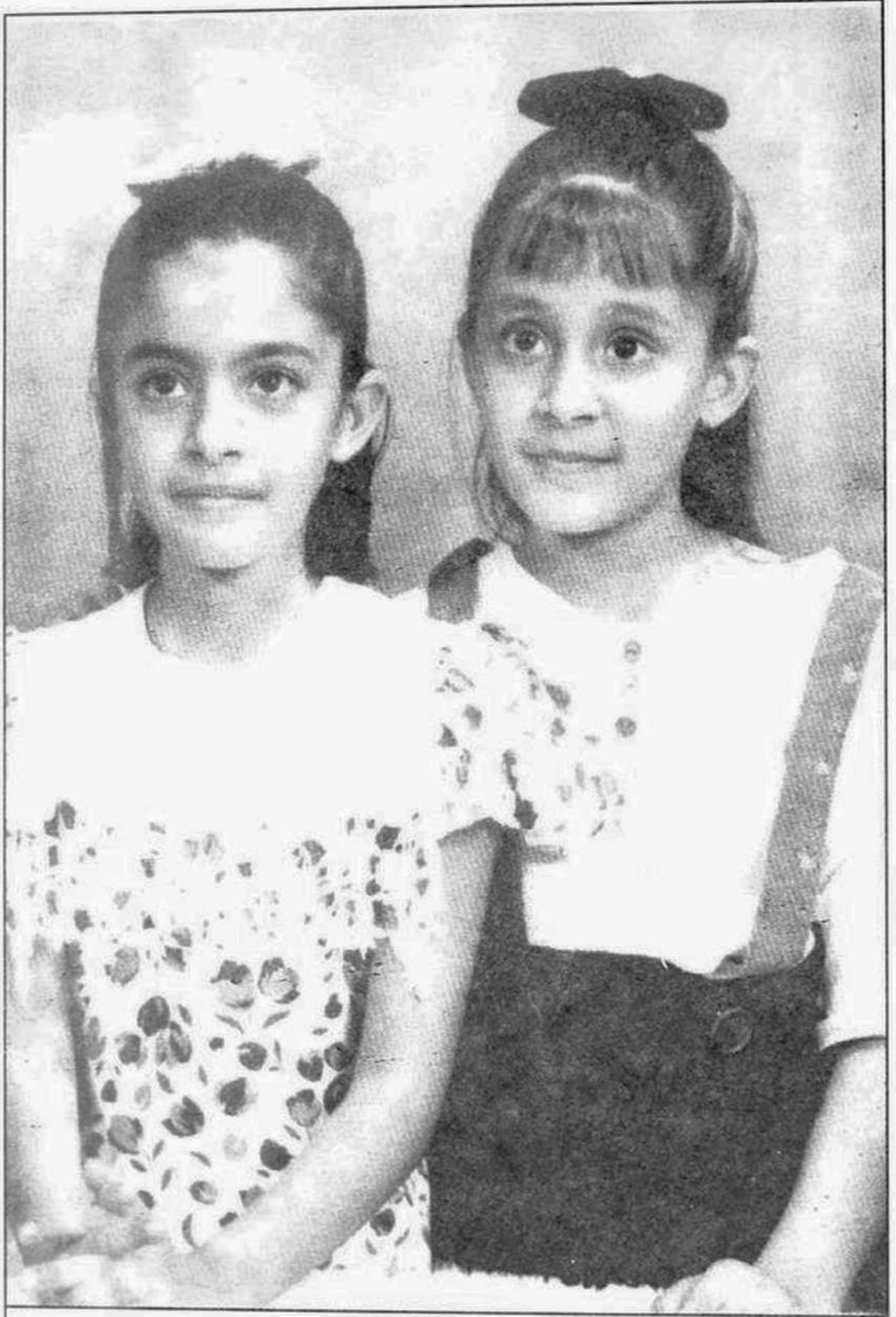
ثنا اور کرن (فائیل فوٹو)

مولوی محمد عبدالقدیر صدیقی حسرت
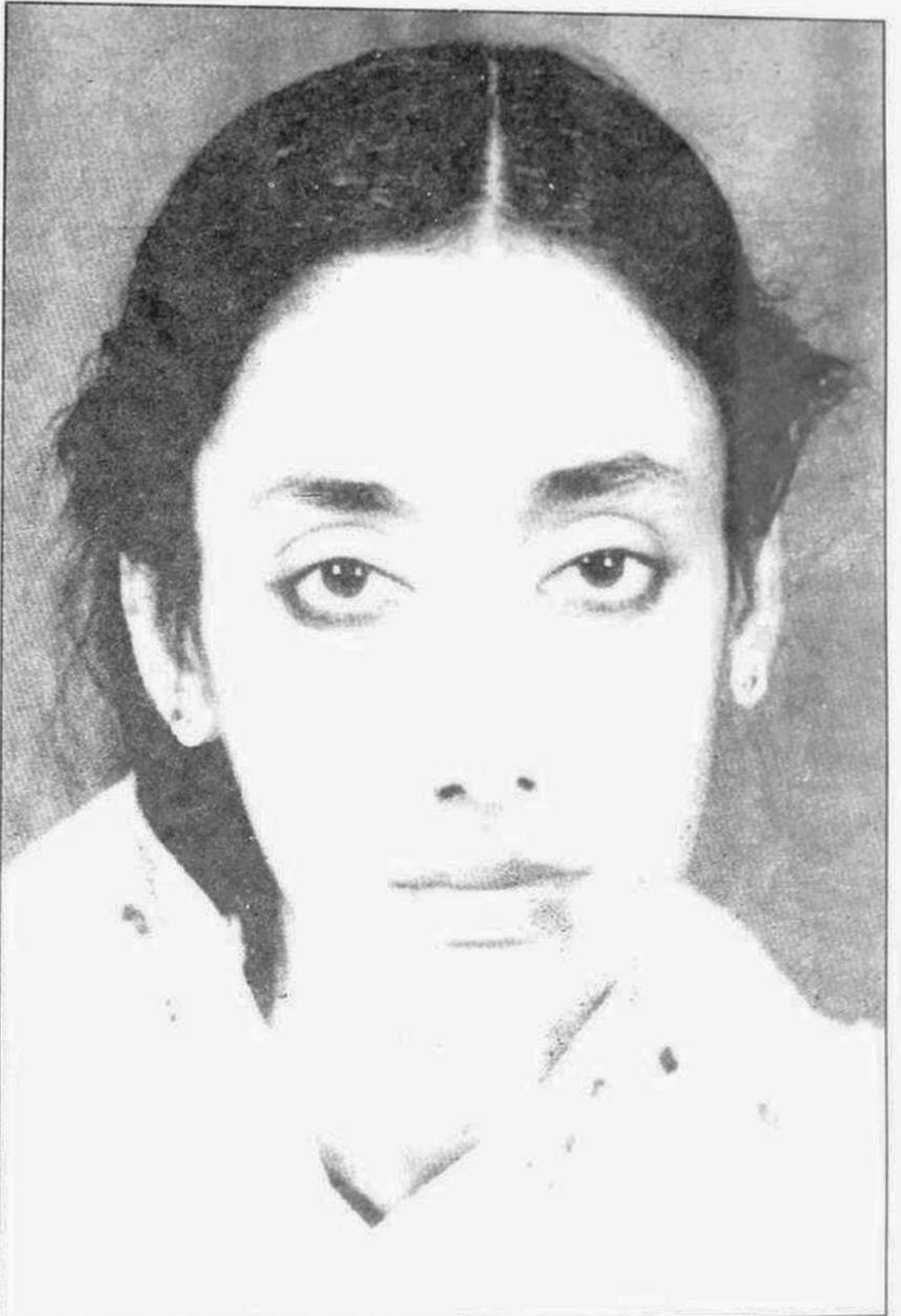
حبیب ضیاء (فائیل فوٹو ۱۹۶۴ء)
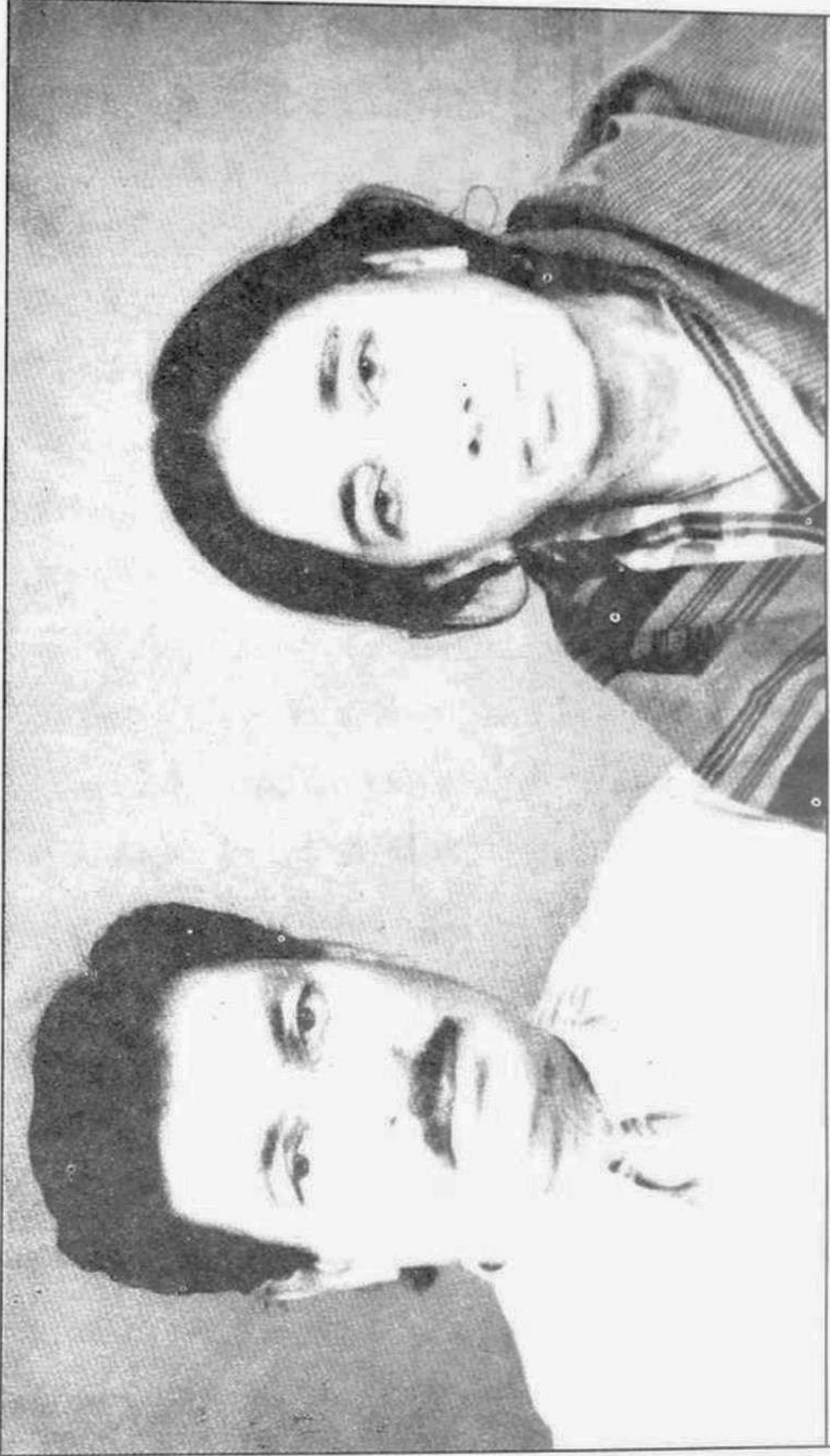
حبیب ضیا اور سید رحیم الدین توفیق (فائیل فوٹو ۱۹۹۵ء)

(خودنوشت)

ڈاکٹر حبیب ضیا

مصنف کی دیگر کتابیں:

دکنی زبان کی قواعد	۱۹۶۹ء
مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد	۱۹۷۸ء
گویم مشکل	۱۹۸۱ء
انیس بیس	۱۹۸۸ء
شاد و نیاز	۱۹۹۳ء
جو مژگاں اٹھائیے	۲۰۰۱ء
حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین	۲۰۰۵ء

Dr. Habeeb Zia

Shugufa Publications

Bade Ghar-ki-Beti

OTHER PUBLICATIONS

- Daccani Zaban Ki Qawaed
- Maharaja Sir Kishan Parshad Shad
- Goyem Mushkil
- Unnees Bees
- Shad-o-Niyaz
- Jo Mizgaan Uthayye
- Hyderabad ki Tanz-o-Mizah Nigar Khawateen